برف میں آگ

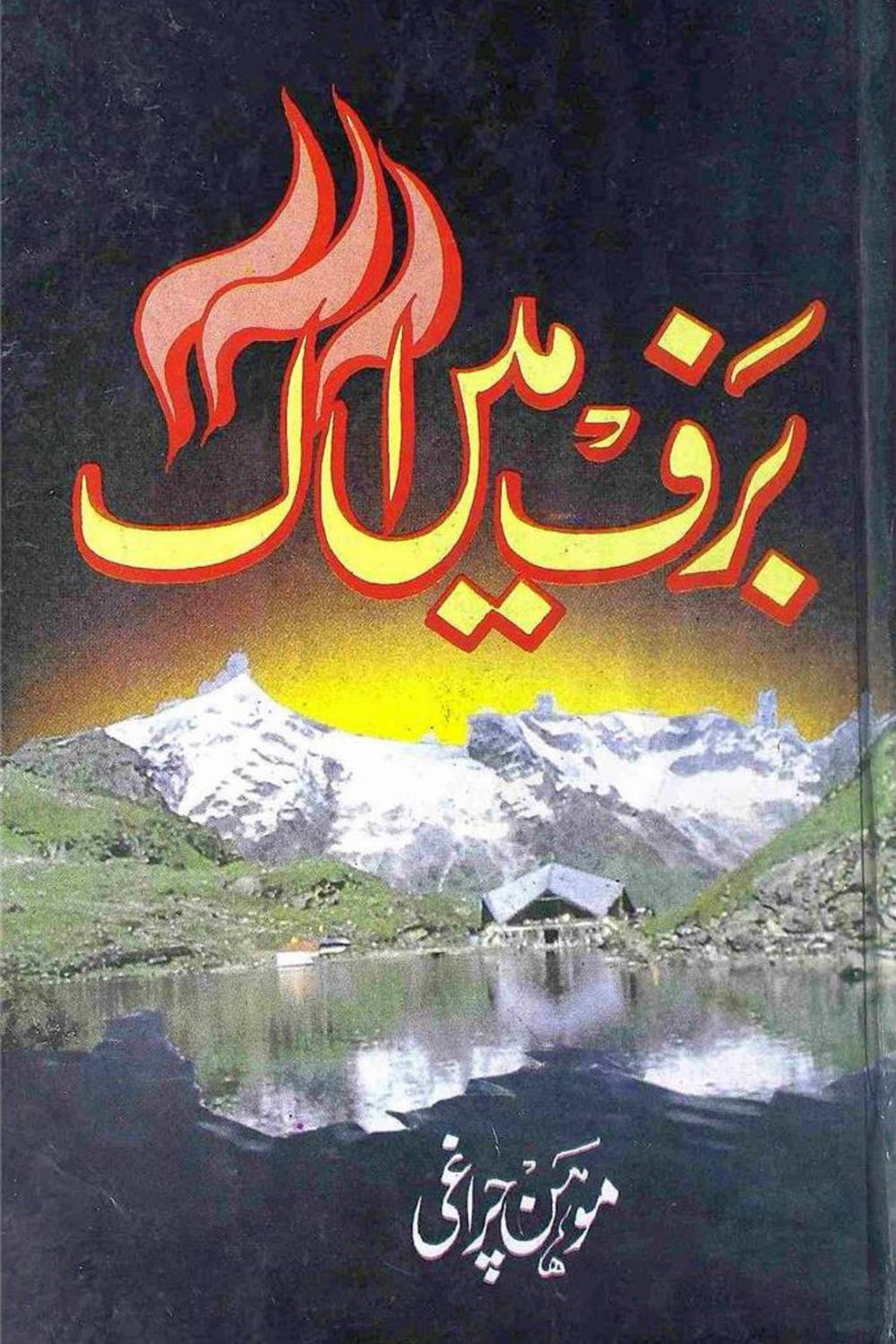

موہن چراغی

www.taemeernews.com

برف میں آگ

موہن چراغی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

www.taemeernews.com

جملہ حقوق محفوظ

Burf Mein Aag

by

Mohan Chiragi

1996

Price : Rs. 150.00

ISBN : 81-86232-33-8

سنہ اشاعت	---	۱۹۹۶
قیمت	---	۱۵۰/- روپے
کمپیوٹرائزڈ ٹائپ سیٹنگ	---	عرشیا گرافکس
سرورق	---	جلال الدین اسلم
مطبع		شیبا پرنٹرس 1796 گلی چابک سوار لال کنواں دہلی 6 فون نمبر 2925841

زیر نگرانی :- فاروق ارگلی (ناظم قرآن ہندی سوسائیٹی - انڈیا)

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191, Gali Azizuddin Vakil Kucha Pandit

Lal Kuan, Delhi-110 006

Phone : 526162-7774965

www.taemeernews.com

انتساب

۱ ان درویش صورت شیطان سیرت سیاستدانوں کے نام جنھوں نے اپنے ذہنی گنجے پن پر عقل اور فراست کی وگ لگا کر ہزاروں کشمیریوں کا پوسٹل ایڈریس بھی غائب کر دیا۔

۲ اپنی بیوی اور بچوں کے نام جو میری ایمانداری اور خودداری کے بے معنی سرٹیفکیٹ کو چاٹتے چاٹتے زندگی کی معمولی معمولی ضرورتوں کے لئے تڑپتے رہے۔

۳ کشمیر کے اس سیاسی نظام کے نام جس نے مذہبی تعصب کے نام پر میری بچی سمیت سیکڑوں بچیوں کا مستقبل تاریک کر دیا۔

۴ اپنے ہمسفر امیش کول کے نام جس نے میری سوچ کو بالغ بنا دیا۔

۵ اپنے عزیز لسہ کول کے نام جو میری نظروں کے سامنے جوان ہوا، میرے سامنے دہشت گردوں کی گولیوں سے کٹ کر گر گیا اور جسے میرے ہاتھوں نے بھسم کر دیا۔

۶ اپنے وطن کشمیر کے نام۔ جسے تب تب یاد کرتا ہوں جب اجنبی شہر دہلی میں اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرتا ہوں۔

۷ اجنبی شہر دہلی کے نام جس نے مجھے فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا۔ نام دیا شہرت دی لیکن ذہنی سکون سے آشنا نہ کیا۔

۸ قومی آواز کے نام جس نے مجھے گمنامی کے تاریک تنگ دائرے سے نکال کر بلندیوں پر پرواز کرنے کے آداب سکھائے۔

۹ قومی آواز کے سابق چیف ایڈیٹر عشرت علی صدیقی کے نام جنھوں نے جوش اور ہوش دونوں کو ہم آہنگ کرنے کا سلیقہ سکھایا۔

۱۰ قومی آواز کے سابق مینیجنگ ڈائرکٹر مرحوم یشپال کپور کے نام جنھوں نے ہر اس سازشی ہاتھ کو جھٹک دیا جو قلم و ذہن پر پہرے بٹھانے کا عادی ہو چکا تھا۔

۱۱ سابق وزیر اعظم مرحوم راجیو گاندھی کے نام جنھوں نے چاپلوس اور زبان دراز کانگرسیوں کے دباؤ کے باوجود مجھے قومی آواز کو ایک مکمل اخبار بنانے کا حوصلہ دیا۔ قومی آواز کے ساتھیوں کے نام جنھوں نے ٹکراؤ، ذہنی کشمکش اور اختلاف کے باوجود مجھے سہارا دیا۔

www.taemeernews.com

۱۲ اس خوبصورت شخصیت کے نام جسے میں نے چاہا۔ٹوٹ کر پیار کیا۔ اپنے وجود کا ایک انگ بنایا اور جس نے رو کے ساتھ بہہ کر اس پیار کو ٹھکرایا۔

۱۳ ان تمام تاجر صحافیوں کے نام جو دم توڑتی انسانیت کے کھنڈرات پر نئی دکانیں سجاتے رہتے ہیں اور سجاتے رہیں گے۔

۱۴ سنگلاخ زمین کے نام جس کو زرخیز بنانے کی خواہش میں میرے ہاتھ شل ہو گئے اور اپنے / نام جو پے در پے زخم کھا کر بھی اپنی بات کہنے سے خوفزدہ نہیں ہوتا۔

موہن چراغی

www.taemeernews.com

فہرست

دیباچہ	7
پیش لفظ	9
(1) ۹-اگست ۱۹۵۳	13
(2) کنونشن کلچر	19
(3) بخشی دور	25
(4) ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس	31
(5) وشواس گھات	37
(6) سیاسی خلا	43
(7) کالے سفید چہرے	49
(8) سیاسی زندگی کا محاسبہ	55
(9) کشمیری پنڈت ایجی ٹیشن	63
(10) پردیش کانگریس میں اقتدار کی جنگ	69
(11) میر قاسم کا دور	75
(12) نئی سوچ	81
(13) تحریک حریت کا پوسٹ مارٹم	87
(14) شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ مفاہمت	115
(15) سیاسی آوارہ گردی کے بعد	121
(16) نیا دور	129
(17) چاپلوسی قدم بوسی	135
(18) عدم استحکام	141

www.taemeernews.com

(19) شیخ عبداللہ کا پہلا جنم	147
(20) سازش	153
(21) جماعت اسلامی کا سیاہ کردار	159
(22) دل بدلی	163
(23) شاہ دور کا زوال	171
(24) نیشنل کانفرنس کانگریس سرکار	177
(25) جگموہن کی آمد	183
(26) کشمیری پنڈتوں کی ہجرت	189
(27) وطن کی دہلیز پر بے وطنی کے زخم	193
(28) منافع بخش انڈسٹری	199
(29) اخبارات کا رول	225
(30) جموں لداخ اور کشمیر	239
(31) الیوزیشن پلیٹ فارم	259

www.taemeernews.com

دیباچہ

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے

ہے اہل دل کے لیے اب یہ نظم بست و کشاد
کہ سنگ[1] و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

بہت ہے ظلم کے دست بہانہ جو کے لیے
جو چند اہل جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہل ہوس، مدعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں

[1] سنگ ہارا بستند و سگاں را کشادند (شیخ سعدی)

www.taemeernews.com

مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

بجھا جو روزن زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی

غرض تصور شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفت سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے، نہ اپنی جیت نئی

فیض احمد فیض

www.taemeernews.com

پیش لفظ

برف میں آگ، اس کتاب کا نام ہے جو برسوں پہلے 'دھندلی یادیں مٹتے نقوش' کے عنوان سے شائع کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ کتاب شائع نہ کر سکا کہ تلاش معاش نے میرے قلم کو غلام بنا رکھا تھا۔ فرصت نہیں ملی اس غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی، اور جب آزادی ملی تو زمانے نے ایک ایسی کروٹ لی کہ دھندلی یادیں تازہ ہو گئیں۔ اور مٹتے نقوش ابھر کر سامنے آ گئے۔ کتاب کے لئے جو مواد اکٹھا کیا تھا سب نفرت کی آگ میں جھلس گیا۔ ۱۹۲۳ سے ۱۹۷۵ تک تمام سیاسی قراردادیں، اہم واقعات پر سیاسی شخصیتوں کے تبصرے، گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے سیاستدانوں کے خاکے، ذاتی ڈائریاں اور تاریخی تصاویر جمع کی تھیں یہ سب کچھ ۱۹۸۹ میں بے وطن ہونے کے بعد دہشت گردی کے طوفان میں کھو گیا۔ "دھندلی یادیں، مٹتے نقوش" شائع بھی ہوتی تو کوئی انقلاب نہیں آتا۔ "برف میں آگ" شائع ہو رہی ہے۔ کسی کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا کیونکہ بے حسی کے آج کے دور میں مردہ احساسات کا زندہ ہونا ناممکن ہے۔ اثر پڑ سکتا تھا اگر میں کوئی سیاست داں ہوتا جس نے ہتھر مار کر ہتھر خان کا لقب حاصل کیا ہوتا۔ اثر پڑ سکتا تھا اگر میں کوئی بے وزن ذہنی بانجھ بے چہرہ ہوتے ہوئے بھی عوامی نمائندہ ہوتا۔ اثر پڑ سکتا تھا اگر میں کوئی ایسا ادیب ہوتا جس نے جمنا میں آگ لگا کر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ حاصل کیا ہوتا، اثر پڑ سکتا تھا اگر میں کوئی ایسا صحافی ہوتا جس نے ہر دہلیز پر ناک رگڑ رگڑ کر بے ناک ہونے کا مقام حاصل کیا ہوتا۔ میں تو ایک سیدھا سادہ کشمیری جو ایک کشمیری پنڈت گھرانے میں سونے کا چمچہ منہ میں لئے پیدا ہوا۔ بچپن آرام میں کٹا لیکن خاندان کی لمبی ناک کو اور لمبا کرنے کی خواہش میں والد نے ایسے ڈسپلن میں جکڑ دیا کہ مزاج پر آوارہ پن حاوی ہو گیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ناستک بن گیا اور یہیں سے شروع ہوئی میری بغاوت آہنی ڈسپلن، خاندانی روایات، مذہبی رسومات اور فرسودہ خیالات کے خلاف۔ جوانی پر نکھار آیا کہ نہیں یاد نہیں البتہ یہ بات ضرور یاد ہے کہ جوانی میں قدم رکھا تو غربت، بھوک، بیماری منہ کھولے نگلنے کیلئے تیار تھی۔ مایوسی اور یاسیت کے گھیرے میں قید، کئی بار فرار کا راستہ اختیار کیا لیکن ہر بار پکڑا گیا۔ سیاسی اور ادبی محفلوں میں ذہنی عیاشی کا ایسا روگ لگ گیا کہ کمیونسٹ بن گیا۔ پرولتار کے لئے سڑکوں پر اخبار فروخت کرتا رہا۔

www.taemeernews.com

ڈی کلاس ہونے کے لئے گندی نالیوں پر خارش زدہ چھابڑی فروشوں کے ساتھ بیٹھ کر ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھاتا رہا۔ غریبوں کے غم میں کئی کئی روز کپڑے نہ بدلنا ناخن لمبے، گندے بال۔ پریشان، انگلیوں میں ہر وقت ڈبل لال ٹین کے سگریٹ۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے گھر گھر جاکر بڑے لوگوں کے صاحبزادوں کو پڑھانا۔ کالج میں اسٹوڈنٹ تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا۔ یہی سب کچھ میں کرتا تھا ۔اس زمانے میں یہ جانے بغیر بھی عشق کس روگ کا نام ہے کئی عشق کئے مگر خشک۔ بھلا خالی پیٹ بھی عشق پروان چڑھا ہے ۔ اپنی آوارگی میں مست ۔ مستی کا خمار اترگیا تو لوگ کافی آگے نکل چکے تھے ۔ پرولتاریہ کے عاشق میدان مار گئے تھے ۔ڈی کلاس ہونے والے نئی کلاس پارکر چکے تھے ۔برسوں کے بعد گھر پر نظر پڑی تو آدھا مکان بک چکا تھا ۔ اجنبی لوگ مکان کے ان گوشوں پر قابض ہوگئے تھے جن گوشوں میں یاد نہیں کہ کتنی بار مارکس سے لے کر رجنی پام دت تک، کرشن چندر سے سعادت حسن منٹو تک، او ہنری سے ہاورڈ ناسٹ تک ہم سبھوں نے انکا پوسٹ مارٹم کیا تھا، گھر کا ایک حصہ خالی بالکل ننگ۔ برتن فرنیچر سامان سب کچھ بک چکا تھا ۔ ایک اندھیرے کونے میں ننگے فرش پر پڑی تھی بیوہ والدہ ۔ کمیونسٹ تو تھا ہی کمیونسٹ پارٹی کی کتابوں کی دکان پر ملازم ہو گیا اور اس دکان نے پیٹ کی آگ تو نہیں بجھائی لیکن میرے لئے ذہنی غذا ضرور فراہم کی ۔ کمیونسٹ جب غداری کرتا ہے تو شرم و حیا تک داؤ پر لگا دیتا ہے ۔ آنکھوں کا پانی مار دیتا ہے یہی حشر اس دکان کا بھی ہوا رات کے اندھیرے میں غدار کمیونسٹوں نے دوکان پر قبضہ کرلیا اور بخشی غلام محمد کے پیس برگیڈ کی مدد سے علم کے اس گہوارے کو تباہ کر دیا۔

جن شیلفوں پر کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، غالب، سرلا دیوی، مہندر ناتھ سجے رہتے تھے ان شیلفوں پر شراب کی بوتلیں سجائی گئیں ۔ کشمیر سے بھاگ گیا، دہلی آیا، یہاں ایک برس آوارگی کی ۔ آوارگی سے اکتا گیا تو واپس سرینگر ۔ کانگریس پارٹی میں ہمارے کئی مہربان تھے اور ہم کانگریس میں لیڈروں کی سچی جھوٹی تقریریں لکھنے کے منشی مقرر ہوئے اور یہاں سے شروع ہوا میری زندگی کا ایک اور دور ۔

"برف میں آگ" لکھنے کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ برسوں سے سینے میں ابلتا ہوا لاوا باہر نکلنے کی راہ تلاش کر رہا تھا ۔سماج اور سیاسی نظام کے خلاف جو نفرت اندر ہی اندر پھوڑے کی شکل اختیار کر رہی تھی وہ پھٹ پڑنے کیلئے بے قرار تھی۔ کتاب لکھنے کی خواہش اس وجہ سے بھی تھی کہ کشمیر کی سیاست میں لیڈر کی حیثیت سے نہیں مہرے کی حیثیت میں مجھے اہم سیاسی شخصیتوں کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا۔میں نے اس دور میں سیاستدانوں کو کھرچ کر انکے خون کو جانچنے کی کوشش کی ۔ ننگے ذہنوں پر ڈالے گئے مخملی غلافوں کو اتار پھینک کر ننگے بدصورت ،بھیانک

www.taemeernews.com

چہروں کو پہچاننے کی کوشش کی ۔ ۱۹۵۲ء کے بعد ابھرتی بلیک میل کی سیاست کے دلدل میں غوطے بھی لگائے ۔بادشاہوں کے اشاروں پر شطرنج کی بساط پر شہ بھی دیتا رہا، مات بھی دیتا رہا۔ گنجے سروں کو تاج بھی پہناتا رہا۔ میں ایک ایسے یگ کا چشم دید گواہ ہوں جس میں بدترین گناہ کئے گئے ۔ وشواس گھات کا بھیانک ڈرامہ کھیلا گیا۔خودی سے بلند سروں کو بے رحمی کے ساتھ ایسے کچل دیا گیا کہ آج کشمیر سسک سسک کر دم توڑ رہا ہے۔

مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ "برف میں آگ" سے ایسے حلقوں کو تقویت ملے گی جو کشمیر کے ہتھیار سے ہندوستان کو زخم پر زخم دے رہے ہیں ۔ لیکن وہ یہ بات نظر انداز کر دیتے ہیں کہ کشمیر میں جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ ان ہی کی سازشوں کا نتیجہ ہے ۔ سازشیں نہ ہوئی ہوتیں ، ریاست میں جمہوریت کے راستے میں روڑے نہ اٹکائے گئے ہوتے ، مذہب کے نام پر ذہنوں میں نفرت کے بیج نہ بوئے گئے ہوتے تو آج کشمیر کمنڈر نہ بن گیا ہوتا ۔ جو کشمیری آج ظلم ، تشدد ، انارکی ، عدم تحفظ ، اور عدم اعتماد کا رونا رو رہے ہیں وہ خود آج کے حالات کیلئے ذمہ دار ہیں کیونکہ انہوں نے کبھی بھی اپنے بل پر زندہ رہنا نہیں سیکھا۔ کبھی شیخ محمد عبداللہ کی بیساکھی پر کھڑے رہے اور کبھی رائے شماری کی بیساکھی پر رینگنے کی کوشش کی ۔ جب بیساکھیاں ٹوٹ گئیں تو خود ٹوٹ گئے ۔ مجھے اسکی قطعی کوئی پرواہ نہیں کہ اس کتاب سے کس کس کو ذہنی سکون ملے گا۔ جو میں نے محسوس کیا اسے قلمبند کیا البتہ جو کچھ بیان کیا ہے اسکا ہر حرف سچ ہے ۔اور سچ کے سوا کچھ بھی نہیں۔

"برف میں آگ" کا مقصد نہ کسی کی دل آزاری ہے نہ کسی پر گندگی اچھالنا ہے اور اگر ۱۹۸۹ء سے قبل "برف میں آگ" کی اشاعت ہوئی ہوتی تو شاید ننگی حقیقتوں پر سے پردہ بھی نہ اٹھاتا کیوں کہ میں بھی اس سیاسی بساط کا ایک مہرہ رہا ہوں اور سب کچھ جانتے ہوئے خاموشی اختیار کرنے پر مجھے بھی معاف نہیں کیا جاسکتا لیکن میری ایک مجبوری تھی کہ میں مجبور تھا زندگی کی معمولی معمولی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے سیاستدانوں کی غلامی کرنے پر، حالانکہ اس زمانے میں بھی کبھی کبھی جب اندر کا انسان سینہ کوبی کرنے لگتا تھا تو بغاوت کرتا لیکن بند کمروں کے اندر سرگوشیوں میں ۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ جو کچھ میں نے اب لکھا وہ بہت پہلے لکھا جانا چاہئے تھا لیکن لکھا نہیں کیوں کہ میں افراد کے تئیں وفاداری سے ناانصافی نہیں کرپایا۔ "برف میں آگ" کے چند کردار ابھی زندہ ہیں چند فوت ہو چکے ہیں ۔ زندہ کردار اگر مصلحت سے کام نہ لیں تو وہ "برف کی آگ" کی تصدیق کر سکتے ہیں ۔ کیونکہ صرف سچ اور خالص سچ ہی اس آگ کو بجھا سکتا ہے اور وقت کا یہی تقاضا ہے۔

موہن چراغی

www.taemeernews.com

۹۔ اگست ۱۹۵۳ء کو شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری ۔ان کی گرفتاری پر وادی کشمیر اور جموں کے ضلع ڈوڈا میں پر تشدد احتجاج، احتجاج کو خاموش کرنے کے لئے وسیع پیمانے پر فائرنگ، فائرنگ میں سیکڑوں افراد کی ہلاکت، سیاسی دشمنوں یعنی سامراجی ایجنٹوں کو گرفتار کرنے کی نئی لہر، ہندوستان نوازی کے نام پر دھونس جمانے اور جبر و تشدد برپا کرنے کی تحریک نے نئے وزیر اعظم بخشی غلام محمد عرف خالد کشمیر کے لئے سیاسی میدان تنگ کر دیا۔ اپنے "چھٹے کلمے" کو قید کرانے کے بعد وہ خود بھی ذہنی طور پر پریشان تھے اور اس پریشانی کو دور کرنے کے لئے فوج کے اعلا افسر اور آئی بی کے ڈائرکٹر ہر طرح کا سامان مہیا کرنے پر مامور تھے ۔ کمیونسٹ لیڈر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ قرار دینے کے لئے نظریاتی لڑائی میں مصروف ۔مرحوم غلام محمد صادق آئین ساز اسمبلی کے چیئرمین تھے۔ کمیونسٹ پارٹی کے اخبار "ہفت روزہ کشمیر" نے فائرنگ پر خاموش سا احتجاج کرنے کی جرأت کی تو صادق صاحب کی سامراج دشمن رگ پھڑک اٹھی اور انہوں نے واضح کیا کہ "جن لوگوں پر فائرنگ کی گئی وہ عوام مخالف لوگ تھے ۔" اس سے کمیونسٹ خاموش ہو گئے۔ شیخ محمد عبداللہ کا غیر جمہوری دور ختم ہوا تو بخشی غلام محمد کا ڈکٹیٹرانہ دور شروع ہوا۔ ہر وہ شخص جو اختلاف کر رہا تھا وہ پاکستانی ایجنٹ بن گیا اور جس نے اختلاف کے باوجود جھکنے کا ہلکا سا اشارہ کیا اس کی پیٹھ کو پرمٹوں اور ٹھیکوں سے جھکا دیا گیا۔ جس دانشور کے ذہن نے انگڑائی لی وہ یا تو اعلا سرکاری افسر بن گیا یا پھر اس کا ایسا حشر کیا گیا کہ وہ باعزت شہری سے بے حیا شہری بن گیا۔ قومی دولت کی لوٹ، شراب کے چھلکتے جام، خوبصورت لڑکیوں کا رقص اور بے حیائی معاشرے کا ایک حصہ بن گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے فرش پر رینگنے والے کیڑے عرش پر پہنچ کر باعزت اور با ضمیر شہری بن گئے

www.taemeernews.com

۹/اگست ۱۹۵۳ باب ۱

اپنی کہانی میں شروع کر رہا ہوں ۱۹۵۳ء سے جب کمیونسٹ پارٹی آف کشمیر، نیشنل کانفرنس کی شکمی پارٹی تھی۔ غلام محمد صادق، سید میر قاسم، درگا پرشاد در، میر غلام محمد راجپوری، غلام محمد میر سجن، شیخ نور محمد، موتی لال مصری، عبدالرحمان راحت، پنڈت رشی دیو جیسے لوگوں کی سرپرستی کمیونسٹ پارٹی کو حاصل تھی۔ مرکز سے ہری کشن سنگھ سرجیت اور ڈاکٹر زیڈ احمد اکثر کشمیر آکر رہنمائی کرتے رہتے تھے۔ نیشنل کانفرنس میں اندر ہی اندر لاوا پک رہا تھا۔ اختلافات تیز ہو رہے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ سامراجی ایجنٹ کے طور پر کمیونسٹ کارکنوں میں بدنام ہو رہے تھے۔ مرکزی سرکار بھی ڈوری ہلا رہی تھی۔ شیخ سرکار کی پالیسیوں کی مخالفت کرنے کے لئے ڈیموکریٹک یوتھ کانفرنس کے نام سے ایک تنظیم بنائی گئی اور غلام محمد راجپوری اس کے صدر اور شاید پیر غیاث الدین اس کے نائب صدر بنے۔ جب بلیک میل کی سیاست پروان چڑھی تو یہ دونوں حضرات وزیر بن گئے اور ایک مدت تک مارکس اور لینن کی تسبیح لیکر پرولتار کے نام پر دولت لوٹتے رہے۔ شہروں اور قصبوں میں شیخ سرکار کی پالیسیوں کے خلاف جلسے، مظاہرے اور سامراجی قوتوں کی سازشوں کو بے نقاب کرنے کے لئے دھواں دھار تقریریں، شاعروں کی سرخ صبح والی انقلابی نظمیں اور عوامی موسیقاروں کی خون گرمانے والی موسیقی۔ یہ تھا ۹۔ اگست تک کشمیر کی سیاست کا ایک رخ۔ بخشی غلام محمد نائب وزیر اعظم تھے اور شیخ محمد عبداللہ کو اپنا "چھٹا کلمہ" کہتے تھے لیکن در پردہ کمیونسٹوں کے ساتھ ساز باز کر رہے تھے ڈیموکریٹک یوتھ کانفرنس میں سرمایہ کاری بھی وہی کرتے تھے۔ اس زمانے میں کشمیر میں کلچرل تحریک بھی توانا تھی۔ ادیبوں، شاعروں، موسیقاروں، پینٹروں اور ڈراما لکھنے والوں کی ایک زندہ تنظیم تھی۔ ناموں کی فہرست طویل ہے صرف چند نام ذہن میں ہیں۔ دینا ناتھ نادم، عبدالرحمان راہی، امین کامل، عبدلستار رنجور، موتی لال ساقی، غلام نبی خیال، ارجن دیو مجبور، عزیز ہارون، مست کشمیری، امیش کول، چمن لال چمن، غلام نبی فراق، اختر محی الدین، علی محمد لون، مکھن لال بیکس، پریم ناتھ پردیسی، نور محمد روشن، غلام رسول نازکی، برق کشمیری یہ چند ہی نام ذہن میں ہیں جو ادب کے محاذ پر کام کر رہے تھے۔ اسٹیج کے محاذ پر ان کشور، پشکر بھان، غلام نبی،

www.taemeernews.com

کیدار شرما وغیرہ تھے۔ پیتروں میں سوم ناتھ بٹ، المست کشمیری، بنسی پارمو، امیش کول، غلام رسول سنتوش، ترلوک کول، سورج تکو۔ نثار عزیز وغیرہ شامل تھے۔ میں ان میں سر گرم تھا۔ اس سے قبل کہ ۹۔ اگست کے طوفان کا ذکر کروں اس بات کا تجزیہ ضروری ہے کہ ۹۔ اگست تک کشمیر کی سیاست کا مزاج کیا تھا۔ شیخ صاحب کو عوامی مقبولیت حاصل تھی کیونکہ جس پروگرام کو لے کر انھوں نے مہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف تحریک چلائی تھی وہ بظاہر ایک انقلابی پروگرام تھا لیکن اس پر فرقہ واریت کا ملمع بھی چڑھایا گیا تھا۔ مہاراجہ کے خلاف تحریک اس وجہ سے نہیں لڑی جارہی تھی کہ وہ ایک غاصب، جابر اور ظالم راجہ تھا بلکہ زیریں لہر (انڈر کرنٹ) یہ تھی کہ وہ ایک ہندو راجہ تھے جس نے مسلمانوں کے جملہ حقوق سلب کر لئے تھے۔ یہ بھی عام تاثر تھا کہ تمام ہندو اس کے ایجنٹ ہیں اور وہ مسلمانوں کا استحصال کر رہے ہیں۔ گو اس الزام کی صحت سے انکار نہیں کہ بڑے زمین داروں، سود خوروں اور سرمایہ داروں میں اکثریت ہندؤں کی تھی۔ جس وقت "زمین کاشت کار کی" کا نعرہ بلند ہوا ہندؤں نے اس کو اپنے خلاف تحریک قرار دیا۔ زرعی اصلاحات کی زد میں زیادہ تر ہندوں ہی آئے۔ اگر شیخ محمد عبداللہ اور نیشنل کانفرنس نے نظریاتی سطح پر یہ لڑائی لڑی ہوتی تو شاید یہ تاثر کبھی نہ پیدا ہوتا کہ یہ تحریک صرف مسلمانوں کے لئے ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جب شیخ صاحب اقتدار میں آئے تو کشمیر میں ڈکٹیٹر شپ تو ختم ہوئی لیکن جمہوری برانڈ کی ڈکٹیٹر شپ قائم ہوگئی نیشنل کانفرنس کی غیر تنخواہ دار فوج نے جسے چاہا پاکستانی قرار دیا۔ جسے چاہا مہاراجہ کا ایجنٹ قرار دیا اور ایک نئے ظلم کی ابتدا ہوئی۔ مار دھاڑ، ظلم و تشدد کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ ساتھ ہی ایڈمینسٹریشن کی نااہلی اور سیاست دانوں کے شکی مزاج نے عوامی مسائل اتنے الجھا دئے کہ انقلابی نوعیت کے اقدامات کے باوجود عوام حکومت سے دور ہوتے گئے۔ جمہوری نظام کے خلاف سازشیں شروع ہوئیں۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ آئین ساز اسمبلی کے اکثر ممبران بلا مقابلہ کامیاب ہوئے لوگوں میں شیخ صاحب کا وقار گر گیا اور وہ عوام کے تیور دیکھکر مایوس ہوتے گئے پاکستان بھی خاموش نہیں تھا۔ وہ کشمیری عوام کی بے چینی کو محسوس کر رہا تھا اور امریکی سامراج اس میں پاکستان کی بھرپور مدد کر رہا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ بے تاج بادشاہ تھے۔ اور جب انھوں نے عوامی بے چینی کو خطرناک رخ اختیار کرتے دیکھا تو وہ رو کے ساتھ بہنے لگے اور اس طرح ہندوستان نواز عناصر اور حکومت ہند میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے۔ اس پس منظر میں ۱۹ اگست کا تجزیہ کرنا ہوگا۔

طوفان اٹھ رہا تھا اور مجھ جیسے نوجوان کمیونسٹ سونگھ رہے تھے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ ۸ اور ۱۹ اگست کی رات ایک ایسا طوفان آیا کہ کئی برس تک تھمنے کا نام نہیں لیا۔ صدر ریاست ڈاکٹر کرن سنگھ، جن کے والد مہاراجہ ہری سنگھ کا تختہ شیخ محمد عبداللہ اور ان کی جماعت نیشنل کانفرنس نے

www.taemeernews.com

پلٹ دیا تھا ایک دم سامراج دشمن بن گئے اور انھوں نے شیخ محمد عبداللہ کو ڈسمس کر کے گرفتار کروادیا۔ دھندلی یادیں ہیں لیکن آنکھوں کے سامنے یہ منظر اب بھی ہے ہزاروں لوگوں کے مظاہرے، فائرنگ، خون میں لت پت لاشیں، معمول کی زندگی معطل۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ ۹ اگست ۱۹۵۳ء تک شیخ محمد عبداللہ جو عوامی مقبولیت کھو چکے تھے وہ ۱۹ اگست کی صبح اچانک پھر مقبول ترین شخصیت کیسے بن گئے گرفتاری کے بعد عام افواہ یہ پھیل گئی کہ شیخ محمد عبداللہ ہندوستان سے الحاق توڑ کر پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کے خواہاں ہیں۔ افواہ پر یقین کیا جا سکتا تھا کیونکہ ابھی آئین ساز اسمبلی نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کی توثیق نہیں کی تھی اور امریکی سرکار کے اہلکار شیخ صاحب کے ساتھ دوستی قائم کر رہے تھے۔ وجہ کچھ بھی ہو شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری نے کشمیری مسلمانوں کے ذہنوں کو جھنجھوڑ دیا۔ ہندوستان کے بارے میں ان کے ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا ہوئے اور کئی روز تک عام مسلمانوں کی بلا کتوں نے ماحول کو اور بھی ہندوستان مخالف بنا دیا۔

بخشی غلام محمد کی تاجپوشی ہوئی اور وہ سرکاری بنگلے میں قید ہو گئے سیاسی کارکن غائب۔ نیشنل کانفرنس ہوا میں تحلیل۔ فوجی جرنیل پہرے دار۔ مشیروں میں کمیونسٹ پارٹی کے کامریڈ راما مورتی، ہری کشن سنگھ سرجیت، ڈاکٹر زیڈ محمد، غلام محمد صادق، میر قاسم، درگا پرشاد در وغیرہ۔ اور ہم جیسے کچے کمیونسٹ عوامی رابطہ قائم کرنے پر مامور۔ لوگوں کو یہ سمجھانے کا کام سپرد کہ اگر شیخ محمد عبداللہ گرفتار نہ ہوئے ہوتے تو کشمیر کوریا بن جاتا۔ سامراج حکومت کرتا۔ بخدا ہمیں خود بھی معلوم نہیں تھا کہ کوریا کا کشمیر سے کیا تعلق اور سامراج کس دیو کا نام ہے۔ ہم تو سرخ صبح کا خواب دیکھتے دیکھتے اپنا وجود بھی کھو چکے تھے۔ جنھوں نے رابطہ قائم کیا وہ پٹ گئے لیکن پٹ کر بھی سامراج کو گالیاں دیتے رہے۔ مسلمان شیخ صاحب کی جدائی میں ماتم کر رہا تھا۔ کشمیری پنڈت سامراج کے خوف سے بخشی غلام محمد کا شیدائی بن رہا تھا۔ ۱۹ اگست کے چند روز بعد بخشی غلام محمد کے حق میں جلوس نکلا۔ کشمیری پنڈتوں کی اکثریت، مسلمان بھی شامل لیکن وہ جوان چند دنوں میں بھری تجوریوں کو خالی کر چکے تھے۔ لیکن کمیونسٹوں کو اس سے نظریاتی تسکین حاصل نہ ہو سکی اور انہوں نے ایک نئے انداز کا سیاسی کلچر شروع کیا جسے کنونشن کا نام دیا گیا۔

کنونشن کلچر

سامراج کو ننگا کرنے اور کشمیر کو کوریا بننے سے روکنے کے لئے پہلا سیاسی کنونشن سری نگر کے ایمپوریم گارڈن میں منعقد ہوا۔ کنونشن کیا تھا سیاسی کارکنوں کے لئے دعوت شیراز تھی۔

www.taemeernews.com

ہزار بھیڑیں روزانہ کٹ رہی تھیں اور ہم جیسے کمیونسٹ بھیڑوں کی ٹرکوں میں کھڑے، کشمیر کوریا نہیں بنے گا، سامراجی سازشوں کو ننگا کرو، کے نعرے بلند کرتے بھیڑ بکریوں کو قتل گاہ کی طرف لے جاتے تھے۔ سیاسی کنونشن میں سینئر کمیونسٹ جیسے موتی لال مصری، غلام محمد میر راجپوری، پیر غیاث الدین ہندوستان کے کمیونسٹوں کی رہنمائی میں قراردادیں تیار کرنے میں مصروف اور بخشی غلام محمد کے وفادار اقتدار کے استحکام کے لئے داؤ پیچ کھیلنے میں مشغول۔ اس زمانے کے کمیونسٹ بہت ہی ایماندار ہوا کرتے تھے۔ سامراج کے خلاف لڑنا ہے تو جان کی پرواہ کئے بغیر۔ نظریاتی لڑائی لڑنی ہے تو پیٹ پر پتھر باندھ کر۔ نہ زر کی ہوس نہ اچھی زندگی کی تمنا۔ سامراج مخالف ہر تقریر پر تالیاں بجانا چاہے تقریر سمجھ میں آئی یا نہ آئی ہو۔ اس کنونشن میں جس کا میں چشم دید گواہ ہوں وہ سب کچھ دیکھنے کو ملا جو شاید عیاش بادشاہوں کے محلوں میں بھی دیکھنے کو نہیں ملتا۔ ناچ گانے، شراب نوشی۔ عیاشی اور پیسہ کمانے کے لئے نئے ٹکسال بنانے کی اسکیمیں اور بے وقوف کمیونسٹ پنڈال میں بھارے ہیں کہ شیخ محمد عبداللہ کو گرفتار کرنا کتنا ضروری تھا۔ بخشی غلام محمد جو کسی حد تک اپنے "چھٹے کلمے" کو قید کرنے کے بعد راحت محسوس کر رہے تھے وہ اپنے بھائی بندوں کی مدد سے حکومت اور نیشنل کانفرنس پر مکمل کنٹرول کرنے کے داؤ پیچ میں مصروف تھے۔ کشمیر کے اکثر لیڈروں کے عوامی نام بھی ہوتے ہیں۔ جیسے شیخ محمد عبداللہ شیر کشمیر کے نام سے، بخشی غلام محمد خالد کشمیر کے نام سے، غلام محی الدین قرہ بلبل کشمیر کے نام سے، مولوی محمد فاروق آفتاب کشمیر کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ سب لوگ اپنے اصلی نام کی شناخت کھو کر کچھ اور بن گئے اور اس کچھ اور نے انہیں "کچھ اور ہی" بنا دیا۔

www.taemeernews.com

کشمیر کے سینے پر لگے زخموں پر مرہم لگانے اور کشمیریوں کی نفسیات کو سمجھنے کے لئے ایک اچھے معالج اور با صلاحیت ماہر نفسیات کی ضرورت تھی۔ لیکن نہ تو اچھا معالج تھا نہ ماہر نفسیات ہی، معالج بھی تھے اور ماہر نفسیات بھی تھے لیکن ہر معالج نے زخموں کے منہ چوڑے کر دیے، ماہر نفسیات نے نفسیاتی بیماروں کی قطاروں کا سلسلہ دراز کیا۔ ۱۹۴۷ء سے قبل کشمیریوں کو مہاراجہ بہادر کی جے کے لئے گھٹنوں کے بل رینگنا پڑتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اپنی سرکار نے شیر کشمیر زندہ باد اور پاکستان مردہ باد کے نعرے بلند کرانے کے لئے نیا کلچر شروع کیا۔ ہر حلقہ یعنی نیشنل کانفرنس کا دفتر اذیت کا مرکز بن گیا۔ جس کسی نے اختلاف کیا یا تو سرحد پار دھکیل دیا گیا یا پھر گھاس کی بنائی گئی ہتھکڑی لگا کر سڑکوں پر بے عزت کیا گیا۔ جموں کشمیر کے سابق وزیر اعظم رام چندر کاک جو ۱۹۴۶ء میں ہی آزاد کشمیر کے خواب دیکھ رہے تھے انھیں بھی نہیں بخشا گیا۔ گھاس کی ہتھکڑی پہنائے سڑکوں پر اس کی پریڈ کرائی گئی۔ اس پر تھوکا گیا۔ شیخ محمد عبداللہ ایک طویل جدوجہد کے بعد اقتدار میں آئے تھے۔ ایم اے کی ڈگری بھی حاصل کی تھی لیکن ان کے ذہنی دریچے بند تھے۔ بلند قد و قامت والی اس سیاسی شخصیت نے وقت وقت پر چھوٹے پن کا ثبوت دیا۔ وہ اپنے ساتھیوں پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ چھوٹے ملازموں کی باتوں پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ قدامت پسندی اور خود پرستی نے انہیں خود سر بنا دیا تھا۔ اختلاف رائے کو برداشت کرنے کی ان میں سکت نہیں تھی۔ اسی لئے وہ اپنی بات منوانے کے لئے ہر وقت مسجد کے منبر کا سہارا لیتے رہے۔ وہ خوفزدہ تھے کہ اگر کشمیری مسلمان کو کھلی فضا میں سوچنے سمجھنے کا موقع دیا گیا اگر کشمیری مسلمان پر بیرونی سیاسی رجحانات کا اثر پڑا تو ان کی لیڈر شپ کے لیے آرمانش کا دور شروع ہو گا۔ شیخ محمد عبداللہ کی فرار کی اس پالیسی کا ہی نتیجہ ہے کہ کشمیر میں کسی بھی قومی سطح کی سیاسی پارٹی نے اپنی سرگرمیاں شروع نہیں کیں۔ وہ کشمیریوں کو ایک آہنی خول میں آخری وقت تک قید کرتے رہے۔ بخشی غلام محمد بھی ان سے مختلف نہیں تھے لیکن ان کی حکمت عملی مختلف تھی۔ خود بھی عیش کرتے تھے دوسروں کو بھی عیش کرنے کا موقع دیتے تھے۔ خود بھی سرمایہ کاری کر رہے تھے دوسروں کی بھی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کر رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۵۲ء سے کامراج پلان کے دور تک کشمیر میں نہ پاکستانی جھنڈے لہرائے گئے۔ نہ پاکستان زندہ باد کے اور نہ ہی ہندوستان مردہ باد کے نعرے بلند ہوئے۔ اخبار والے چاہے مقامی تھے یا قومی پریس کے ان کے دربار سے فیضیاب ہوتے رہے۔ شیخ محمد عبداللہ کشمیریوں کو بغیر کسی معاوضہ کے وفادار رہنے پر مجبور کرتے تھے۔ بخشی غلام محمد معاوضہ دے کر وفاداریاں خریدتے تھے اور اس خرید و فروخت نے کشمیری کو تاجر بنا دیا۔

www.taemeernews.com

کنونشن کلچر

باب ۲

سری نگر ایمپوریم کے کنونشن میں شعلہ بیان مقرروں نے جادو کی چھڑی سے یہ بات ثابت کردی کہ شیخ محمد عبداللہ کشمیر کو سامراج کے حوالے کرنے کی سازش کررہے تھے اور اس میں پاکستان اور امریکا براہ راست ان کے مدد گار تھے۔ چاہے کمیونسٹ لیڈر کرشن دیو سیٹھی ہوں یا نیشنل کانفرنس کے سید میر قاسم اور غلام محمد میر راجپوری، کشمیر کے کمیونسٹ لیڈر موتی لال مصری ہوں یا کسان لیڈر عبدالرحمان راحت، کنونشن پر چھائے جارہے تھے۔ سامراج کو شکست دینے کی ذمہ داری تو ان لوگوں پر تھی اور اقتدار کو مستحکم بنانے کی اور مستحکم بنا کر دولت لوٹنے کا فرض بخشی غلام محمد کے برادر بخشی عبدالرشید، بخشی مجید، بخشی ولی محمد اور ان کے چیلے چانٹوں کو سونپا گیا تھا۔ کنونشن میں کئی قراردادیں منظور کی گئیں حالانکہ ان کی زبان بہت کم لوگوں کی سمجھ میں آرہی تھی۔ خالصتاً کمیونسٹ اصطلاحات اور وہ بھی اسٹالن برانڈ کی اور جو نوجوان کچے کمیونسٹ تھے انھیں تو صرف ہاں میں ہاں ملانے کی ڈیوٹی دی گئی تھی۔

ثقافتی کنونشن

وادی کے ادیب، شاعر، اسٹیج ایکٹر موسیقار اور پینٹر بھی سامراج کے خلاف اس لڑائی میں پیش پیش تھے۔ کشمیر کلچرل کانفرنس کمیونسٹ پارٹی کے کنٹرول میں تھی۔ پارٹی ہائی کمانڈ ہی فیصلہ کرتی تھی کہ کلچرل کانفرنس کا حاکم اعلا کون ہوگا اور ۱۹۵۲ء کے بعد پہلے حاکم اعلا مرحوم دینا ناتھ نادم مقرر کئے گئے۔ ان کے مدد گاروں میں عزیز ہارون، عبدالرحمان راہی، اختر محی الدین، فراق، ارجن دیو مجبور، عارض کشمیری، سوم ناتھ زتشی، مہندر رینا، علی محمد لون، امین کامل، سوم ناتھ بٹ، نور محمد روشن وغیرہ تھے۔ کمیونسٹ پارٹی نے نوجوان ذہنوں کو صاف کرنے کے لئے ینگ رائٹرز کانفرنس کی ایک انجمن بھی بنائی اور پارٹی نے اس کا سربراہ اومکار ناتھ ترسل کو مقرر کیا۔ ادب شاعری اور کلچر سے ان کا رشتہ اتنا ہی تھا جتنا چھوٹے بھٹورے بیچنے والے کا اپنے گاہک سے ہوتا ہے۔ البتہ ترسل صاحب پارٹی لائن سے بخوبی واقف تھے۔ کہ ہر نظم اور ہر کہانی کا اختتام سرخ صبح سے ہونا چاہئے اور پینٹنگ میں سرخ رنگ کا استعمال ضرور ہونا چاہئے۔ کیا قیامت خیز کلچرل تحریک تھی، ہر نظم، ہر کہانی اور پینٹنگ کا پوسٹ مارٹم گھنٹوں جاری رہتا تھا اور

www.taemeernews.com

پوسٹ مارٹم کرنے والے ان پڑھ، جاہل اور غیر متعلق لوگ۔ تعلق تو صرف اتنا کہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر تھے۔ ینگ رائٹرز کانفرنس میں سرگرم کارکنوں میں اومکار ناتھ کاچرو، امیش کول، مہندر ناتھ، موزہ، موتی لال ریسا، ہردے کول بھارتی، موہن تکو، موتی لال عرف نتیگو، چمن لال چمن، مکھن لال بیکس بینسی پارمو، موہن چراغی، موتی لال ساقی وغیرہ شامل تھے۔ بہت سارے نوجوان تھے لیکن ذہن میں اتنے ہی نام محفوظ ہیں۔ سرخ صبح نے معلوم نہیں کس کس کو شاعر بنادیا، کہانی کار بنادیا۔ جسے دیکھو بیاض یا کہانی کا مسودہ اٹھائے چلا آرہا ہے۔ میٹنگوں میں سیاسی کلچر پر دھیرے دھیرے بخشی خاندان کا قبضہ ہو رہا تھا اور کلچرل میدان پر کمیونسٹوں کا۔ اس تحریک کا ایک مثبت پہلو یہ تھا کہ اس تحریک نے نامور شاعر، کہانی کار، پینٹر اور موسیقار پیدا کئے۔ ان میں سر فہرست دینا ناتھ نادم، رحمان راہی، موتی لال ساقی، امیش کول، ہردے کول بھارتی، ہری کشن، علی محمد لون، شانت، غلام نبی خیال، امین کامل، سوم ناتھ بھٹ، ترلوک کول، غلام رسول سنتوش، اختر محی الدین ہیں۔ موسیقاروں میں موہن لال اسمہ عبدالغنی نمتہ ہالی اور خلیل آگے بڑھے۔ اسٹیج ایکٹروں میں پشکر بھان، بران کشور، جاوید، قاری شاہ وغیرہ کافی مشہور ہوئے۔ ان ایام میں کئی ایسے ڈرامے کھیلے گئے کہ دیکھنے والوں کے ذہنوں پر دیرپا اثر رہا۔

بدقسمتی سے سیاسی کنونشن کا روگ کلچرل تحریک کو بھی لگ گیا اور ادبی کانفرنسوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ سکوں کی جھنکار اور چھلکتے جاموں کی بدمستی نے اس ادبی کانفرنس کو مدہوش کردیا اور دھیرے دھیرے بزرگ شاعر اور ادیب پینٹر اور موسیقار مدہوش ہونے لگے۔ ۱۹ اگست کے بعد یہ کشمیر کے معاشرے کا ایک رخ تھا۔ دوسرا رخ بدصورت اور گھناؤنا۔ بخشی غلام محمد نے وفاداریاں خریدنے کا ایسا جادو چلایا کہ آئین ساز اسمبلی کے ۷۵ ممبروں میں سے صرف ۶ یا ۷ ممبر اختلاف کرتے رہے اور باقی سامراج کے خوف سے بخشی صاحب کے اشاروں پر ناچتے رہے۔ بخشی غلام محمد کی جڑوں کی آبیاری کے لئے دہلی والوں نے تجوریوں کے منہ کھول دیئے تھے۔ تعمیر و ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوچکا تھا، رعایتیں دے دے کر لوگوں کو اپنا ہم نوا بنانے کا موسم شباب پر تھا۔ جو بھی اپنی ناک کٹوانے پر راضی ہوا بخشی صاحب کے دربار سے خالی ہاتھ نہیں آیا۔ جس نے اپنے ضمیر کو "خالد کشمیر" کے رعب سے سلا دیا اسے قارون کا خزانہ حاصل ہوا اور جو لوگ نہیں پھسلے تباہ ہوگئے، مار پیٹ تو بخشی دور کا ایک اٹوٹ انگ تھا، پگڑیاں سر بازار اچھالنا دستور تھا۔ مخالفوں کو اغوا کرکے ان کی انا کو مجروح کرنے کے لئے ان کے ساتھ بدفعلی کرنا عام تھا اور کمیونسٹ بھائی نظریاتی جنگ لڑنے کے لئے کتابیں لکھنے، پمفلٹ تیار کرنے اور پولیٹکل اسکول چلانے میں مصروف تھے۔

کمیونسٹوں اور بخشی غلام محمد کا یارانہ اتنا گہرا تھا کہ کمیونسٹوں نے ایک بک اسٹال کھولی اور

www.taemeernews.com

افتتاح کیا ۔بخشی عبدالرشید نے جنہوں نے عمر بھر کسی کتاب کے سرورق پر نظر ڈالنا بھی گوارہ نہ کیا تھا حالانکہ ان کی لائبریری میں شیکسپیر، مارکس، اسٹالن کی درجنوں کتابیں ہر وقت سجی رہتی تھیں اور ٹیبل پر ہمیشہ انگریزی کی آکسفرڈ ڈکشنری سلیقے سے رکھی ہوتی تھی۔ ڈکشنری برسوں پڑی رہی لیکن پہلا صفحہ کبھی بھی دن کی روشنی نہ دیکھ سکا۔ کمیونسٹوں کا ہفتہ وار اخبار البتہ جاری رہا اور وہ سامراج کی مخالفت کرتا رہا۔ لیکن بخشی غلام محمد جانتے تھے کہ کمیونسٹ کبھی نہ کبھی ساتھ چھوڑ دیں گے۔ انہوں نے بھی کئی اخبارات کو خرید لیا۔ ایک نام ذہن میں ہے اخبار آفتاب۔ آفتاب کے اڈیٹر ثناءاللہ مقبوضہ کشمیر سے واپس لائے گئے تھے۔ جموں کے ایک سوشلسٹ لیڈر وید بھین بھی بخشی غلام محمد کے نورتنوں میں شامل تھے۔ آج کل کشمیر ٹائمز نام کا انگریزی اخبار جموں سے نکالتے ہیں، ثناءاللابٹ اور وید بھین دونوں ہی اینٹی کمیونسٹ تھے۔ نظریاتی طور پر نہیں بلکہ بخشی صاحب کی مہربانی کے سبب۔ اسی دور میں ۲ نام کسی کی بھی روح فنا کرنے کے لئے کافی تھے۔ پولس افسر شیخ غلام محمد گاندربلی۔ بخشی غلام محمد کے خاص نوکر رام ناتھ اور پیس برگیڈ۔ شیخ غلام محمد گاندربلی شکل سے ہی ہیبت ناک نظر آتے تھے۔ ہندوستانی حلقوں میں وہ پکے ہندوستانی اور کٹر محب وطن سمجھے جاتے تھے۔ سیاسی مخالفین کو توڑنے کے لئے پولس تھانے میں ان کا کمرہ اور کمرے کے اندر ان کے انسان نما خونخوار کتے۔ گرم ابلے آلو منہ میں ٹھونس دینا، ننگے بدن پر گرم استری پھیر دینا، خوب صورت نوجوانوں کے ساتھ بدفعلی کرنا، بزرگ شہریوں کو زبردستی شراب پلا کر بلیک میل کرنا، جوتوں سمیت چھاتی پر مارچ پاسٹ کرنا، پاکستانی ایجنٹ قرار دینا یہ تو شیخ صاحب کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا، خوف اتنا کہ شبستان کشمیر لرز رہا تھا اور شاید یہی وجہ ہے کہ "آفتاب" کے اڈیٹر ثناءاللہ بٹ نے اپنے کمرے میں ان کی تصویر سجائی تھی اور تصویر کے نیچے لکھا تھا "لرز رتا ہے جس کے وجود سے شبستان کشمیر" حالانکہ وہ گاندربلی کے خاص مخبر تھے۔

بخشی غلام محمد کے خاص ملازم رام ناتھ۔ سرکاری کاغذات میں درج تھا کہ وہ ان کے محافظ تھے، لیکن بخشی صاحب کے کاغذات میں وہ ان کے خاص ایلچی اور مخبر تھے، ریاستی وزرا رام ناتھ کی جے جے کار کرتے تھے۔ ان کی ناز برداری کے لئے ولایتی شرابیں حاضر کرتے تھے۔ بڑے تاجران کی ذہنی عیاشی کے لئے حوروں کو لاتے تھے۔ بخشی غلام محمد اور لوگوں کے درمیان رام ناتھ ایک پل تھا اور پل پر گزرے بغیر بخشی صاحب تک رسائی ناممکن تھی۔ پیس برگیڈ یعنی امن برگیڈ خطرناک اور وحشی درندوں کا ایک برگیڈ۔ امن قائم کرنے کے نام پر کوڑے برسانا، پاکستان ریڈیو سننے پر گھروں میں گھس کر زدوکوب کرنا بخشی صاحب کے مخالفوں کے منہ بند کر دینا۔ یہ کام تھا امن برگیڈ کا۔ میں خود بھی دوبار پٹ چکا ہوں امن برگیڈ کے ہاتھوں۔ ہمارے

www.taemeernews.com

محلے کانیشنل کانفرنس کا دفتر اذیت پہنچانے کا ایک سینٹر تھا۔ وہاں ایک لمبا تگڑا پلیس برگیڈ کا جوان صرف کوڑے مارنے پر مامور تھا۔ایک روز شاید میں نے سلام نہیں کیا کہ گھسیٹا گیا دفتر پر اور برسائے گئے کوڑے ۔ زخم اتنے لگے کہ آج بھی جب یاد آتا ہے تو آنکھوں میں نفرت اتر آتی ہے ۔ایک بار اور پٹا ۔ہم ایک ہوٹل میں چائے پی رہے تھے ۔ گاندربل کے خاص سپاہی دوسرے ٹیبل پہ شراب پی رہے تھے ۔میں نے ریڈیو آن کیا ہی تھا کہ "یہ ریڈیو پاکستان ہے کی آواز آئی" پھر معلوم نہیں کہ شرابیوں نے کتنی دیر تک پیٹا ۔ ریڈیو کے ٹکڑے فرش پر بکھرے پڑے تھے ۔ پیس برگیڈ کے خوف سے ، گاندربل کی وحشت ناک حرکتوں سے اور بخشی عبدالرشید کے پالتو غنڈوں کی سینہ زوری سے لوگ کافی مدت تک شیخ محمد عبداللہ کو بھول گئے ۔ وہ یہ بھی بھول گئے کہ شیخ محمد عبداللہ کو بخشی غلام محمد نے قید کروایا تھا ۔ خوف نے لوگوں کو خاموش کردیا لیکن ایک منجھے سیاستداں کی طرح جو کشمیریوں کی نفسیات کو بخوبی سمجھتے تھے اور ان کی ہر رگ کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتے تھے بخشی غلام محمد نے رعایتوں کے انبار لگادئے ۔ راشن پہ سبسڈی یعنی کوڑیوں کے بھاو مہینے بھر کا راشن نچلی سطح سے یونیورسٹی سطح تک مفت تعلیم ، میڈیکل اور انجینئرنگ کی سیٹوں کی الاٹمنٹ اور حکومت کی طرف سے تعلیم کیلئے مالی امداد ۔ تعمیرات کا ایک نیا دور ۔سڑکوں کا نیا جال بچھانے کا بندوبست ۔سڑکوں کو کشادہ کرنے کے لئے مکانوں کا نیلام اور ایک لاکھ کی مالیت کے مکان کی سرکاری قیمت ۴ لاکھ روپے ۔ تعلیم کے فروغ کے لئے سیکڑوں کی تعداد میں اسکولی عمارتوں کی تعمیر ۔ بڑے سرکاری ہوٹلوں اور سرکاری سنٹروں کی تعمیر ۔ اور تعمیرات کے لئے بغیر کسی قاعدے قانون کے لوگوں کو ٹھیکے ۔ٹرانسپورٹ نظام کو بڑھاوا اور اس کے لئے پرمٹ سسٹم ۔کاغذ کا ایک ٹکڑا ۔پرمٹ ۔ٹکڑے کو فروخت کردو تو ۴ / لاکھ روپے ۔ نہیں تو کسی ٹرانسپورٹر کو کرایے پر دے دو ۔ماہانہ ۱۰ ہزار روپے کی آمدنی ۔ غریب اور مفلس لوگوں کے بچوں کو انجینئرنگ اور ڈاکٹری کی ٹریننگ سرکاری خرچے پر ۔ بخشی غلام محمد نے اپنے مخالفین کو بھی اپنی سخاوت سے محروم نہیں رکھا ۔ باپ جیل میں بند اور بیٹا سرکاری خرچے پر انجینئر یا ڈاکٹر بن رہا ہے اور اس سخاوت نے "خالد کشمیر کو بڈشاہ ثانی بنادیا ۔ بڈشاہ کشمیر کا ایک رحم دل اور سخی بادشاہ تھا ۔ بخشی صاحب کی سخاوت نے کئی قصے کہانیوں کو جنم دیا، لیکن اس سخاوت اور تعمیر و ترقی پر بدنما داغ تھا ڈکنٹر شپ کا ۔اختلاف رائے کو جبر و تشدد سے دبانے کا، احتجاج کی زبان کو گرم آلوؤں سے خاموش کرنے کا، سینہ تان کر کھڑے رہنے والوں کو جھکانے کے لئے ننگی پیٹھ پر گرم استری پھیرنے کا۔

www.taemeernews.com

-

www.taemeernews.com

بخشی غلام محمد کا دور کرپشن، کنبہ پروری اور غیر قانونی سرگرمیوں کا دور تھا یہ حقیقت مرکزی سرکار سے چھپی نہیں تھی۔ بخشی غلام محمد رعایتوں کے بل پر کشمیریوں کو ہندوستانی بنا رہے تھے یہ حقیقت بھی مرکز پر عیاں تھی۔ احتجاج کی زبان خاموش کرنے کے لئے نازی طور طریقے استعمال ہو رہے تھے یہ بات بھی مرکز کو معلوم تھی۔ ظلم و جبر اور تشدد، لڑکیوں کو زبردستی اٹھا کر ان کی عصمت دری، خوبصورت نوجوانوں کی انا توڑنے کے لئے ان کے ساتھ بدفعلی پاکستان کے لئے فضا ساز گار کر رہی تھی۔ یہ بھی ہر ایک کو معلوم تھا، لیکن معلوم نہیں بخشی صاحب کی سخاوت نے ممبران پارلیمنٹ، پریس اور مرکزی وزراء پر کس طرح کا سحر کیا تھا کہ ہر کوئی خاموش تھا۔ مانا کہ بخشی غلام محمد حاتم طائی تھے۔ بڈشاہ ثانی تھے۔ ہر جھولی ہر کشکول کو بھر دیتے تھے۔ لیکن یہ کوئی وجہ نہیں تھی مرکزی سرکار کی مصلحت آمیز خاموشی کی۔ اس کے باوجود کہ محی الدین قرہ اور محمد شفیع قریشی کی پاکستان نواز پولیٹکل کانفرنس تقویت حاصل نہیں کر رہی تھی لیکن پاکستان کے حق میں ایک فصل تیار ہو رہی تھی۔ پھر بھی مرکز خاموش رہا۔ سیاسی لڑائی بند کی گئی تھی اور خرید و فروخت کا سیزن شروع ہو گیا تھا۔ محمد شفیع قریشی جنہوں نے غلام محمد صادق کے جلسہ پر حملہ کرتے وقت راستہ کھول دو الحاق توڑ دو کا نعرہ بلند کیا تھا معلوم نہیں کیسے راولپنڈی کا راستہ کھلوانا بھول گئے اور وزیر بن گئے۔

بخشی غلام محمد بے تاج بادشاہ تھے انہوں نے غلام محمد صادق اور ان کے ہم خیال لیڈروں کے لئے ایسا ماحول بنا دیا کہ انھیں نیشنل کانفرنس سے علاحدگی اختیار کر کے ہندوستان نواز اپوزیشن پارٹی ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس بنانی پڑی، چونکہ اسمبلی کے چناؤ ہو چکے تھے اس لئے ڈی این سی (ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس) کو اسمبلی میں ریڈی میڈ ممبران اسمبلی کی حمایت حاصل ہوئی۔ ان میں خواجہ غلام محمد صادق، سید میر قاسم، در گا پرشاد در، غلام رسول کار، عبدالرحمن راحت، ماسٹر ثناء اللہ، کرشن دیو سیٹھی، موتی رام بیگڑہ، گردھاری لال ڈوگرہ، میر بادشاہ، رام پیارا صراف، مہاشہ ناہر سنگھ وغیرہ شامل پرانے سرکردہ کمیونسٹ لیڈر میر غلام محمد راجپوری اور پیر غیاث الدین خالد کشمیر کی مہربانی سے شدھ نیشنل کانفرنسی بن گئے تھے۔ سرمایہ کی چمک دمک نے ذہنی سوچ مفلوج کر دی تھی وہ بدستور بخشی صاحب کے دربار کے درباری بنے رہے۔ اور ایسے گناہ اور ظلم کئے کہ بیان کریں تو زبان جل جائے گی۔ ہندوستان نواز اپوزیشن پارٹی نے وادی میں خاص کر ایک نئی صحت مند فضا کو ابھارنے میں مدد دی لیکن اقتدار میں برسوں شریک صادق اینڈ کمپنی ۳ برسوں میں ہی تھک گئی اور ایسی قلابازی کھائی کہ شریف زادے ہوتے تو گردن ٹوٹ جاتی۔

www.taemeernews.com

بخشی دور　　باب ۳

نیشنل کانفرنس میں گو کمیونسٹ نواز بھی تھے اور بخشی نواز بھی۔ لیکن طوطی بولتی تھی بخشی نواز عناصر کی۔ اقتدار بخشی غلام محمد کے پاس تھا۔ نیشنل کانفرنس پر قبضہ تھا ان کے بھائی عبدالرشید کا۔ سرکاری افسران کے پاس وفاداریاں خریدنے کی کنجی تھی اور غلام محمد صادق، درگا پرشاد در، سید میر قاسم سیاست کی اس بساط پر وزیر ہوتے ہوئے بھی مہروں کی طرح پٹتے رہے۔ پٹے بھی لیکن اف نہیں کیا کیونکہ خطرہ سامراج کا تھا۔ اسکے برعکس جموں میں سیاسی حالات مختلف تھے۔ وہاں صوبائی نیشنل کانفرنس پر کمیونسٹوں کا قبضہ تھا جنہیں نہ پرمٹوں سے خریدا جاسکا نہ ہی وزارتی عہدوں سے۔ انھیں پولیس کے تشدد سے بھی مرعوب نہیں کیا جا سکا۔ نہ انھیں سامراج نے ہی نکما بنایا۔ جموں کے ان لیڈروں میں موتی رام بنگیڑہ، مہاشہ ناہر سنگھ، کرشن دیو سیٹھی، رام پیارا صراف، ترلوچن دت، گردھاری لال ڈوگرہ اور دوسرے سینکڑوں سیکولر نیشنل کانفرنسی شامل تھے۔ جموں میں اتنی صحت مند فضا تھی کہ بخشی عبدالرشید اپنے تمام لاؤ لشکر اور پولیس حمایت کے باوجود نیشنل کانفرنس کے صوبائی دفتر میں جانے کی جرائت نہیں کرتے تھے۔ کئی بار سازشیں کی گئیں کہ تنظیمی چناؤ میں کمیونسٹوں کو شکست دی جائے لیکن کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ بخشی غلام محمد نے ایسے مشکوک کردار کے لوگوں کو نیشنل کانفرنس میں بھرتی کیا جو یا تو مہاراجہ کے قریبی مشیر رہ چکے تھے یا پھر ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات میں لوٹ مار قتل وغارت میں سرگرم تھے۔

جموں کے کمیونسٹ اسمبلی کے اندر اور باہر بخشی غلام محمد اور ان کے خاندان کے افراد کے خلاف کرپشن، کنبہ پروری، لوگوں پر ظلم و تشدد کے خلاف مسلسل آواز بلند کرتے رہے۔ جموں کے ساتھ ناانصافی پر بھی احتجاج کرتے رہے اور ساتھ ہی کشمیر کے کمیونسٹوں کو بھی للکارتے رہے کہ نیشنل کانفرنس سے یارانہ نہ صرف غیر پیداواری ہوگا بلکہ یہ کشمیر میں منفی سیاست کا موجب بھی بن جائے گا۔ غلام محمد صادق، سید میر قاسم، درگا پرشاد در وغیرہ اس بات سے مطمئن تھے کہ وہ کابینہ کے ممبر ہیں انھیں اس بات کی فرصت نہیں تھی کہ وہ اقتدار کی گدی سے باہر جھانکتے کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ تو مطمئن تھے کہ بخشی غلام محمد لاکھوں کشمیریوں کے جلسوں میں ہندوستان زندہ باد کے نعرے بلند کرواتے ہیں۔ ۲۶ جنوری کو چراغاں کراتے ہیں۔ ۱۵

www.taemeernews.com

اگست کو سر راہ سلامی لیتے ہیں۔ انھیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ کہ ہر جلسہ ہندوستان کو بلیک میل کرنے کا ایک ہتھیار ہے۔ گاؤں کی ایک چھوٹی سی منصف عدالت کے ایک غیر معروف وکیل کو نمبر اسمبلی اور وزیر بنانے کا ایک حربہ ہے۔ ہندوستان کے ٹیکس دہندہ کی دولت کو لٹانے کا ایک راستہ ہے۔

اسی دوران نیشنل کانفرنس کی طلبہ یونین اور کمیونسٹ پارٹی کی اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا بھی یارانہ مضبوط ہوا اور سرینگر کے پرتاپ پارک میں کانفرنس منعقد ہوئی۔ ہم سب اسٹوڈنٹ (کمیونسٹ) اس کانفرنس کو کامیاب بنانے میں جٹ گئے۔ چند نام یاد ہیں۔ موتی لال رینہ، روپ کشن اوگرہ، ہیرالال مصری، موہن چراغی، شیام لال، منشی غلام محمد وغیرہ دن رات اس کانفرنس کی کامیابی میں جٹ گئے۔ موتی لام رینہ خزانچی مقرر ہوئے لیکن بغیر خزانہ کے۔ خزانے کی چابی بخشی غلام محمد کے قریبی رشتہ داروں محمد یوسف بخشی، محمد شفیع بخشی، احمد بخشی، اومکار سنگھ، مکھن لام رینہ وغیرہ کے پاس تھی۔ بھوکے رہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ بھوکے پیٹ کام کرنا ہمارا معمول بن گیا تھا ایک روز جب بھوک برداشت نہ ہوئی تو خزانچی موتی لال رینہ اور میں ایک حلوائی کی دکان پر گئے اور ایک ایک پاؤ دودھ اور جلیبیاں کھائیں، کل خرچ ڈھائی روپے اور جب کھا پی کر واپس آئے تو موتی لال رینہ نے بلند آواز میں کہا "آج ہم نے بھی کرپشن کیا" حالانکہ کنجی بردار روز شام کو ایک ہوٹل میں شراب کے ساتھ مرغ مسلم بھی کھایا کرتے تھے، کرپشن سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اسٹوڈنٹ کانفرنس میں "ہم لوگ" فلم کے ڈائریکٹر ضیا سرحدی بھی آئے تھے، ان سے بھی ملاقات ہوئی، ان دنوں وہ ہمارے ہیرو تھے۔ قرارداد وں کا مسودہ کمیونسٹ پارٹی سے بن کر آیا۔

پہلی بار ایک نئے چہرے کو اسٹیج پر دیکھا نام تھا شمیم احمد شمیم، خوبصورت، جاذب نظر اور صاف گو۔ بخشی غلام محمد کے سامنے انھوں نے جو تقریر کی ہر لفظ اس کا حقیقت پسندانہ تھا لیکن تھا شیخ حمایتی۔ ہم نے ڈٹ کر ہوٹنگ کی کیونکہ ہمیں شمیم احمد شمیم میں امریکی سامراج نظر آیا۔ بخشی غلام محمد ایک ایسے سنار تھے کہ وہ کھرے اور کھوٹے کی پہچان اپنی کسوٹی پر پرکھنے کے ماہر تھے۔ انہوں نے شمیم احمد شمیم کی صلاحیتوں کو پہچان لیا۔ نہ غصہ نہ ماتھے پر شکن۔ خوب تعریف کی اس نوجوان کی اور ہم کمیونسٹ پریشان کہ سامراجی ایجنٹ اور اس کی تعریف۔

کانفرنس میں ایک ہی یونین بنانے کا فیصلہ کیا گیا اور میں بھی ایک عہدیدار مقرر ہوا۔ لیکن یہ یونین چند دنوں کے بعد ہی دم توڑ گئی کیونکہ قانون ساز کونسل کیلئے ایک ممبر منتخب کرنے پر جھگڑا ہوا۔ جھگڑا ہمارے ساتھ نہیں بلکہ بخشی غلام محمد کے ایک رشتہ دار علی بخشی (بعد میں وہ ڈائریکٹر انفارمیشن کے عہدے پر فائز ہوئے) اور صوفی غلام رسول کے درمیان شروع ہوا۔ شمیم احمد شمیم

www.taemeernews.com

شعلہ بیان مقرر تھے۔ اردو زبان پر عبور تھا۔ بہت اچھا لکھتے تھے، خوب صورت اور جاذب نظر بھی تھے ۔ بخشی غلام محمد نے ایک ماہر جوہری کی طرح اس موتی کو اپنی مٹھی میں بند کر لیا اور محکمۂ انفارمیشن کے کلچرل سیٹر میں افسر مقرر کر دیا۔

ٹھیکے، پرمٹ، پلاٹ، سرکاری نوکریاں اور وظیفے یہ سب نہ بزرگ کمیونسٹوں کو اور نہ ہی جوان کمیونسٹوں کو رخ بدلنے پر مجبور کر سکے، جو جہاں تھا، جس محاذ پر تھا ایمانداری سے کام کرتا ۔ عبدالرحمان راحت، غلام محمد میر لسجن، عبدالستار رنجور، غلام احمد حلوائی، غلام نبی مرچا، رشی دیو وغیرہ کسان مورچہ پر کام کر رہے تھے۔ موتی لام مصری، اومکار ناتھ ترسل۔ عزیز ہارون، نور محمد روشن، محمد یوسف ڈار، ہردے ناتھ درانی، سردار اتم جیت سنگھ، سردار سرن سنگھ، پیر بہاؤالدین، غلام احمد کمنڈہ پشکر ناتھ جلالی، مکھن لال پان والا، موتی لال جیلخانی، غلام احمد کاو ڈارہ، غلام نبی درزی، بنسی پارمو، امیش کول، دوار کا ناتھ گاسی، کنہیا لال نادر وغیرہ اپنے اپنے محاذوں پر ڈٹے رہے۔ پارٹی کی خفیہ میٹنگوں میں بخشی غلام محمد اور کمیونسٹ سیرت والے لیڈروں کے خلاف زوردار بحث ہوتی تھی لیکن باہر بدستور سامراج کی دشمنی میں بخشی غلام محمد کی حمایت۔ کمیونسٹ پارٹی کا بک شاپ البتہ اپنا مثبت رول کر رہا تھا۔ انچارج تھے اومکار ناتھ کاچرو۔

اسمبلی کے چناؤ نزدیک آ رہے تھے۔ بخشی غلام محمد اور ان کے نزدیکی نیشنل کمیونسٹوں کی جڑیں کاٹنے کے لئے کلہاڑیوں کا بندوبست کر رہے تھے کہ سویت یونین کے صدر بلگانن اور کرشچف کشمیر آئے۔ بھلا ایسے زمانے میں کیوں کوئی کمیونسٹ بخشی غلام محمد کا دشمن بنتا۔ لگ گئے مہمانوں کی سواگت کے لئے۔ پھر تجوریوں کے منہ کھول دئے گئے۔ درگا پرشاد درانتظامات کے انچارج۔ سڑکوں پر جو گیٹ کھڑے کئے گئے۔ لاکھوں روپے خرچ کئے گئے۔ دینا ناتھ نادم نے کشمیری زبان کا پہلا اوپیرا لکھا۔ بمبر بمبر زل ایک علامتی اوپیرا۔ سامراج پر اشتراکیت کی فتح، لاکھوں کشمیری سڑکوں پر۔ ہندوستان زندہ باد، ہندی روسی بھائی بھائی۔ سروں کا امنڈتا طوفان، پھولوں کی بارش اور پھر راج گڑھ میں مہمانوں کا شہری استقبال اور کرشچف کا اعلان" کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ انگ ہے اگر کبھی ہماری مدد کی ضرورت پڑے تو ہمالیہ کی چوٹی سے ہمیں بلانا"۔ روسی لیڈروں کی کشمیر میں آمد نے اقوام متحدہ میں کشمیر کیس کی نوعیت بدل دی۔ پہلی بار ایک سپر پاور نے ہند کشمیر الحاق کی تصدیق کر دی اور اس طرح رائے شماری کے نعرے پر پہلا بھرپور وار کیا گیا۔ کشمیر کے کمیونسٹ خوش کہ اب دنیا کی کوئی طاقت کشمیر کو ہندوستان سے علحدہ نہیں کر سکتی۔ لیکن بخشی غلام محمد اندر ہی اندر ایک نیا کھیل کھیل رہے تھے۔ وہ اپنی لیڈرشپ کو مستحکم بنا چکے تھے۔ شیخ صاحب اور ان کے ساتھی جیلوں میں تھے۔ کسان کا نام لیوا کوئی نہیں تھا۔ بخشی غلام محمد کو کمیونسٹوں پر تکیہ کرنے کی ضرورت بھی

www.taemeernews.com

نہیں تھی اور پھر اب ان کے اپنے درباری رتن تھے۔ جانکی ناتھ زتشی، سری کینٹھ رینہ عرف سری گلوب، آر سی رینہ، اومکار ناتھ در، رام ناتھ۔ شمیم احمد شمیم، علی جواد زیدی، وید بھسین، نذیر حسین سمانی وغیرہ۔ کمیونسٹوں کو سیاسی زندگی سے الگ تھلگ کرنے کا انتظام مکمل کر لیا گیا۔ اسمبلی کے چناؤ کے لئے ٹکٹوں کی تقسیم کے وقت بخشی غلام محمد نے غلام محمد صادق۔ درگا پرشاد در اور باقی کمیونسٹوں کو تو منڈیٹ دیا لیکن ساتھ ہی ان کے مقابلہ پر امیدواروں کو کھڑا بھی کیا گیا۔ غلام رسول ریزد کے بارے میں عام افواہ تھی کہ وہ کمیونسٹ تھے۔ بخشی عبدالرشید نے ان کے مقابلہ پر نیشنل کانفرنس کے ہی ایک سرکردہ رکن غازی عبدالرحمان کو کھڑا کیا۔ سب جانتے تھے کہ یہ ایک سازش تھی لیکن بخشی غلام محمد نے آخری وقت تک غلام رسول ریزد کو ہی نیشنل کانفرنس کا امیدوار قرار دیا اور انھیں شکست بھی دلائی۔ غلام محمد صادق۔ درگا پرشاد در اور دوسرے لیڈروں کو بھی شکست دلانے میں بھی کامیاب رہتے لیکن مرکزی سرکار کا دباؤ تھا اور ابھی وقت نہیں تھا مرکز کے خلاف ٹکر لینے کا۔ جموں میں بھی یہی کھیل کھیلا گیا لیکن بخشی غلام محمد کامیاب نہیں ہوئے۔ نئی اسمبلی بنی اور بنتے ہی کشمیر کی سیاست کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ کمیونسٹ لیڈروں نے نیشنل کانفرنس سے باہر آ کر ایک ہندوستان نواز اپوزیشن پارٹی ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس بنائی۔ اگر لیڈروں کو ۲ برسوں کی جدوجہد میں اس بات کا احساس نہ ہوا ہوتا کہ اپوزیشن کی راہ کٹھن ہے تو وہ ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کا جوان ہونے سے قبل خون نہ کرتے اور آج کشمیر ہم سب کے لئے پریشانی کا باعث نہ بنا ہوتا۔

www.taemeernews.com

-

www.taemeernews.com

کشمیر کی تاریخ وشواس گھات کی تاریخ ہے۔ وشواس گھات لوگوں نے نہیں لیڈروں نے کیا۔ شیخ محمد عبداللہ نے ۱۹۴۷ء سے قبل "نیا کشمیر" پروگرام قوم کے سامنے رکھ کر اشتراکی نظام کا ایک خاکہ پیش کیا لیکن اس کے لئے استعمال کیا مسجد کو، مذہب کو، قرآن کو اور یہی وجہ ہے کہ اس اشتراکی پروگرام کی نظریاتی افادیت کھو گئی۔ اقتدار میں آنے کے بعد ۱۹۵۳ء یعنی گرفتاری تک انہوں نے حزب اختلاف کو دبانے کے لئے پیپلز ملیشیا کو استعمال کیا۔ مخالفوں کے سیاسی طور سے زندہ رہنے کا حق چھین لیا۔ یہ آزادی کے بعد پہلا وشواس گھات تھا۔ بخشی غلام محمد اقتدار میں آئے۔ انہوں نے احتجاج کی زبان خاموش کرنے کے لئے یا تو زبان کاٹ دی یا پھر زبان پر سکے رکھ کر اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ اپنے حمایتی لوگوں کے گھر بھر دئے اور اپنے رشتہ داروں کو برلا اور ٹاٹا کی سطح تک پہنچا دیا۔ ریگل چوک سے اسٹیٹ بنک چوک تک ۱۱ پختہ عمارتیں۔ دکانوں کی لمبی قطاریں۔ کئی منزلہ ہوٹل۔ موٹر گاڑیوں اور بسوں ٹرکوں کی ایجنسی اور پھر سون دار میں عالی شان محلات اور کشمیر سے باہر اور بمبئی میں کروڑوں کی تجارت۔ یہ تھا معاوضہ جو بخشی خاندان نے وصول کیا ہندوستان زندہ باد کا نعرہ بلند کرنے کے لئے۔ یہ دوسرا وشواس گھات تھا۔ بخشی خاندان کی کرپشن، ظلم و تشدد اور عوام دشمن پالیسیوں کے خلاف خواجہ غلام محمد صادق کی حکمراں جماعت سے بغاوت اور ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کا قیام ایک نئی امید کا مرکز تھا۔ کشمیری مسلمانوں میں یہ ایک نئی سوچ پیدا ہو رہی تھی کہ الحاق مسئلہ نہیں ہے، مسئلہ ہے ایک پاک صاف سرکار کا۔ جمہوری نظام کا۔ اپنی مرضی سے اپنی سرکار بنانے کا۔ کشمیری مسلمانوں کا ذہن یہ قبول کرنے پر آمادہ ہو رہا تھا کہ اقتدار سے باہر رہ کر بھی کسی لالچ کے بغیر آزاد ہندوستان زندہ باد کا نعرہ بلند کیا جا سکتا ہے۔ ایک نئی فضا ابھر رہی تھی۔ جمود ٹوٹنے لگا تھا۔ ڈکٹیٹر شاہی پر ضرب لگ رہی تھی۔ پیس برگیڈ بھی بے نقاب ہو رہا تھا۔ غلام قادر گاندربل کے پالتو کتے بھی ٹانگوں میں دم دبا کر تھانوں میں بند تھے۔ لیکن غلام محمد صادق اور ان کے ساتھی گھبرا گئے۔ اسمبلی چناؤ نزدیک آ رہے تھے۔ اور وہ مرکزی سرکار کے اشاروں کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ سوا غلام محمد صادق اور ان کے ساتھیوں کی حکمراں جماعت سے علاحدگی میں مرکز کی رضامندی شامل تھی۔ بیچ راستے میں موڑ کاٹ کر ڈی این سی کو توڑ کر غلام محمد صادق نے بھی کشمیری قوم کے ساتھ ایک اور وشواس گھات کیا۔

www.taemeernews.com

ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس باب ۴

ڈیمو کریٹک نیشنل کانفرنس کا تجربہ ریاست کی سیاسی زندگی میں ایک نیا صحت مند تجربہ تھا۔ اسمبلی کے اندر اور باہر عوامی مسائل کے لئے جدوجہد ظلم تشدد کے خلاف ایجی ٹیشن اور کرپشن کے خلاف آواز بلند کرنا وادی کی سیاسی زندگی کا ایک نیا تجربہ تھا۔ پہلی بار اقتدار سے باہر رہ کر بھی کسی سیاسی پارٹی نے ہند کشیر الحاق کی تاریخی حقیقت کو جھٹلایا نہیں، یہ کشمیریوں کے لئے ایک نیا رجحان تھا۔ ویسے بھی کشمیر کا المیہ یہ ہے اقتدار سے علاحدہ ہو کر سیاست داں اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لئے الحاق کے بارے میں شک وشبہات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ ڈی این سی کے شروع ہوتے ہی نوجوان کمیونسٹوں پر اخبار کشمیر کی ہاکنگ کرنے کی ذمہ داری ڈال دی گئی اور اخبار فروخت کرنے والوں میں موتی لال رینہ، چمن لال چمن، مکھن لال بیکس، نور محمد رعناداری، موہن چراغی، رتھندر کول۔ شبن تکو۔ روپ کشن او گرہ۔۔ محمد اسمعیل، غلام محمد کھنڈہ، غلام نبی درزی، غلام نبی مرچا، میر غلام نبی، غلام احمد کادڈارہ، بہاؤالدین وغیرہ شامل تھے۔ اخبار کشمیر مقبول ہونے لگا۔ ہزاروں کی تعداد میں بکنے لگا۔ پیس برگیڈ سے مار بھی کھاتے رہے لیکن کوئی اپنے محاذ سے نہیں ہٹا۔ بخشی غلام محمد نے اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے سری نگر سے ویدھیسن کے ذریعہ کشمیر پوسٹ نام کا انگریزی اخبار شروع کیا۔ اسی طرح شمیم احمد شمیم، علی جواد زیدی۔ کمال احمد صدیقی کی خدمات حاصل کر کے ایک ہفتہ وار اردو اخبار بھی شروع کر دیا۔ دونوں اخباروں کی زبان پیس برگیڈی زبان تھی۔ ایک مثال "نالی کے کیڑے درگا پرشاد در۔ ڈورو شاہ آباد کے مولوی میر قاسم" ایسی لچر زبان کہ آج جب یاد آتی ہے تو سوچنے لگتا ہوں کہ چند ٹکوں کے عوض انسان کس حد تک پست ذہنیت کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔

اخبارات جب نالی کے کیڑوں کو خاموش کرنے میں کامیاب نہ ہوئے تو پیس برگیڈ کی خدمات حاصل کی گئیں اور بدنام غنڈوں کو سر راہ ڈی این سی کے کارکنوں اور لیڈروں پر قاتلانہ حملے کرنے پر مامور کیا گیا۔ نام ان غنڈوں کے یاد ہیں ان میں قادر ناٹیہ، حمہ کوشل اور اسد ٹانگہ اتنے ہی نام ذہن میں ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا دن گذرا ہو جب اخبار فروخت کرتے کرتے پٹ نہ گئے ہوں۔ مار کھاتے رہتے اور نعرہ بلند کرتے " گلی سڑی سرکار کو ایک دھکا اور دو۔ جو سرکار نکمی ہو

www.taemeernews.com

وہ سرکار بدلنی ہے"۔ ایک اور اصطلاح تھی ان دنوں کاگر خان کی۔ داستان گو کا کہنا ہے کہ پٹھان دور میں جب کشمیری پٹھان گورنر کے ظلم سے تنگ آئے تو انہوں نے لاہور دربار سے شکایت کی۔ گورنر تبدیل ہوا تو ایک اور گورنر آیا۔ بتایا جاتا ہے کہ جب نیا گورنر گھوڑے پر سوار ہو کر بارہمولہ پہنچا تو آگے سے ایک میت قبرستان کی طرف جارہی تھی۔ میت کے ساتھ ہزاروں لوگ تھے۔ گورنر نے پوچھا کہ جلوس کس لئے تو انہیں بتایا گیا کہ ایک معزز شہری کی میت ہے۔ گھوڑے سے اترے کفن چہرے سے اٹھادیا اور جھک کر لاش کا کان دانتوں سے کاٹ دیا اور سینہ تان کر لوگوں سے کہا۔ "میرا نام کاگر خان ہے میں مردے کو بھی معاف نہیں کرتا" خواجہ غلام محمد صادق نے نیشنل کانفرنس کے جنرل سکریٹری بخشی عبدالرشید کو، اس یگ کا کاگر خان قرار دیا اور ہم کمیونسٹوں نے کاگر خان مردہ باد کے نعرے بلند کرنے شروع کر دئے۔

ڈی این سی کی پہلی کانفرنس گاندھی پارک سری نگر میں منعقد ہوئی۔ شاید ستمبر کا مہینہ تھا۔ جموں سے کافی تعداد مین ڈیلی گیٹ آئے تھے۔ حسب روایات سیاسی، سماجی اور معاشی قرار دادوں کے مسودے تیار کئے گئے۔ ایک کتابچہ بخشی صادق خط و کتابت بھی جاری کیا گیا۔ کانفرنس کی حفاظت کے لئے کمیونسٹوں کو ڈیوٹی پر لگایا گیا کیوں کہ پیس بر گیڈوں کے جوان کبھی بھی اور کسی بھی وقت حملہ کر سکتے تھے اور ان کا حملہ جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا۔ پہلے روز کی کانفرنس میں دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ عبدالرحمان راحت بڈ گامی نے جو کہ کمیونسٹ پارٹی کی ہائر کمیٹی کے ممبر تھے۔ پہلی بار حکومت کو ڈسمس کرنے کا نعرہ بلند کیا۔ ایک اور آواز بلند ہوئی کہ شیخ محمد عبداللہ کو رہا کیا جائے۔ ہزاروں لوگوں کے جلسے میں کرشن دیو سیٹھی نے لاٹھی گولی کی سرکار کو توڑنے کا مطالبہ کیا۔ دن گذر گیا رات آئی کہ پہلی بار ستمبر کے مہینہ میں برفباری شروع ہوئی۔ برفباری تھی کہ طوفان اور ہم ٹینٹوں میں کھڑے سردی سے کانپتے ہوئے حفاظت کرنے پر مامور جو جہاں کھڑا تھا وہ وہیں کھڑا رہا۔ لیڈر لوگ غائب اپنے گھروں میں۔ صبح ہوئی تو مسئلہ پیدا ہوا کہ جموں کے ساتھیوں کو کہاں پناہ دی جائے۔ سرمایہ تو تھا نہیں کہ ہوٹلوں میں رکھتے۔ لوگوں نے سہارا دیا اور اس طرح کی کانفرنس برف کی نذر ہو گئی۔ لیکن ایک پیغام ضرور عوام تک پہنچ گیا کہ اگر وہ جرائت کریں گے تو جمود کو توڑنا مشکل نہیں۔

بخشی غلام محمد خاموش تو نہیں رہ سکتے تھے انہوں نے اوچھے ہتھیار استعمال کرنے شروع کر دیے۔ سوپور کے ایک لیڈر غلام رسول کار پر کسی شہری کی چادر چرانے کا الزام لگایا گیا اور پولس حرکت میں آئی۔ پلوامہ کے ممبر اسمبلی ماسٹر ثناء اللہ کے کمیت میں ایک گھوڑا رات کے اندھیرے میں رسی سے باندھ دیا گیا پولیس میں کسی نے رپورٹ کی کہ گھوڑا چوری ہوا ہے۔ پولیس نے مال مسروقہ ثناء اللہ کے کمیت سے برآمد کیا۔ ایسے سینکڑوں جھوٹے کیس بنائے

www.taemeernews.com

گئے۔ سوپور میں ٹاؤن ایریا کمیٹی کے چناؤ ہونے والے تھے۔ سری نگر سے سید میر قاسم کی قیادت میں ایک بس میں ہم کئی کارکن سوار ہو کر سوپور گئے۔ غلام رسول ریزو۔ پیارے لال ہنڈو اور اکبر لداخی کے نام یاد ہیں۔ سوپور بازار میں بس سے اترتے ہی پیس بریگیڈ کے غنڈوں نے حملہ کیا۔ وہ میر قاسم اور غلام رسول ریزو کو قتل کرنے پر بضد تھے۔ میر قاسم کو تو پولس کے ایک افسر نے بچایا لیکن غلام رسول ریزو کافی دیر تک پٹتے رہے۔ ہم کارکنوں کی حالت تو مختلف تھی ہمارے پٹنے سے الحاق ٹوٹ تو نہیں سکتا تھا۔ البتہ سرینگر میں شنکر آچاریہ کی پہاڑی کے دامن میں تعمیر عالیشان کوٹھی میں جب غلام محمد صادق کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے فوراً صدر راج نافذ کرنے کا مطالبہ کیا حالاں کہ اس وقت کسی بھی صورت میں صدر راج نافذ نہیں ہو سکتا تھا کیوں کہ تب ریاست خود مختار تھی، سیاسی سطح پر لڑائی جاری تھی کہ بخشی غلام محمد نے کلچرل محاذ پر بھی شب خون مار دیا۔

جس بلڈنگ میں کشمیر کلچرل کانفرنس کا دفتر تھا وہ عمارت بخشی غلام کے بیٹے بخشی بشیر نے خرید لی تھی۔ پہلا وار یہ کیا کہ دفتر کو خالی کرنے کا حکم ملا۔ سرکردہ ادیبوں خاص کر علی محمد لون، پران کشور وغیرہ کو تبدیل کر دیا، اور چند ایک ادیبوں کو خرید لیا۔ ان میں امین کامل۔ غلام رسول سنتوش وغیرہ شامل ہیں۔ تسمیم احمد تسمیم کی پلاننگ نے اس مضبوط کلچرل محاذ کو توڑ دیا۔ لیکن اس سے باقی ادیب، شاعر اور پینٹر بددل نہیں ہوئے۔ اس دور میں مرحوم راہی معصوم رضا سری نگر کے ٹی بی ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ وہ ڈی این سی کے خاص ہمدرد تھے۔ خانیار کے جلسے میں انہوں نے اپنی نظم سے دلوں کو اس قدر گرمایا کہ محسوس ہو رہا تھا کہ ڈی این سی نے میدان مار لیا ہے۔ ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کی سالانہ کانفرنس جموں میں منعقد ہوئی۔ جموں کی سیاسی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ وادی کے کسی لیڈر کا سڑکوں پر جموں کے لوگوں نے استقبال کیا ہو۔ کھلی جیپ میں سوار غلام محمد صادق اور کرشن دیو سیٹھی کا ایسا شاندار جلوس، محسوس ہوتا تھا کہ جموں نے غلام محمد صادق کو قبول کیا، جلوس بازاروں سے گذر رہا تھا نعرے لگ رہے تھے گلی سڑی سرکار کو ایک دھکا اور دو۔ جو سرکار نکمی ہو وہ سرکار بدلنی ہے۔ لاٹھی گولی کی سرکار بدلنی ہے۔" ان نعروں کی گونج سے سرکاری ایوان ہل گئے اور ایوان سے بھیجے گئے اس زمانے کے جموں کے پڑھے لکھے پیس بریگیڈی جلوس کو تتر بتر کرنے لپکے۔ ان میں عبدالغنی گونی، امرت ملہوترہ، بھیم سنگھ، نذیر حسین سمانی وغیرہ شامل تھے۔ ان شریف زادوں نے پہلا وار ڈی این سی کے دفتر پر کیا اور اس میں آگ لگا دی۔ دوسرا وار انہوں نے کانفرنس میں شریک ڈیلی گیٹوں کے لئے پک رہے کھانے پر کیا لیکن وہ کانفرنس کو توڑنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ یہ کانفرنس ایک کامیاب کانفرنس تھی۔

www.taemeernews.com

اس دوران مرکزی سرکار اپنی منشا میں کامیاب ہو رہی تھی۔ ۱۹۵۴ء کے بعد بخشی غلام محمد نے اپنی پوزیشن مستحکم بنالی تھی۔ ان کی سرکار کو استحکام حاصل ہوا تھا اور ان میں خود اعتمادی پیدا ہوئی تھی۔ خود اعتمادی نے بخشی غلام محمد کو خود سر بنا دیا اور انہوں نے مرکزی سرکار سے آنکھ مچولی شروع کر دی۔ ہندوستان کے جمہور نواز خاص کر کمیونسٹوں نے بھی ڈی این سی پر حملوں اور جمہوری حقوق کی پامالی پر آواز بلند کرنی شروع کی تھی۔ بخشی غلام محمد جو ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑے تھے ڈی این سی کے پے در پے وار سے کمزور ہونے لگے اور مرکزی سرکار کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو گئے۔ انہوں نے پرمٹ سسٹم ختم کرنے، سپریم کورٹ اور الیکشن کمیشن کے دائرہ اختیار میں ریاست کو لانے اور شیخ محمد عبداللہ کو رہا کرنے کی تجویز کو تسلیم کر لیا۔ مرکزی سرکار کی نظروں میں ڈی این سی کا رول ختم ہو چکا تھا کشمیر کی سیاست کا ایک اور المیہ یہ ہے کہ مرکزی سرکار نے کبھی بھی کسی ایک لیڈر پر اعتماد نہیں کیا۔ شیخ محمد عبداللہ وزیر اعظم تھے تو بخشی غلام محمد نائب وزیر اعظم بخشی غلام محمد وزیر اعظم تھے تو غلام محمد صادق کو بھی تیار کیا جا رہا تھا۔ غلام محمد صادق وزیر اعظم تھے تو سید میر قاسم پردے کے پیچھے کھڑے تھے۔ سید میر قاسم وزیر اعلا بنے تو مفتی محمد سعید کو تیار رہنے کا حکم دیا گیا۔ اشارہ مرکز کا تھا اور تخت الٹے جا رہے تھے کشمیریوں کی مدد سے ڈی این سی کا کارواں بڑھ رہا تھا کہ جواہر لال نہرو کشمیر آئے اور انہوں نے ایک عوامی جلسہ میں اعلان کیا" کہ غلام محمد صادق وغیرہ نے سو فیصد غلطی کی ہے نیشنل کانفرنس سے علاحدہ ہو کر۔ ڈی این سی کی وجہ سے پاکستان کا کاز مضبوط ہو رہا ہے۔

میں اور محمد اکرام اخبار کشمیر میں ہول ٹائمر تھے۔ درگا پرشاد در روزانہ دفتر آتے۔ چند گھنٹے بیٹھ کر چلے جاتے تھے۔ موتی لال مصری اور نور محمد اخبار کو ایڈٹ کرتے تھے۔ اسی دوران امرتسر مین کمیونسٹ پارٹی کی کانفرنس ہوئی۔ کشمیر سے موتی لال مصری، عبدالرحمن راحت، اور میر بجن بحیثیت ڈیلی گیٹ کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے۔ درگا پرشاد در اور سید میر قاسم نہیں چاہتے تھے کہ یہ تینوں لیڈر کمیونسٹ کانفرنس میں شریک ہوں کیوں کہ وہ مرکزی سرکار سے خوفزدہ تھے کہ وہ کمیونسٹوں کے کیمپ میں چلے گئے ہیں۔ امرتسر میں کانفرنس ہوئی اور وہاں سے کئی ریاستوں کے کمیونسٹ لیڈر کشمیر کی سیاحت پر آئے، ان میں مغربی بنگال کے آج کے وزیر اعلا جیوتی باسو۔ کامریڈ مخدوم محی الدین۔ کامریڈ سرجیت۔ کامریڈ بسواس وغیرہ بھی شامل تھے۔ ان کی آمد سے صادق کیمپ میں کھلبلی مچ گئی۔ لیکن غلام محمد صادق اینٹی کمیونسٹ رویہ کھلے عام اختیار کرنے پر تیار نہ تھے۔ ورنہ در گا پرشاد در اور سید میر قاسم اسی زمانے میں ڈی این سی سے کمیونسٹوں کو علاحدہ کرنے پر تیار تھے۔

www.taemeernews.com

مرکزی سرکار اس دوران کمیونسٹ پارٹی کے کامریڈ ڈانگے کو قائل کر چکی تھی کہ کشمیر میں ہندوستان نواز اپوزیشن جماعت کا وجود مفاد عامہ میں نہیں ہے کیوں کہ اس سے پاکستان کے موقف کی تائید ہوتی ہے کمیونسٹ خواجہ غلام محمد صادق کو وزیر اعلا بنانے پر زور دے رہی تھی لیکن مرکزی سرکار کی دلیل تھی کہ جب تک وہ نیشنل کانفرنس سے باہر رہیں گے ان کا وزیر اعلا بننا ناممکن ہے۔ ایک طرف مرکزی سرکار یہ دلیل دے رہی تھی تو دوسری طرف غلام محمد صادق، در گاپرشاد در، سید میر قاسم اور ان کے ہم خیال دوست لڑائی جھگڑے سے تنگ آ چکے تھے۔ اقتدار سے باہر رہ کر کئی طرح کی مراعات سے محرومی نے اس گروپ کو بد دل کر دیا تھا اور اسمبلی کے لئے چناؤ بھی ہونے والے تھے۔ ان لیڈروں کو یہ بخوبی معلوم تھا کہ وہ چناؤ جیت نہیں سکتے۔ بخشی غلام محمد مرکزی سرکار اور صادق گروپ کے درمیان خفیہ بات چیت سے بھی باخبر تھے۔ انہوں نے ڈی این سی کو توڑنے کے لئے پھر تجوریوں کے منہ کھولے۔ ڈی این سی سے پہلا لیڈر جو بخشی غلام محمد پر فریفتہ ہوا وہ غلام رسول ریزو تھے۔ جو نیشنل کانفرنس میں دو پھاڑ کرانے کے ذمہ دار تھے۔ دوسرا لیڈر کمیونسٹ رہنما عبدالرحمان راحت۔ تیسرا بھدرواہ کا ایم ایل اے میر بادشاہ تھا جو بخشی صاحب کی شرن میں چلے گئے اور بھی کچھ لوگ تھے جو جانے والے تھے لیکن ایک سرکردہ تاجر لالہ تیرتھ رام کی تجوری راستے میں حائل ہو گئی۔ اس سارے کھیل کا ایک اور کردار تھا مرحوم کاشی ناتھ بامزئی، مرکزی سرکار میں ایک اعلا عہدے پر تھے اور پنڈت جواہر لال نہرو کے خاص مشیروں میں سے تھے۔ وہ ڈی این سی لیڈروں اور بخشی غلام محمد کے درمیان پل بن گئے اور آخر ایک روز غلام محمد صادق اپنے ساتھیوں سمیت اس پل کو پار کر کے بخشی عبدالرشید کی قیادت کے سامنے جھک گئے۔

www.taemeernews.com

غلام محمد صادق اور ان کے ساتھیوں نے کشمیریوں کے ساتھ وشواس گھات کر کے اقتدار تو پھر سے حاصل کر لیا لیکن کشمیر کو اس کی بھاری قیمت چکانی پڑی۔ اقتدار سے باہر رہ کر کشمیری مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہونے لگا تھا کہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کا اقتدار کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ الحاق ایک نظریاتی سوال ہے اور ظلم و تشدد اور جبر کے سامنے بھی الحاق کو تسلیم کرنے والے اپنے نظریے میں ترمیم نہیں کرتے، پہلی بار الحاق کو اقتدار سے الگ کیا گیا تھا اور ایک ہندوستان حامی ایلوزیشن جماعت کے پلیٹ فارم سے عوامی مسائل کے لئے جدوجہد ممکن بن گئی تھی۔ مرزا محمد افضل بیگ نے ہندوستان مخالف محاذ رائے شماری نام کی ایلوزیشن جماعت بنائی تھی۔ شیخ محمد عبداللہ جو اس زمانے میں ہندوستان مخالف سیاست کی واحد علامت تھے اس محاذ کے بنیادی ممبر بھی نہیں بنے حالاں کہ رائے شماری کا ہر جلسہ ان کی عدم موجودگی میں کامیاب نہیں ہوتا تھا۔ الحاق کو توڑنے، رائے شماری کرانے اور ہندوستان کو ہندو ریاست قرار دینے کے بارے میں وہ گھنٹوں تقریر کرتے رہتے لیکن عوامی مسائل کا ذکر تک نہ کرتے۔ اس ایلوزیشن پلیٹ فارم نے عوام کے بنیادی مسائل کو مکمل طور سے نظرانداز کر دیا جب کہ ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس صحیح معنوں میں ایلوزیشن کا رول ادا کر رہی تھی اور ہندوستان زندہ باد کا نعرہ بھی بلند کرتی تھی۔ اس پلیٹ فارم کو توڑ کر غلام محمد صادق نے اپنی روزی روٹی کا مکمل بندوبست تو کر لیا لیکن سیاسی سطح پر جو خلاء پیدا ہوا، اسے پر کیا ہندوستان مخالف سیاسی جماعت نے جو کہ ریاست کی سیاسی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ آج کے حالات کو بھی اس پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو صحیح نتائج تک پہنچا جا سکتا ہے۔

www.taemeernews.com

وشواس گھات باب ۵

اخبار کشمیر میں کام کرنے والے ساتھیوں موتی لال مصری، نور محمد اور ہم سب کو یہ اشارے مل رہے تھے کہ خواجہ غلام محمد صادق وشواس گھات کی تیاری کر رہے ہیں۔ دفتر میں غلام محمد صادق سے دو ٹوک بات ہوئی اور انہوں نے ایک منجھے ہوئے عیار سیاستداں کی طرح ہمیں مطمئن کیا کہ یہ بخشی غلام محمد کا پروپگنڈہ ہے ڈیمو کریٹک نیشنل کانفرنس میں انتشار پیدا کرنے کا۔ اس سے قبل دوسرے درجے کے چند کمیونسٹوں عبدالعزیز ہارون، موتی لال جیلخانی، غلام نبی درزی وغیرہ نے بخشی عبدالرشید کی در پردہ سرپرستی میں ایک نئی تنظیم بنائی تھی اور ایک پمفلٹ "ایک قدم آگے" جاری کیا تھا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اومکار ناتھ ترسل بھی اس میں شامل تھا۔ اس کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ جب ڈیمو کریٹک نیشنل کانفرنس کی میت کو کندھا دینے کی تیاری ہو رہی تھی۔ اومکار ناتھ ترسل نے اخبار کے پارٹی سیل میں یہ تجویز رکھی کہ "اگر نیشنل کانفرنس میں واپس جانا ہی ضروری ہے تو ہم اس کا موقع غلام محمد صادق کو کیوں دیں۔ ہم خود ہی کیوں نہ جلسہ بلا کر نیشنل کانفرنس کے جنرل سکریٹری بخشی عبدالرشید کے سامنے ہتھیار ڈال دیں" اس سے کسی نے اتفاق نہیں کیا کیوں کہ خواجہ غلام محمد صادق نے وشواس دلایا تھا کہ وشواس گھات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہوں نے تو موتی لام مصری سے اس روز اداریہ بھی لکھایا جس میں بخشی غلام محمد پر رکیک حملے کئے گئے۔

ایک شام خواجہ غلام محمد صادق کا وشواس اور دوسرے روز دن کے ۱۱ بجے جب موتی لام مصری۔ نور محمد اور میں اخبار کشمیر کے دفتر میں بیٹھے کسی بات پر بحث کر رہے تھے کہ ہمارا ہی چپراسی ہمیں محکمۂ اطلاعات کا پریس نوٹ دے گیا۔ جس میں خواجہ غلام محمد صادق اور بخشی غلام محمد کی دوستی اور ڈی این سی کو توڑنے کا اعلان تھا۔ تینوں ساتھی بے ہوش تو نہیں ہوئے البتہ ذہن ماؤف ہو گیا۔ سنبھلے تو معلوم ہوا کہ شام کو صادق صاحب کی کوٹھی پر ڈیمو کریٹک کانفرنس کی مجلس عاملہ کی میٹنگ ہو گی۔ جموں کے ساتھی بھی آرہے ہیں۔ فیصلہ ہوا کہ اخبار میں یہ بیان نہیں دیا جائے گا بلکہ معمول کی طرح اخبار سرکار مخالف ہی ہو گا۔ اخبار کا کام شروع ہوا شام ۴ بجے ڈی این سی کے جنرل سکریٹری رام پیارے صراف دفتر آئے اور انہوں نے حکم دیا کہ اخبار شائع نہیں

www.taemeernews.com

ہوگا۔ کام بند۔ البتہ دفتر میں صادق اینڈ لمپنی کے خلاف گالیاں اور وہ بھی شدھ کشمیری میں، کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

موتی لال مصری میٹنگ میں شریک نہیں ہوئے۔ البتہ وہ کامریڈ ڈانگے کی چٹھی کا بار بار ذکر کرتے رہے کہ انہوں نے نیشنل کانفرنس میں واپس جانے کی ہدایت دی ہے چٹھی کسی نے نہیں دیکھی۔ صادق صاحب کے گھر پر میٹنگ ہوئی اور کرشن دیو سیٹھی اپنی برسوں کی ریاضت کو دفن ہوتا دیکھ رو پڑے اور غلام محمد صادق سے جو میٹنگ میں سر جھکائے کسی سے آنکھ ملانے کی جرائت نہیں کر رہے تھے مخاطب ہوئے "اگر آپ لوگوں کو مالی مشکلات کا سامنا تھا تو ہم سے کہتے ہم ماہانہ چندہ جمع کر کے آپ کے ساتھیوں کو پالتے لیکن وشواس گھات کیوں کیا۔ کوئی جواب نہیں۔ میٹنگ بغیر کسی فیصلے کے ختم ہو گئی۔

چھ ماہ کے بعد تھکا ہارا گھر چلا گیا۔ رات کو ۱۱ بجے کامریڈ نور محمد آئے اور بلا کر لے گئے۔ گاڑی کھڑی تھی بیٹھ گئے۔ گاڑی روانہ ہوئی تو سامنے بیٹھے درگا پرشاد در نے کہا کہ اخبار شائع ہو گا۔ اخبار کے جتنے صفحے تیار ہیں وہ کہاں ہیں۔ نور محمد کو در صاحب کے ساتھ دیکھ کر حیرانی تو ہوئی لیکن خاموش رہا۔ دفتر پہنچے تو موتی لال مصری براجمان تھے۔ فیصلہ ہوا کہ اخبار کے پہلے صفحے پر بخشی اور صادق کا بلا کسی تبصرے کے مشترکہ بیان شائع ہو گا۔ کام شروع ہوا۔ حکم کے غلام اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ زندگی میں پہلی بار مکھن لال فوطیدار کو دیکھا۔ رات کے اندھیرے میں دفتر آئے اور ٹھرے کی بوتل کھل گئی۔ بہت روئے فوطیدار صاحب ڈی این سی کی جوان مرگی پر۔ لیکن محسوس ہو رہا تھا کہ آنسو جو بہ رہے ہیں وہ آنسو ڈی این سی پر نہیں ہماری بے وقوفی پر۔ بہائے جا رہے ہیں۔ رات کے ۱۲ بجے اکیلا میں اور کاتب درگا پرشاد تشریف لائے۔ کیا اخبار شائع ہو گا؟ جی ہاں گھبرائیے نہیں شائع ہو گا۔ چلے گئے اور ان کا آنا اور جانا رات کے چار بجے تک جاری رہا۔ چار بجے رات کو پہنچے اترنا پڑا ملاقات کے لئے کیوں کہ گاڑی میں پیارے لال کارہلو جو بخشی عبدالرشید کے درباری تھے۔ غلام قادر ناٹا جسے ہم بہت پٹ چکے تھے اور ڈی پی در تینوں شراب کے نشے میں دھت۔ پھر سوال۔ اخبار شائع ہو گا؟ جی ہاں۔ کوئی دھوکا نہیں ہو گا۔ اخبار تو تیار ہوا لیکن پہلے صفحے پر صادق بخشی بیان کے نیچے پانچ لائنوں کی جگہ خالی رہی۔ شرارت سوجھی اور لکھ دیا" ایڈیٹوریل بورڈ کا اس بیان سے متفق ہونا ضروری نہیں"۔

دوسری صبح دفتر میں بیٹھے تھے کہ صادق صاحب کے وہ کارکن بڑی تعداد میں دفتر میں وارد ہوئے جو ہمارے ساتھ بہت پٹ چکے تھے۔ کوئی بات نہیں کی لیکن فضا میں تناؤ۔ نیچے سڑک پر نظر ڈالی تو موتی لام مصری کو ڈی این سی کے درگا پرشاد در حامی کارکنوں سے پٹتے دیکھا۔ معاملہ سمجھ میں آیا۔ دفتر کے اندر بیٹھے کل کے ساتھیوں نے دھکے دے کر دفتر سے باہر پھینک دیا۔ ایک دکاندار

www.taemeernews.com

کے ٹیلفون سے سید میر قاسم سے رابطہ قائم کیا اور اس نئی غنڈہ گردی پر احتجاج کیا بولے "تمہیں معلوم ہے اب ہم نیشنل کانفرنس میں ہیں۔ جہاں بخشی رشید بھی ہے اور پیس برگیڈ بھی۔ اپنی عزت پیاری ہے تو۔۔۔۔۔۔۔۔ ٹیل فون کنکشن ٹوٹ گیا۔

کیپٹل ہوٹل میں جموں اور کشمیر کے ان لوگوں کی پریس کانفرنس ہوئی جو اب بھی ڈی این سی کو زندہ رکھنے پر بضد تھے۔ اس میں پیارے لال ہنڈو بھی شامل تھے۔ وعدے ہوئے فیصلے ہوئے۔ لیکن اسی روز تین بجے ہنڈو صاحب نے اننت ناگ سے ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ "میں ڈی این سی میں نہیں رہ سکتا کامریڈ نور محمد بھی غائب۔ سیدھے درگا پرشاد در کی کوٹھی پر۔ یار لوگوں نے دیکھا کہ ان کے پاؤں دبا رہے تھے۔ صادق صاحب اور ان کے ساتھی نیشنل کانفرنس میں واپس تو چلے گئے لیکن نوجوانوں کی ایک پوری نسل کو دھوکا دے کر۔ ہم جو دیانتداری کے ساتھ ایک نامعلوم منزل کی طرف جانے کے خواہش مند تھے بیچ راستے میں ہی دم توڑ گئے اور کشمیری عوام ایک بار پھر یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ الحاق اقتدار کے ایوان تک ہی محدود ہے

ڈی این سی کے ٹوٹ جانے سے قبل مرزا محمد افضل بیگ کو اسمبلی اجلاس میں شریک ہونے کی اجازت دے دی گئی اور شاید یہ ۱۹۵۸ کا زمانہ تھا کہ انہوں نے محاذ رائے شماری نام کی جماعت بنائی۔ کشمیر میں پہلی بار ایک طرف ہندوستان حامی اپوزیشن جماعت اور دوسری طرف ہندوستان مخالف اپوزیشن جماعت، محاذ رائے شماری بنی۔ دونوں کی منزل مختلف تھی۔ محاذ رائے شماری کے وجود نے کشمیر میں علاحدگی پسندی کے رجحانات کے بیج بو دئے۔ کھلم کھلا ہندوستان کے ساتھ الحاق کو چیلنج کیا جانے لگا اور بیگ صاحب پھر جیل میں۔ حکومت ہند کے اشارے پر شیخ محمد عبداللہ کو ۵ برس بعد رہا کیا گیا۔ لوگ امنڈ پڑے۔ سیلاب تھا سڑکوں پر کشمیریوں کا۔ لوگ گھنٹوں سڑکوں پر کھڑے رہے۔ شیخ صاحب کے دیدار کے لئے ایسا استقبال نہ دیکھا تھا نہ کبھی دیکھا جائے گا۔ رہائی کے دوسرے روز حضرت بل میں شیخ صاحب کی تقریر ہوئی۔ لاکھوں کشمیری سننے کے لئے بے تاب۔ پریس گیلری میں نیشنل اور انٹرنیشنل پریس۔ شیخ صاحب تقریر کرنے لگے تو آنسوں بہ نکلے۔ جذبات نے زبان خاموش کر دی۔ لاکھوں لوگوں کی آنکھوں سے بھی آنسوں ٹپکنے لگے۔ میرے ساتھ بیٹھے اخبار اسٹیٹسمین کے نامہ نگار رادھا کشن کاک پر نظر پڑی تو وہ بھی رو رہے تھے۔ ایک ایک لفظ شیخ صاحب کی تقریر کا نوٹ کیا۔ واپس آکر صادق صاحب کو سنایا۔ لیکن دوسرے روز کے قومی اخبارات میں جو تقریر شائع ہوئی وہ بالکل اسکے برعکس تھی۔ معلوم ہوا کہ وید بھسین کے اخبار کے دفتر کشمیر پوسٹ پر ڈائرکٹر جنرل انفارمیشن جانکی ناتھ زتشی نے ہر اخباری نمایندہ کو شیخ صاحب کی بخشی میڈ تقریر تھمادی جو دوسرے روز

www.taemeernews.com

کے اخبارات میں شائع ہوئی اور شیخ صاحب کی تقریروں کو توڑ مڑوڑ کے بھیجنے کا یہ سلسلہ تب تک جاری رہا جب تک وہ باہر رہے۔ اسی دوران صورہ میں شیخ صاحب کے ساتھ ہاتھ ملانے کا پہلی بار موقع ملا۔ صادق صاحب کا ایک خط اور ڈی این سی کے وہ بیانات جو ان کی رہائی کے لئے جاری کئے گئے تھے انہیں تھما دئے۔ مختصر سی ملاقات ایک قد آور شخصیت ایسا لگا جیسے کہ ایک بت کھڑا ہو جذبات اور انسانی احساسات سے محروم۔

شیخ صاحب ایک طرف طوفانی دورہ کر رہے تھے اور دوسری طرف بخشی غلام محمد ۲۶ جنوری کی تقریب وسیع پیمانے پر منانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ۲۶ جنوری کو پھر ایک ایسا ڈرامہ کھیلا گیا کہ شیخ محمد عبداللہ کا بھی اپنے لوگون پر سے بھروسہ اٹھ گیا۔ لاکھوں کشمیری قومی جھنڈے لئے آزاد ہندوستان زندہ باد، جواہر لال نہرو زندہ باد اور خالد کشمیر، زندہ باد کے نعرے بلند کرتے لال چوک پر جمع ہوئے۔ وہی سروں کا امنڈتا سیلاب۔ وہی لوگ۔ وہی جوش و خروش جو شیخ محمد عبداللہ کی رہائی کے وقت تھا کشمیریوں کے کیریکٹر کا یہ دوسرا رخ آج تک سمجھ میں نہیں آیا۔ عوامی مینڈیٹ حاصل کرنے کے بعد حضرت بل میں ایک ایسا خونیں ڈرامہ کھیلا گیا کہ لکھتے لکھتے نفرت ابل رہی ہے۔ نیشنل کانفرنس نے اپنے ہی ایک کارکن کو قتل کیا اور قتل کے بعد نیشنل کانفرنس اور شیخ محمد عبداللہ کے کارکنوں میں زبردست جھگڑا شروع ہوا۔ قتل کا الزام ایک درویش صورت باریش بزرگ مولانا مسعودی پر لگایا گیا۔ اخبارات میں خبر شائع کرائی گئی کہ شیخ محمد عبداللہ نے نیشنل کانفرنس کی قیادت کو قتل کرنے اور کشمیر کو پاکستان کے حوالے کرنے کی زبردست سازش کی ہے۔ اس قتل کیس کا نام پڑا حضرت بل قتل کیس اور پاکستانی سازش کا کیس بنا کشمیر سازش کیس۔ دونوں مقدمے ایک مدت تک چلے۔ کروڑوں روپئے خرچ کرنے کے بعد واپس لئے گئے۔

ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کے ٹوٹ جانے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کا شیرازہ بکھر گیا۔ بڑے کمیونسٹ عبدالرحمان راحت، غلام محمد میر بسمجن، ریشی دیو، اونکار ناتھ ترسل، شیخ نور محمد اور دوسرے چھوٹے بڑے لیڈر اور کارکن۔ بخشی عبدالرشید کی شرن میں چلے گئے۔ البتہ جموں کے کامریڈوں نے ڈیموکریٹک کانفرنس نام کی ایک نئی تنظیم بنالی۔ کمیونسٹ پارٹی بھی کل ہند سطح پر تقسیم ہو گئی تھی۔ جموں کے کامریڈ براہ راست مارکسی کمیونسٹ پارٹی کے اثر میں تھے۔ ڈیموکریٹک کانفرنس میں رام پیارا صراف اور کرشن دیو سیٹھی دو ہی لیڈر تھے جو با اثر بھی تھے اور باوزن بھی۔ لیکن یہ تحریک بھی تقسیم ہوئی۔

www.taemeernews.com

-

www.taemeernews.com

اگر بخشی غلام محمد قطب مینار کی آخری منزل سے گر کر سڑک پر رینگنے کے لئے مجبور نہ ہو جاتے، اگر موئے شریف چوری نہ ہوا ہوتا اور مرحومہ اندرا گاندھی اور ان کے شوہر مرحوم فیروز گاندھی سرینگر میں زندگی کا آخری ہنی مون منانے نہ آتے اور ایک ماہ تک کشمیر میں قیام نہ کرتے تو شاید بخشی غلام محمد کی سیاسی موت نہ ہوتی مرحوم درگا پرشاد در نے بخشی غلام محمد کے خلاف ایسا کیس تیار کیا کہ اندرا جی کو یقین ہو گیا تھا کہ بخشی غلام محمد ریاست کے لئے خطرہ ہیں۔ ویسے مرحومہ اندرا گاندھی بھی بخشی غلام محمد سے ایک ذاتی ناراضگی کی وجہ سے انتقام لینا چاہتی تھیں۔ بخشی غلام محمد کے خلاف کیس تیار تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی باور کرایا گیا کہ وہ ان کے وفادار نہیں ہیں۔ وزیر بے قلمدان لال بہادر شاستری نے ایک باصلاحیت شطرنج کھلاڑی کی طرح بخشی غلام محمد کو مات تو دے دی لیکن وہ خواجہ غلام محمد صادق کے لئے سیاسی بنیاد قائم نہ کر سکے۔ نیشنل کانفرنس اسمبلی پارٹی نے خواجہ غلام محمد صادق کو "اتفاق رائے" سے لیڈر منتخب کر کے وزیر اعظم تو بنا دیا لیکن نیشنل کانفرنس بحیثیت سیاسی جماعت کے ہوا میں تحلیل ہو چکی تھی۔ موئے شریف تحریک نے بخشی غلام محمد اور بخشی عبدالرشید کی چودھراہٹ ختم کر دی تھی اور ان کے کارکن منہ چھپائے گھروں میں بند تھے۔ ان کے خلاف نفرت کا ابلتا لاوا بہہ رہا تھا کہ لوگ اسے سیاہ چہرے کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ہندوستان نواز اپوزیشن پارٹی ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس نے اقتدار کی دہلیز پر دم توڑ دیا تھا اور ہندوستان مخالف محاذ رائے شماری سیاسی خلا کو پر کر رہی تھی۔ غلام محمد صادق کے سامنے دو طرح کے سنگین بحران تھے۔ ایک یہ کہ ان کی اپنی سیاسی پوزیشن لاغر تھی۔ دوسرا یہ کہ محاذ رائے شماری کی پیش رفت کو روکنے کے لئے ان کے پاس ہتھیار نہیں تھے۔ ۷ ہزار کے قریب سیاسی کارکنوں کی انھیں حمایت حاصل تھی اور یہ سب کے سب کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ رہے تھے۔ بخشی غلام محمد کے خلاف لوگوں کی نفرت کا خواجہ غلام صادق نے سیاسی مقاصد کے لئے بھرپور استعمال کیا اور اس طرح سفید چہرے اور سیاہ چہرے کی اصطلاح وجود میں آئی۔

www.taemeernews.com

باب ۶ سیاسی خلا

نیشنل کانفرنس میں واپسی کے بعد خواجہ غلام صادق، سید میر قاسم، گردواری لال ڈوگرہ اور ان کے ہمنوا ہم پیالہ افراد کو جب بخشی عبدالرشید کی دہلیز پر گھٹنے ٹیک کر اور ناک رگڑ کر پھر سے اسمبلی کے لئے منڈیٹ دیا گیا تو پھر وہی زور زبردستی کا دور شروع ہوا۔ جس نے بھی کاغذات نامزدگی نیشنل کانفرنس کے امیدواروں کے خلاف داخل کئے بے عزت ہوا۔ صادق صاحب کے بارے میں یہ عام افواہ تھی کہ وہ زبردست جمہوریت نواز ہیں لیکن جب ایک ریٹائرڈ پولس افسر نے ان کے خلاف کاغذات نامزدگی داخل کئے تو اس بزرگ کے ساتھ بدفعلی کرنے کے علاوہ وہ سب کچھ کیا گیا جو بدفعلی کے تقاضے ہوتے ہیں۔ درگا پرشاد در کے حلقے میں رٹرننگ افسر شمیم احمد شمیم تھے، دونوں کا یارانہ تھا۔ دونوں خوب صورت اور جاذب نظر تھے۔ ایک دوسرے کی طرف کھینچے جارہے تھے۔ شمیم نے جعلی ووٹوں کا ایسا چکر چلایا کہ ڈی پی درخود بھی پریشان تھے کہ وہ راتوں رات اتنے مقبول کیسے ہو گئے۔

بخشی غلام محمد کی افادیت مرکز کے لئے ختم ہو رہی تھی اور مرکز کسی بھی طرح ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مرکزی سرکار پر شیخ محمد عبداللہ کو رہا کرنے کے لئے دباؤ بڑھ رہا تھا لیکن انہیں کشمیر سازش کیس میں پھنسا دیا گیا تھا۔ خود مرکزی سطح پر جواہر لال نہرو بھی اپنے چند ساتھیوں سے تنگ آچکے تھے۔ فارمولا سنا کامراج پلان کا اور بخشی غلام محمد نے بھی کانگریس کی ممبر شپ حاصل کر کے اپنا استعفا پنڈت جی کو پیش کیا۔ واہ وہی تو حاصل کی لیکن غلطی کا احساس بھی ہوا۔ تار ہل گیا اور وادی میں جلسے جلوس شروع ہوئے۔ استعفا واپس لو۔ اسمبلی ممبروں وفا کرو۔ کامراج پلان نہیں چلے گا۔ لال چوک میں ایک زبردست جلسہ ہوا جس میں قانون ساز کونسل کے چیرمین پنڈت شو نارائن فوطیدار نے تقریر کرتے ہوئے دھمکی دی کہ "اگر بخشی غلام محمد اقتدار سے ہٹ گئے تو الحاق کی گانٹھ کھل جائے گی" لیکن تیر ترکش سے نکل چکا تھا اور بخشی صاحب کا ستارہ ڈوب چکا تھا۔

خواجہ غلام محمد صادق پر امید تھے کہ انھیں نیشنل کانفرنس قانون ساز پارٹی کا لیڈر منتخب کیا جائے گا اور مرکز کی بھی یہی دیرینہ خواہش تھی۔ بخشی عبدالرشید بھی میدان میں کود پڑے۔

www.taemeernews.com

میر غلام محمد راجپوری بھی امیدوار بنے۔ لیکن بخشی غلام محمد آخر وقت تک خاموش رہے اور جب لیڈر کا انتخاب کیا گیا تو اننت ناگ کی منصف کورٹ کے ایک وکیل (خواجہ شمس الدین) جو بخشی صاحب کی مہربانی سے ممبر اسمبلی اور وزیر تعمیرات بن گئے تھے پارٹی لیڈر منتخب کئے گئے۔ مرکز کے ساتھ بخشی غلام محمد کے اس وشواس گھات نے پنڈت جواہر لال نہرو اور بخشی غلام محمد کے درمیان ایک اونچی دیوار کھڑی کر دی۔ اختلافات شروع ہوئے اور خواجہ شمس الدین کو ہٹانے کی کوششیں شروع ہوئیں حالاں کہ بے چارہ ہر محفل میں کہتا تھا" میں تو محض آئینی وزیر اعظم ہوں۔ اصلی وزیر اعظم، خالد کشمیر، ہیں۔ حکم ان ہی کا چلے گا۔ میرا کیا ہے میں میڈان بخشی ہوں"۔ خواجہ شمس الدین ایک چھوٹے آدمی تھے۔ برسوں اننت ناگ کی ایک درگاہ کے مجاور رہے تھے۔ ذہنیت بھی مجاور ہی کی تھی۔ وزیر اعظم بن کر بھی ان کا قد چھوٹا ہی رہا۔ زندگی کی ابتدا عرائض نویسی سے کی۔ علی گڑھ سے وکالت کی ڈگری لی اور پھر مرزا محمد افضل بیگ کی گرفتاری کے بعد اننت ناگ میں جو مقام سید میر قاسم کو حاصل ہونا چاہئے تھا وہ بخشی صاحب کی نظر کرم سے خواجہ شمس الدین کو حاصل ہوا۔ بخشی صاحب باصلاحیت اور ذہین تھے۔ اپنی کم تعلیمی کو وہ اپنی ذہانت سے چھپائے رکھتے تھے۔ شمس الدین پڑھے لکھے تھے لیکن دراصل ان پڑھ۔ جاہل ۱۶ ویں صدی کے آدمی۔ بات کرتے تو لگتا کوئی ان پڑھ گنوار کسان بول رہا ہے۔ وزیر اعظم بنتے ہی انہوں نے تمام سرکاری ملازموں اور افسروں کو دیانت داری کا حلف دلایا حالاں کہ گوگجی باغ میں ان کی عالیشان عمارت ان کی دیانت داری کا منہ چڑھا رہی تھی۔ یہ عمارت ایک ٹھیکے دار غنی صاحب نے بنائی تھی۔

صادق گروپ شکست کھا گیا تھا اور وہ مایوسی کی حالت میں آوارہ گردی کر رہا تھا کہ ایک صبح خبر پھیل گئی کہ حضرت بل کی درگاہ سے پیغمبر اسلام حضرت محمد کا موئے شریف چرا لیا گیا ہے۔ خبر پھیلتے ہی پورے کشمیر میں آگ لگ گئی۔ لاکھوں مسلمان سڑکوں پر نکل پڑے۔ سڑکوں پر رات دن شہر اور گاؤں کے لاکھوں لوگ پہرہ دیتے رہے۔ ایڈمنسٹریشن مفلوج ہو گیا۔

نیشنل کانفرنس پر فالج گر پڑا اور افواہ پھیل گئی کہ بخشی غلام محمد نے موئے شریف چرا لیا ہے۔ برسوں سے سلگتا نفرت کا لاوا بہہ پڑا۔ نیشنل کانفرنس کے کارکن پٹنے لگے۔ بخشی عبدالرشید جن کا نام سنتے ہی روتے بچے خاموش ہو جاتے تھے۔ وہ لال چوک میں اپنے روایتی جاہ و جلال کے ساتھ نمودار ہوئے کہ آگ سے بھری کانگڑیاں ان کی جیپ پر برسنی شروع ہو گئیں۔ بخشی رشید بھاگ گئے لیکن لوگوں کے غم و غصے کا نشانہ بنا بخشی عبدالمجید کا سنیما ہال، آگ لگا دی گئی۔ اسی سڑک پر بخشی خاندان کی کئی دوکانوں کو لوٹا گیا۔ بخشی غلام محمد اور نیشنل کانفرنس کو ڑھ بن گئے۔ جسے چھونے کو کوئی تیار نہیں تھا۔ کسی سیاسی پارٹی کے خلاف اتنی نفرت

www.taemeernews.com

آج تک نہیں دیکھی۔ کل تک جس نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کی چہل قدمی سے سڑکوں پر لوگ نکل آتے تھے آج وہی عوامی نفرت کے شکار بن گئے۔ حالاں کہ بخشی غلام محمد نے ریڈیو سے ایک نشریے میں لوگوں کو یقین دلایا کہ موئے شریف کو تلاش کر کے واپس حضرت بل میں رکھا جائے گا لیکن اس نفرت کی آگ میں بخشی کا نام سننا بھی کسی کو گوارہ نہ تھا۔ وزیر اعظم شمس الدین اپنی رہائش گاہ پر ملنے والوں کو رو رو کر یہ یقین دلاتے رہے کہ "میں نے موئے شریف نہیں چرایا ہے"۔

شیخ محمد عبداللہ جیل میں تھے لیکن ان کے ساتھی مولانا مسعودی باہر تھے۔ انہوں نے نہایت چالاکی کے ساتھ موئے شریف بازیابی کی تحریک کا رخ نیشنل کانفرنس اور بخشی خاندان کی طرف موڑ دیا۔ ایک ایکشن کمیٹی بنائی گئی۔ جس میں میر واعظ مولانا محمد فاروق کے علاوہ ایک مذہبی بزرگ میرک شاہ شامل تھے۔ لال بہادر شاستری مرکز میں وزیر تھے۔ انھیں اس نازک وقت پر کشمیر بھیجا گیا۔ آئی بی کے چیف بی این ملک بھی موئے شریف کی بازیابی کے لئے میدان میں کود پڑے۔ گولیاں بھی چلیں، لوگ ہلاک بھی ہوئے لیکن کسی بھی موقع پر اس تحریک نے فرقہ وارانہ رخ اختیار نہیں کیا۔

کشمیری پنڈت نے اپنے دفاع کے لئے اپنے آپ کو بازیابی کی تحریک سے وابستہ کیا اور ہر جلوس میں اللہ اکبر اور ہر ہر مہادیو کے نعرے ایک ساتھ بلند ہوتے رہے۔ اسی دوران اعلان کیا گیا کہ موئے شریف مل گیا ہے۔ لیکن مسئلہ کھڑا کیا گیا کہ یہ اصلی ہے کہ نقلی۔ اس کی پہچان کون کرے گا۔ کئی لوگوں نے تجویز پیش کی کہ جانچ کرنے کا طریقہ ایک ہی ہے کہ "آگ میں ڈالا جائے اگر اصلی ہوگا تو نہیں جلے گا"۔ ایک نازک اور مشکل مرحلہ تھا۔ لیکن لال بہادر شاستری اور میرک شاہ نے اس مسئلے کو حل کر لیا اور موئے شریف کو واپس حضرت بل میں رکھ دیا گیا۔

موئے شریف کس نے چرایا تھا اور کس نے اسے واپس اپنی جگہ پر رکھا۔ آج تک اس اہم واقعے سے کسی نے پردہ نہیں اٹھایا۔ نہ شیخ محمد عبداللہ نے، نہ ہی سید میر قاسم نے اپنی کتابوں میں اس کا ذکر کیا ہے۔ آئی بی کے اس وقت کے چیف بی این ملک نے بھی اپنی کتاب میں اس راز سے پردہ نہیں اٹھایا ہے۔ کبھی کہا گیا کہ پاکستان نے سازش کی۔ کبھی کہا گیا کہ بخشی غلام محمد نے اپنی بے عزتی کا انتقام لینے کے لئے موئے شریف چوری کرنے کی سازش کی۔ چوری کس نے کی اس سے غرض نہیں لیکن موئے شریف کی چوری کی آڑ میں بخشی غلام محمد اور ان کی کانفرنس کو سیاسی طور سے مفلوج کیا گیا۔ یہ موئے شریف تحریک کا ایک نتیجہ تھا۔ ایک اور اہم نتیجہ یہ نکلا کہ بخشی غلام محمد کی بیساکھیوں پر کھڑا جموں کشمیر کا وزیر اعظم خواجہ شمس الدین دھڑام سے گر گیا اور کوئی رویا تک نہیں۔ احتجاج بھی نہیں کیا۔ اگر یہ کام واقعی

www.taemeernews.com

پاکستان نے کرایا تھا تو اسے کوئی فائدہ نہیں ملا۔ اگر بخشی غلام محمد نے سازش کی تھی تو اس سازش سے وہ خود پٹ گئے۔ اس لئے یہ راز کب کھلے گا کہ موئے شریف کس نے چرایا (اگر واقعی چرایا گیا تھا) کہا نہیں جاسکتا۔ البتہ موئے شریف کی بازیابی کے بعد جو سیاسی تبدیلی آئی اس کے پس منظر میں موئے شریف کی چوری کا تجزیہ کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔

موئے شریف کی بازیابی کے بعد نیشنل کانفرنس کی بازیابی کی کوششیں شروع ہوئیں۔ مرکزی سرکار خواجہ شمس الدین کو ہٹا کر خواجہ غلام محمد صادق کو وزیر اعظم مقرر کرنا چاہتی تھی۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ خواجہ شمس الدین کمزور اور بے وزن سیاست داں تھے۔ مرکز کو اس کی کبھی فکر نہیں رہی کہ کون کمزور ہے اور کون بے وزن سیاست داں ہے، مرکز ہمیشہ اپنی پالیسیوں کو عملی شکل دینے کے لئے مہروں کی تلاش میں رہا ہے اور خواجہ غلام محمد صادق ایک اچھے مہرے ثابت ہوئے۔ خواجہ غلام محمد صادق پڑھے لکھے سیاست داں تھے۔ روشن خیال اور ترقی پسند بھی۔ جیل بھی نہیں گئے۔ البتہ نیشنل کانفرنس قیادت میں شامل رہے۔ مطالعہ گہرا تھا اور شاید وہ واحد کشمیری لیڈر تھے جنہیں پہاڑیوں کے دوسری طرف دیکھنے کا ازحد شوق تھا۔ ذہنی طور سے کانگرسی نہیں تھے اس لئے وہ کھادی لباس بہت کم پہنتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ "اس لباس سے کفن کی بو آتی ہے۔ ان پڑھ لوگوں سے اگر نفرت نہیں تو محبت بھی نہیں تھی۔ کمیونسٹ تھے لیکن نفاست پسند کمیونسٹ۔ شاعر نہیں تھے لیکن فیض احمد فیض سے لیکر اقبال تک ہر شاعر کی شاعری کو سمجھتے اور اس کی تشریح کرتے۔ چہرہ سپاٹ۔ گھنٹوں بات کرنے کے بعد بھی محسوس نہیں ہو پاتا تھا کہ ان کی رائے کیا ہے۔ خود اعتمادی نے بے خوف اور نڈر بنا دیا تھا۔ نچلی سطح کے کارکنوں سے ربط نہیں تھا کیوں کہ نفاست پسند تھے۔ دانش وروں کی محفلوں میں شریک ہونے کا بے حد شوق تھا۔ نیشنل کانفرنس کے صف اول کے قائد ہونے کے باوجود نیشنل کانفرنس میں ان کا حلقۂ اثر محدود تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کو نیشنل کانفرنس کی پارلیمانی پارٹی میں اکثریت تو دور کی بات ہے اقلیت کی بھی حمایت حاصل نہیں تھی، لیکن مرکزی سرکار بضد تھی خواجہ غلام محمد صادق کو وزیر اعلا بنانے پر چاہے طریقے جمہوری ہوں یا غیر جمہوری۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی سیاسی قیادت کمزور ہو رہی تھی اور ان کے ذہن پر شیخ محمد عبداللہ کی مسلسل گرفتاری اور کشمیر سازش کیس بری طرح حاوی تھا۔ وہ اس انتہائی ڈکٹیٹرانہ حرکت کی چبھن محسوس کر رہے تھے اور شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ ایک بار پھر دوستی کے خواہاں تھے۔ خواجہ غلام محمد صادق کی مخالفت نظریاتی بنیادوں پر نہیں کی جارہی تھی مخالفت اس وجہ سے ہو رہی تھی کہ بخشی غلام محمد کے ممبران اسمبلی اور کارکن خوفزدہ تھے کہ خواجہ غلام محمد صادق اقتدار میں آتے ہی انتقام لیں گے۔ ایک ایک گناہ کی ان سے جواب طلبی کرینگے۔ کئی کھیل کھیلے گئے۔ کبھی بخشی عبدالرشید

www.taemeernews.com

کا نام پیش کیا گیا، کبھی میر غلام محمد راجپوری کا لیکن وزیر بے قلم دان لال بہادر شاستری نے ایسا چکر چلایا کہ خواجہ غلام محمد صادق وزیر اعظم بنے اور ریاست کے سیاسی نقشے میں نئے رنگ بھرنے کا آغاز ہوا۔

www.taemeernews.com

شنکر پرشاد نے درست فرمایا تھا کہ بخشی غلام محمد کی گرفتاری سے بے ناک ہندوستان کی ناک کٹ نہیں جائے گی اور کشمیریوں نے یہ ثابت بھی کر دیا۔ ان کی گرفتاری پر کشمیر میں ایسا کوئی دھماکہ نہیں ہوا کہ اقتدار کے ایوان ہل جاتے۔ موئے شریف تحریک نے پہلے ہی بخشی غلام محمد کی پوزیشن کمزور کر دی تھی اور ان کے ساتھ حکومت کی نرم روپالیسی نے محاذ رائے شماری کو سیاسی تقویت حاصل کرنے کا موقع دیا تھا اس سے بھی بخشی غلام محمد کی گرفتاری پر کوئی احتجاج نہیں ہوا۔ غلام محمد صادق، سید میر قاسم اور درگا پرشاد در نے مرکزی سرکار کے مشورے سے جموں و کشمیر کو سیاسی طور پر آزاد نہ رکھنے کا فیصلہ کیا اور نیشنل کانفرنس کو کانگریس میں ضم کر دیا۔ اور ریاستی کانگریس کو مرکزی کانگریس کے ڈسپلن کے دائرے میں لایا گیا۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ ریاستی لیڈر شپ جموں کشمیر کی سیاسی علاحدگی اور پچھڑے پن کو ختم کرنا چاہتی تھی۔ وجہ صرف یہ تھی کہ وہ بخشی غلام محمد کی نیشنل کانفرنس کی اسمبلی پارٹی پر گرفت کو توڑنا چاہتی تھی۔ نیشنل کانفرنس کو کانگریس میں ضم کرنے میں نظریات کا کوئی دخل نہیں تھا۔ بخشی غلام محمد کی سیاسی موت کا سامان کیا گیا جو چند ماہ کے بعد ناکارہ ثابت ہوا۔ ریاست میں کانگریس کے سیاسی وجود سے شیخ محمد عبداللہ بھی خوفزدہ ہو گئے۔ انہوں نے عمر بھر تو ریاست کو باہر کے سیاسی اثرات سے محفوظ رکھ کر اپنے لئے ایک مخصوص جگہ بنائی تھی اور بقول ان کے وہ سیسہ پلائی اس دیوار کو توڑنے والوں کے ہاتھ توڑ دینے کے لئے خون کا آخری قطرہ بھی بہا دینے کے لئے تیار تھے حالاں کہ عمر بھر انہوں نے لوگوں کو ہی خون بہانے پر مجبور کیا اور آخری ایام تک وہ اپنے خون کو ہی محفوظ رکھتے رہے۔ شیخ محمد عبداللہ نے اپنی تعمیر کی گئی عمارت کو گرتے دیکھ کر کانگریس کے خلاف ترک موالات کا نعرہ بلند کیا اور وادی میں کانگریسیوں کے خلاف نفرت کا لاوہ ابل پڑا۔ قد آور شیخ عبداللہ کا قد اچانک چھوٹا ہو گیا اور ان کے ذہنی گنجے پن کا پہلی بار ہر ایک کو احساس ہوا لیکن غلام محمد صادق پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ان کے کارکن پٹتے رہے ان کے کارکن سماج سے الگ تھلگ ہو گئے۔ کسی کانگریسی کا کوئی مرا تو دفن کے لئے جگہ بھی نہیں۔ کانگریسیوں کا ایسا بائیکاٹ کیا گیا کہ محسوس ہوتا تھا کہ کانگریس مر جائے گی۔ لیکن کانگریسیوں نے اس کا بھرپور مقابلہ کیا اور شیخ محمد عبداللہ کو پہلی بار محسوس ہوا کہ ان کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

www.taemeernews.com

کالے سفید چہرے　　باب ۷

بخشی غلام محمد ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۴ء تک وزیر اعظم رہے اور خواجہ غلام محمد صادق، درگا پرشاد در، سید میر قاسم، گردواری لال ڈوگرہ اور ترلوچن دت سوائے ڈی این سی کے دور کے ان کے ہر جائز ناجائز کام میں شریک رہے۔ بخشی غلام محمد نے بے پناہ دولت اور جائداد بنائی۔ لوگوں کی وفاداریاں خریدنے کے لئے ذہنوں کو کرپٹ کیا۔ شہری آزادیاں سلب کرنے اور جائز حقوق پر شب خون مارنے کے لئے ڈکٹیٹرانہ طور طریقے استعمال کئے۔ اس کے لئے صرف وہ ذمہ دار نہیں تھے بلکہ صادق اینڈ کمپنی بھی برابر کی ذمہ دار تھی لیکن بخشی کے سیاسی افق سے طلوع ہونے اور اقتدار میں آجانے کے بعد غلام محمد صادق اور ان کے تمام ساتھی یہ تاثر دینے لگے کہ وہ شدھ دودھ میں دھلے ہیں اور بخشی غلام محمد کا چہرہ سیاہ ہے۔ بخشی خاندان اور نیشنل کانفرنس کے خلاف عوامی نفرت کا استعمال کرتے ہوئے نئے وزیر اعظم نے شعلہ بیان مقرر سید میر قاسم کو میدان میں اتار دیا اور انہوں نے سیاہ چہروں کو ہزاروں پردوں کے پیچھے چھپ جانے پر مجبور کرنے کے لئے جو تحریک چلائی وہ بہت حد تک کامیاب رہی، انہوں نے نیشنل کانفرنس کے کھنڈرات پر سفید چہروں کی عمارت کھڑی کر دی وہ بیک وقت دو محاذوں پر جنگ لڑ رہے تھے ایک محاذ پر وہ بخشی غلام محمد کی درپردہ سازشوں کا توڑ کر رہے تھے تو دوسری طرف محاذ رائے شماری کی ہندوستان مخالف زوردار مہم کا۔ بخشی غلام محمد سیاسی سطح پر فوت ہو چکے تھے ان کے خلاف لڑنا کوئی مشکل کام نہیں تھا قد اور سیاسی شخصیتوں شیخ محمد عبداللہ اور مرزا محمد افضل بیگ کے ساتھ ساتھ پاکستانی جذبے کے خلاف محاذ آرائی میں سنگین دقتوں کا سامنا تھا۔ غلام محمد صادق نے عوامی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے شہری آزادیوں کو بحال کرایا۔ حضرت بل قتل کیس اور کشمیر سازش کیس واپس لئے گئے۔ محاذ رائے شماری کو کھل کر کام کرنے کی اجازت دی گئی۔ محاذ کو اپنا اخبار نکالنے دیا گیا اس کے ایڈیٹر ناز انصاری مقرر ہوئے غلام نبی خیال بھی وابستہ رہے۔ غرض صحت مند ماحول میں ہر ایک کو سوچنے سمجھنے کا موقع دیا گیا۔ شیخ محمد عبداللہ ایک دور اندیش لیڈر تھے وہ لوگوں کو بے وقوف بنا کر ان کے جذبات کو مشتعل کرنے کا گر جانتے تھے۔ ان کے سامنے لوگوں کی حیثیت محض ایک نرودھ کی تھی، ایک دو بار استعمال کیا اور پھینک دیا۔ عمر بھر وہ یہی گر

www.taemeernews.com

آزماتے رہے۔ اسی لئے دانشوروں، پڑھے لکھے لوگوں، روشن خیال سیاسی لیڈروں اور کارکنوں کی محفل میں وہ بور ہو جایا کرتے تھے لیکن تھے بے تاج بادشاہ جس کو چیلنج کرنا بہت مشکل تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ نعرہ کیوں بلند ہوتا "جو کرے گا شیر کرے گا شیر کرے گا"۔ کدو بنائے یا بیگن بنائے شیر بنائے شیر بنائے"۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کشمیریوں نے اپنا ذہن اور اپنا ایمان شیخ محمد عبداللہ کے پاس گروی رکھا تھا۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ شیخ محمد عبداللہ محاذ رائے شماری کے بنیادی ممبر بھی نہیں ہیں لیکن محاذ رائے شماری کی ہر سانس پر شیخ محمد عبداللہ کی گرفت تھی وہ نہ ہوتے تو محاذ رائے شماری ۱۹۷۵ سے پہلے ہی دم توڑ گئی ہوتی۔ شیخ محمد عبداللہ ایک ماہر تاجر تھے جو جانتے تھے کہ کب کیا بک سکتا ہے اور کب کاروبار ٹھپ ہو سکتا ہے اس لئے وہ محاذ کے جلسوں میں ہندوستان مخالف رجحانات کو ابھارتے رہتے تھے۔ ان کی ہر تان ہندوستان کے خلاف لوٹتی تھی۔ شیخ محمد عبداللہ مسلمانوں کی نئی نسل میں ہندوستان کے خلاف نفرت کے بیج بو رہے تھے۔ ہندوستانی لیڈروں خاص کر کانگریسی لیڈروں کو مسلمانوں کا دشمن قرار دے کر کشمیریوں کو ان سے بد ظن کر رہے تھے۔ ان کے بارے میں سیاسی ماہرین تو دور کی بات ہے جیوتشی بھی یہ پیشگوئی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ ان کے غم و غصہ کا نشانہ کون بنے گا۔ مولوی محمد سعید جو ان کے قریبی ساتھی تھے ان کے لئے قربان ہوئے تھے ان کے بارے میں بھی وہ یہ کہتے رہتے تھے کہ "ان کی داڑھی کے ایک ایک بال میں ایک ایک شیطان بسا ہوا ہے" جسے پر کاش نارائن جنہوں نے ان کی رہائی کے لئے ہندوستانی رائے عامہ کو منظم کیا، انہیں بھی وہ معاف نہیں کر سکے اور ایک عوامی جلسہ میں ان کی موجودگی میں ان کے خلاف زہر اگل دیا۔ خواجہ غلام محمد صادق اکثر کہا کرتے تھے "شیخ محمد عبداللہ اپنے نائی سے مشورہ کریں گے لیکن اپنے ساتھیوں پر بھروسہ نہیں کریں گے۔"

سفید چہرے والی نیشنل کانفرنس کے جنرل سکریٹری سید میر قاسم ایک طرف شیخ محمد عبداللہ کی ہندوستان مخالف تحریک اور دوسری طرف سفید چہروں کو عوام میں مقبول بنانے کی زبردست جدوجہد کر رہے تھے۔ اس زمانے میں سید میر قاسم کی ہندوستان نواز اور ہند کشمیر الحاق کی افادیت سے متعلق تقریریں تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ ٹھوس دلائل پر مبنی دو قومی نظریہ کی شدید مخالفت اور رائے شماری کے نعرے کو ناقابل عمل قرار دینے کے لئے سید میر قاسم کی تحریک کو عوامی حمایت حاصل نہ بھی ہوئی لیکن کسی مخالف رد عمل کا اظہار بھی عوامی مجلسوں میں نہیں کیا گیا۔ شیخ محمد عبداللہ وادی کشمیر اور جموں کے مسلم اکثریتی دائے ایک ضلع ڈوڈہ میں ہی اپنا حلقۂ اثر قائم کر سکے۔ دوسرے مسلم اکثریتی اضلاع راجوری اور پونچھ ان کی گرفت میں نہیں آئے اور وہاں محاذ رائے شماری کا دفتر بھی نہیں کھل سکا

www.taemeernews.com

خواجہ غلام محمد صادق کی وزارت میں در گاپرشاد در، گرداری لال ڈوگرہ اور پنڈت ترلوچن دت جیسے قابل اور معتبر سیاست داں تھے۔ ان کی امیج خوبصورت تھی۔ در گاپرشاد در وزیر داخلہ تھے اور ان کی پر کشش اور جاذب نظر شخصیت، میٹھی زبان۔ چانکیہ جیسی چالاکی اور عیاری نے خواجہ غلام محمد صادق کی غیر مستحکم پوزیشن کو کسی حد تک مستحکم بنا دیا۔ یہ اسی زمانے کی بات ہے کہ وادی کے بااثر اور معتبر مولویوں، میر واعظوں، مسجدوں کے اماموں اور دوسرے مذہبی رہنماؤں کا ماہانہ بھتہ خزانہ غیب سے مقرر کیا گیا۔ در گاپرشاد در در پردہ ان کے سرپرست اور سید میر قاسم ان کے لئے حاتم طائی۔ صادق صاحب صاف ستھری سیاسی زندگی کے عاشق تھے لیکن اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے وہ بھی سمجھوتے کرنے اور اپنے ضمیر سے ناانصافی کرنے پر مجبور تھے۔ صادق صاحب در صاحب اور قاسم صاحب نے سیاسی کارکنوں، لیڈروں اور صحافیوں کی ایک طویل فہرست مرتب کی اور ان میں کٹر محاذی، کٹر پاکستانی، کٹر جماعت اسلامی کے لوگ بھی شامل تھے جن کو ماہانہ خزانہ غیب سے وظیفہ ملتا تھا اور وظیفے کا تقسیم کرنے کا کاروبار ۱۹۷۷ء تک جاری رہا۔ لاکھوں روپئے ہر ماہ تقسیم ہوتے تھے۔ ناموں کی فہرست کافی طویل ہے اکثر نام میرے ذہن میں محفوظ ہیں لیکن ناموں کا انکشاف صرف اس وجہ سے نہیں کر رہا ہوں کہ آج کے مجاہدین آزادی اور دہشت گردوں کے سرپرستوں سے لے کر صحافیوں کے بڑے ستونوں تک ہر کوئی بے نقاب ہو جائے گا اور شاید ناموں کے انکشاف سے بلا کتوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اس لئے یہ گناہ میں اپنے سر لینا نہیں چاہتا ہوں۔ لیکن سفید چہروں کی وفاداریاں خریدنے کی اس تحریک نے موقع پرستی کے ایسے بیج بو دیئے کہ پوری قوم کو بھاری قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ کشمیر کے اخبارات اور صحافی جو کل تک بخشی غلام محمد، بخشی عبدالرشید اور غلام قادر گاندربلی کے زرخرید غلام تھے، وہ راتوں رات صادق نواز بن گئے۔ وظیفوں سے ان کے چہرے دھل گئے کل کے کمیونسٹ دشمن صحافی وید بھسین اچانک جمہور نواز بن گئے۔ شمیم احمد شمیم نے بھی رخ بدل دیا۔

ایک طرف خواجہ غلام محمد صادق جمہوریت نوازی کا ہارمونیم بجا رہے تھے نرم رو پالیسی کی بنیاد پر کھلے سماج کی تبلیغ کر رہے تھے تو دوسری طرف بخشی غلام محمد سے انتقام لینے کے لئے ہر جائز و ناجائز کارروائی کر رہے تھے۔ نظریاتی اختلاف ہوتا تو بات سمجھ میں آسکتی تھی کہ غلام محمد صادق سیاسی جنگ لڑ رہے ہیں لیکن بات تھی ذاتی ناراضگی کی۔ غلام محمد صادق ڈرائنگ روم لیڈر۔ کتابی کیڑے تھے۔ اچھا پہنتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کے ملاقاتی بھی قابل دید ہوں۔ دانشوروں کی محفلوں میں انھیں ذہنی سکون ملتا تھا۔ ڈاکٹر نصیر اور ان کی ہمشیرہ مس محمودہ بھی دانشوروں کی صف میں کھڑے تھے اور دونوں کمیونسٹ تحریک سے وابستہ رہے تھے، دونوں صادق صاحب کے

www.taemeernews.com

.بہت نزدیک تھے ۔ مس محمودہ گرلز کالج کی پرنسپل تھیں اور انہوں نے اس کالج کو ایک مثالی کالج بنادیا تھا۔ .بخشی غلام محمد جانتے تھے کہ غلام محمد صادق اور مس محمودہ ذہنی طور پر ایک دوسرے کے نزدیک ہیں اور یہ ذہنی لگاؤ اور نظریات کی یگانگت صادق صاحب کی کمزوری تھی۔

ڈی این سی کے دور میں وزیر اعظم .بخشی غلام محمد نے مس محمودہ کو جموں تبدیل کرکے صادق صاحب کی انا کو مجروح کرنے کی کوشش کی تھی اور صادق صاحب اس زیادتی کو .بھول نہیں سکے تھے ۔ اقتدار میں آتے ہی بخشی غلام محمد کے .بھائیوں کی ناجائز طور طریقوں سے حاصل کی گئی جائیدادوں پر انہوں نے ہاتھ ڈالنا شروع کیا اور عدالتوں میں مقدمے .بھی دائر ہوئے ۔ .بخشی غلام محمد خوفزدہ تھے کہ اگر غلام محمد صادق پر دباؤ جاری نہ رہا تو وہ ان سے دولت کا حساب ضرور لیں گے ۔ ممبران اسمبلی کی اکثریت ان کی وفادار تھی اور ان کو استعمال کرکے .بخشی غلام محمد نے صادق سرکار کے خلاف عدم استحکام کی تحریک پیش کرنے کا ڈرامہ کھیلنے کی کوشش کی' اس ایک تیر سے وہ دو شکار کرنا چاہتے تھے ۔ ایک تو غلام محمد صادق پر دباؤ اور دوسرا مرکزی سرکار پر یہ واضح کرنے کے لئے کہ وہ بدستور سیاست کشمیر کے بے تاج بادشاہ ہیں لیکن مرکز انہیں کوئی اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ اس دوران بخشی غلام محمد اور ہندوستان کے وزیر اعظم اور وزیر داخلہ کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی وہ اگر ضائع نہیں کی گئی ہے تو کشمیر کی الجھی سیاست پر سے پردہ کسی حد تک ہٹ سکتا ہے ۔ نیشنل کانفرنس کی اسمبلی پارٹی میں عبدالغنی گونی، محمد ایوب خان، سردار کلبیر سنگھ، محمد اقبال، عبدالعزیز شال، غلام نبی سوگوامی، عبدالقیوم، چونی لال شرما، غازی عبدالرحمان ۔ ستہ کچی اور درجنوں دوسرے ممبران .بخشی غلام محمد کے ذاتی وفادار تھے ۔ عدم اعتماد کی تحریک پر اکثریت کے دستخط تھے ۔ اس .بحران پر قابو پانے کے لئے کشمیر معاملات کے سکریٹری شنکر پرشاد کشمیر آئے اور .بخشی غلام محمد پر خودکشی کا یہ راستہ ترک کرنے کے لئے دباؤ ڈالتے رہے ان سے وعدہ بھی کیا گیا کہ ان کی پولیٹیکل ایڈجسٹمنٹ کا خاص خیال رکھا جائے گا لیکن وہ ہوائی گھوڑے پر سوار تھے حالاں کہ وہ صرف بلیک میل کرنا چاہتے تھے ۔ صادق کو ہٹانے کا سوال ان کے سامنے نہیں تھا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ یہ ناممکن ہے۔ نیشنل کانفرنس کے چند لیڈروں نے شنکر پرشاد سے ملاقات کی اور ان سے شکایت کی گئی کہ .بخشی غلام محمد کو گرفتار کرنے کی کوشش نہ کی جائے ورنہ ہندوستان کی ناک کٹ جائے گی اور شنکر پرشاد بولے "ناک ہو تو کٹ جائے گی ناک اسی روز کٹ گئی تھی جب شیخ محمد عبداللہ کو گرفتار کیا گیا تھا۔" اور ہوا .بھی یہی ۔ بے ناک بڑھے لوگوں نے رات کے اندھیرے میں .بخشی غلام محمد کو گرفتار کرکے اودھم پور جیل میں .بند کرادیا اور عدم اعتماد کی تحریک معلوم نہیں

www.taemeernews.com

کہاں گم ہوگئی۔ کئی ممبران نے تو ڈی پی در کے پاس کان پکڑ لئے کہ اب کوئی زبردستی ان سے دستخط نہیں کرا سکے گا اور در صاحب نے اس کان پکڑ کا بھرپور معاوضہ بھی دیا۔ بخشی صاحب کی گرفتاری سے سیاست کشمیر کا ایک اور باب شروع ہو گیا۔

www.taemeernews.com

میں نے برف میں آگ کی پہلی قسط میں ہی واضح کیا ہے کہ جو کچھ بھی لکھ رہا ہوں ذہن میں قید یادوں کو رہا کر کے لکھ رہا ہوں۔ برف میں آگ کشمیر کی تاریخ نہیں ہے کیوں کہ تاریخ جب بھی لکھی گئی حالات و واقعات کو مسخ کر کے لکھی گئی ہے، چاہے شیخ محمد عبداللہ کی آتش چنار ہو یا سید میر قاسم کی سوانح حیات۔ برف میں آگ یادوں کی بارات ہے اور اس بارات کا ہر باراتی زندہ انسان ہے۔ یہ ایک ایسے عینی گواہ کا بیان حلفی ہے جو یخ بستہ فضا کو توڑ کر راستہ بھی بناتا رہا اور آگ کے شعلوں کو ٹھنڈا کرنے کے لئے برف کے گولے بھی استعمال کرتا رہا۔ لوگوں کو اعتراض ہوتا ہے کہ اب تک کی قسطوں میں ہر سیاست داں کو بے نقاب کر کے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ کشمیر کا ہر سیاست داں بے ایمان اور موقع پرست ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجھک نہیں کہ اب تک کی قسطوں میں ہر ایک چہرے سے شرافت انسانیت، خلوص اور انسانی دوستی کی دھول کو دھو کر میں نے قارئین کے سامنے اصلی چہرے پیش کئے۔ میں خود بھی دودھ میں دھلا نہیں ہوں، ہوتا تو برف میں آگ کیوں لکھتا۔ اپنے ضمیر کا محافظ ہوتا تو اپنے ضمیر کو سلا کر طویل مدت تک کم ظرف اور کم وزن سیاست دانوں کے ساتھ کیوں کام کرتا۔ ضمیر کو بے شک سلا دیا لیکن ضمیر کو مار کر نہ کبھی کسی کے در پر ناک رگڑنے کی ورزش کی اور نہ ہی چرب زبانی سے کسی کی سرپرستی حاصل کی۔ ہاں ایک سنگین جرم ضرور کیا ہے کہ بدصورت کھردرے پتھروں سے خوب صورت بت تراشے، بے جان بتوں میں جان ڈال دی۔ گنجے ذہنوں کو زرخیز بنانے میں خود گنجا بن گیا۔ جو سچ نہیں تھا اسے سچ ثابت کر دیا۔ جو جھوٹ تھا اسے جھوٹ رہنے نہیں دیا۔ میں بھی مجبور تھا چند سوسکوں کا سوال تھا پیٹ کی آگ بجھانے کی لئے۔ لیکن اب میں اور شدھ سچ بول رہا ہوں اور اس میں نہ تو اپنی نامحرومیوں کی پرچھائیاں ہیں اور نہ ہی کچھ بننے کی خواہش میں سب کچھ کھو دینے کا غصہ۔ بس ایک ہی خواہش ہے مر ڈھل جانے سے قبل ذہن میں قید تمام یادوں کو رہا کر دوں۔

www.taemeernews.com

سیاسی زندگی کا محاسبہ باب ۸

وادی کی سیاسی زندگی کا محاسبہ مولوی محمد فاروق کا ذکر کئے بغیر ممکن نہیں۔ انکو بخشی غلام محمد نے اس وقت تراشا جب وہ کمسن تھے۔ سیاست تو دور کی بات ہے مذہبی معاملات سے بھی وہ لاعلم تھے لیکن بخشی غلام محمد نے شیخ محمد عبداللہ کے قد کو پست کرنے کے لئے اس مولوی خاندان کے ایک ناپختہ لڑکے کو میدان میں اتارا جس کے ساتھ ۱۹۲۸ء سے شیخ محمد عبداللہ کا جھگڑا چل رہا تھا۔ مولوی محمد فاروق کے چچا مولوی یوسف شاہ نے مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدلنے کی شدید مخالفت کی تھی۔ وہ ۱۹۴۷ تک مسلم کانفرنس کو ہی زندہ رکھنے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ شیخ محمد عبداللہ کا الزام تھا کہ مولوی محمد یوسف شاہ مہاراجہ ہری سنگھ کے وظیفہ خوار ہیں اور مولوی یوسف شاہ کا الزام تھا کہ شیخ محمد عبداللہ ہندو ہندوستان کے ایجنٹ ہیں۔ کشمیری مولوی یوسف شاہ کے حامیوں کو بکرا اور شیخ محمد عبداللہ کے حامیوں کو شیر کے نام سے پہچاننے لگے۔ شیر بکرا لڑائی سیاسی زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئی ۱۹۴۷ میں مولوی محمد یوسف شاہ پاکستان بھاگ گئے اور مقبوضہ کشمیر کے صدر مقرر ہوئے۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ وطن واپس آنا چاہتے تھے لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا۔ بخشی غلام محمد اس شیر بکرا لڑائی میں شیروں کے سپہ سالار تھے اور وہ جانتے تھے کہ بکرا قوم شیخ عبداللہ سے کتنی شدید نفرت کرتی ہے۔ ۱۹۵۳ کے بعد بخشی غلام محمد نے اسی خاندان کے ایک لڑکے مولوی محمد فاروق کو میر واعظ مقرر کر دیا اور اس طرح ایک کمسن لڑکے کو شیخ محمد عبداللہ کے مقابلے پر کھڑا کیا گیا۔

خواجہ غلام محمد صادق کو مولوی پالٹیکس سے سخت نفرت تھی لیکن اقتدار کی ہوس نے انہیں یہ پولٹیکس کھیلنے پر مجبور کر دیا لیکن اس طرح کی پالٹیکس کھیلنے کے لئے وہ کبھی سامنے نہیں آتے تھے۔ اس کے لئے میر قاسم ۱۹ . درگا پرشاد در کو ہی استعمال کیا کرتے تھے۔ موئے شریف تحریک نے مولوی محمد فاروق میں خود اعتمادی پیدا کی تھی اور وہ پاکستان نواز عناصر کی علامت بن رہے تھے لیکن تھے بہت ہوشیار اور چالاک۔ ہندوستاں مخالف کیمپ میں ہونے کے باوجود ان کا دہلی کے ایوانوں سے بھی رابطہ تھا اور ریاستی لیڈرشپ سے بھی یارانہ۔ وہ جانتے تھے کہ ٹوسٹ کے دونوں طرف مکھن لگانے سے ہی صحت بحال رہتی ہے۔ کب اور کس

www.taemeernews.com

وقت میدان میں اترنا چاہئے اس کے وہ ماہر کھلاڑی تھے۔ کس سے کس موقع پر سودا کیا جانا چاہئے اس کے وہ ایک کامیاب تاجر تھے اور حکمرانوں کو بھی جب کبھی شیخ محمد عبداللہ کے پروں کو کاٹنے کی ضرورت پڑتی مولوی محمد فاروق کو میدان میں اتارا جاتا۔ سودا گری اور سیاست گری کے باوجود مولوی محمد فاروق ایک شریف انسان تھے۔ یاروں کے یار تھے۔ لہجہ نرم۔ کم گفتار۔ ذاتی کردار بلند۔ پریس کے ساتھ دوستانہ تعلقات۔ سیکولرزم کا ہارمونیم بجانے کے ماہر نہیں تھے لیکن کشمیر کے روایتی بھائی چارے کی علامت تھے۔ کٹر مذہبی رہنما تھے لیکن مذہبی اقلیت کا احترام بھی کرتے تھے۔ پاکستان نوازی میں شیخ محمد عبداللہ سے ایک قدم آگے نکل جانا ان کی مجبوری اور کمزوری تھی۔ اور حکمراں ان کی مجبوری اور کمزوری کو جانتے تھے۔

خواجہ غلام محمد صادق نے بخشی غلام محمد کو گرفتار کر کے اپنے سیاسی اقتدار کا تحفظ تو کر لیا تھا لیکن وہ بخشی غلام محمد سے خائف تھے۔ ان کی تنظیمی صلاحیتوں سے خوفزدہ تھے۔ ان کے کارکنوں کی ان کے تئیں وفاداری سے بے چین تھے۔ وہ کسی نہ کسی طرح سے نیشنل کانفرنس کی سیاسی حیثیت ختم کر کے اسے کانگریس کے ڈسپلن کے دائرے میں لانے کی کوشش کر رہے تھے حالاں کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ماضی میں کانگریس کے دائرہ عمل کو ریاست جموں کشمیر تک وسعت دینے کی شدید مخالفت کی تھی۔ مرکز سے صلاح مشورے کے بعد سفید چہروں والی نیشنل کانفرنس کو کانگریس میں ضم کر دیا گیا اور سید میر قاسم اس کے صدر مقرر کئے گئے۔ نیشنل کانفرنس کو کانگریس میں ضم کر کے خواجہ غلام محمد صادق نے ریاست کے سیاسی بکھڑے پن کو ختم کرنے کی کوشش تو کی لیکن اس سے شیخ محمد عبداللہ کو اپنی ہندوستان مخالف تحریک میں شدت پیدا کرنے کا ایک سنہرا موقع ملا۔ ریاست، خاص کر وادی میں کانگریس کے وجود کو وہ اپنے لئے ایک چیلینج سمجھنے لگے اور اس کا سیاسی توڑ کرنے کے بجائے انہوں نے مذہب کا استعمال کیا اور کانگریس کے خلاف ترک موالات کی کال دی۔ شیخ محمد عبداللہ نے ترک موالات کا ہتھیار کانگریس کو ختم کرنے کے لئے استعمال تو کیا لیکن اس سے پھوٹ پڑی شدید نفرت۔ ترک موالات نے ان کشمیری مسلمانوں کی زندگی اجاڑ دی جو کانگریس کے ساتھ وابستہ تھے، نکاح ٹوٹ گئے۔ دکانداروں نے کانگریسیوں کو مال فروخت کرنا بند کر دیا۔ نائی نے کانگریسیوں کا شیو بنانے سے انکار کر دیا۔ کانگریسی کی میت کو کندھا دینے والے بھاگ گئے۔ دفن کرنے کے لئے دو گز زمین دینے سے انکار کر دیا گیا۔ جہاں بھی کانگریسی ملا اس پر نفرت سے تھوکا گیا اور شیخ محمد عبداللہ اپنی تقریروں میں کانگریسیوں کو نالی کے کیڑے قرار دے کر ان کیڑوں کو پاؤں تلے روند ڈالنے کی ہدایت دیتے رہے۔ لیکن میر قاسم کی قیادت میں کانگریسی اس نفرت آمیز سیاست کے خلاف بہادری سے لڑتے رہے اور شیخ محمد عبداللہ کو شاید پہلی بار احساس ہوا کہ وہ ناقابل تسخیر

www.taemeernews.com

نہیں ہیں، ان کے خلاف لڑنا ممکن ہے اور انہیں ہرانا بھی آسان ہے۔ ترک موالات تحریک آندھی کی طرح آئی، تباہی برپا کی لیکن اس کا اثر زیادہ دیر تک نہیں رہا۔ اس سے شیخ محمد عبداللہ مایوس ہو گئے اور انہوں نے سیاست ترک کر کے حضرت بل کو جدید طرز پر تعمیر کرنے، اوقاف کی جائدادوں کو سنبھالنے اور سماجی برائیوں کو ختم کرنے کا کام سنبھال لیا۔ یا تو وہ تھک گئے تھے یا پھر خواجہ غلام محمد صادق کی نرم رو پالیسی کی وجہ سے وہ کوئی انتہا پسند قدم نہیں اٹھا پا رہے تھے۔ اگر صادق صاحب ۱۹۷۱ میں فوت نہ ہوئے ہوتے اور نرم رو پالیسی بدستور جاری رہتی تو شاید شیخ محمد عبداللہ ۱۹۷۵ میں دوبارہ سیاسی اقتدار میں نہ آتے۔ وہ تاریخ کے اوراق میں گم ہو جاتے۔

محاذ رائے شماری میں بھی سیاسی اختلافات بڑھ رہے تھے۔ چند بااثر لیڈروں کا خیال تھا کہ محاذ کو اسمبلی اور پارلیمنٹ کے چناؤ میں حصہ لینا چاہئے کیوں کہ رائے شماری کا نعرہ ناقابل عمل دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن شیخ محمد عبداللہ اس سے متفق نہیں تھے۔ ذہنی طور پر وہ اس حقیقت کو تسلیم کر چکے تھے کہ رائے شماری کی لڑائی ایک بے معنی لڑائی ہے۔ ہندوستان سے الحاق ٹوٹ نہیں سکتا لیکن وہ ہاری ہوئی لڑائی جاری رکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس لڑائی کو بند کرنے کا معاوضہ چاہتے تھے اور اس میں وہ کسی اور کو شریک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ محاذ کے جو لیڈر چناؤ کے حق میں تھے وہ درپردہ ان وظیفہ خواروں کی فہرست میں شامل تھے جو صادق صاحب کی سرکار کو مضبوط بنانے کے لئے بنائی گئی تھی۔

محاذ رائے شماری نے چناؤ کا بائیکاٹ کر کے کانگریس کے لئے راستہ تو ہموار کیا تھا لیکن بخشی غلام محمد نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جموں اور کشمیر میں کانگریس کے مقابلے پر اپنے امیدوار کھڑے کر دئے۔ بخشی غلام محمد ایک باصلاحیت منتظم تھے اور کانگریس کے اندر بھی انہیں کئی لوگوں کی ہمدردیاں حاصل تھیں۔ انتظامیہ میں نیچے سے اوپر کی سطح تک انہیں سرکاری ملازموں کا تعاون حاصل تھا۔ حکمراں جماعت میں زبردست گھبراہٹ تھی۔ غلام محمد صادق نے درگا پرشاد در کو صوبہ جموں کا چناؤ انچارج بنا دیا اور صوبہ کشمیر میں سید میر قاسم کو چناؤ مہم کی کمان سپرد کر دی۔ چناؤ میں پہلی بار آئین ہند کے تئیں وفاداری کا حلف لینے کی شرط شامل کی گئی۔ اور یہ شرط بخشی غلام محمد کے امیدواروں کی بدبختی ثابت ہوئی۔ ضلع اننت ناگ میں نیشنل کانفرنس امیدواروں پر وار کرنے کے لئے ایسا حربہ استعمال کیا گیا کہ وہ چناؤ عذرداریاں بھی داخل نہ کر سکے۔ رات کے اندھیرے میں کانفرنس کے امیدواروں کے کاغذات نامزدگیوں سے حلف نامے چرا لئے گئے اور کاغذات نامزدگی کی جانچ کے روز جب رٹرننگ افسروں نے نیشنل کانفرنس امیدواروں سے پوچھا کہ حلف نامے کہاں ہیں تو وہ بوکھلا گئے۔ حلف نامے انہوں نے داخل کئے تھے لیکن فائلوں سے غائب تھے۔ کاغذات رد کر دیے گئے اور اس طرح کانگریس کے تمام

www.taemeernews.com

امیدوار بلامقابلہ قرار دے دئے گئے۔ ان میں سید میر قاسم، خواجہ شمس الدین، مکھن لال فوطیدار۔سید حسام الدین۔ مفتی محمد سعید اور دوسرے درجنوں امیدوار شامل تھے۔ بعد میں یار لوگوں نے ان بلا مقابلہ کامیاب امیدواروں کا نام میڈ ان خالق رکھ دیا۔ خالق صاحب ضلع اننت ناگ کے رٹرننگ افسر تھے۔ البتہ بخشی غلام محمد لوک سبھا اور اسمبلی دونوں حلقوں سے کامیاب ہو گئے۔ صادق صاحب کے وفادار غیر کانگریسی نوجوان شمیم احمد شمیم نے کانگریس کے امیدوار منوہر ناتھ کول کو شکست دے دی اور منوہر ناتھ کول کو شکایت تھی کہ سرکاری مشینری اور سید میر قاسم کے بڑے بھائی سید حسین نے انہیں ناکام بنایا۔ اس کے برعکس درگا پرشاد در نے جموں میں کوئی ہیرا پھیرا نہیں کی بلکہ بہتر حکمت عملی سے کانگریسی امیدواروں کو کامیاب کرایا وہ کشمیر میں امیدواروں کو بلامقابلہ کامیاب کرانے پر سخت ناراض تھے۔ اور غلام محمد صادق کے ساتھ ان کے تعلقات اس کے بعد ہی کشیدہ ہونے لگے۔

مرحوم غلام محمد صادق نے دیانت داری سے کوشش کی کہ سیاست میں نئے نوجوانوں کو موقع دیا جائے تا کہ وادی کی سیاسی زندگی پر چڑھے قدامت پسندی، فرقہ پرستی اور رجعت پسندی کے بد گوشت کی جراحی ممکن ہو سکے۔ وہ شاید ایسے واحد سیاسی لیڈر تھے جو شیخ محمد عبداللہ سے خائف نہیں تھے۔ وہ ان کی اچھل کود کو یکسر نظر انداز کرتے تھے اور اگر کبھی وہ امن و قانون کو توڑنے کی کوشش بھی کرتے تو صادق صاحب درگزر کر جاتے۔ وہ انہیں اہمیت نہیں دے رہے تھے کیوں کہ ان کے ذہن میں شیخ محمد عبداللہ کا سیاسی قد گھٹانے کا خاکہ تھا اور وہ اپنی پالیسیوں سے شیخ محمد عبداللہ کا قد گھٹا رہے تھے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ اس کے لئے سیاسی حکمت عملی اور فرسودہ سوچ کو بدلنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے پڑھے لکھے نوجوانوں کو آگے آنے کا موقع دیا۔ شمیم احمد شمیم جو علی گڑھ سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کر کے آئے تھے صادق صاحب کے خاص مشیر بن گئے حالاں کہ کانگریسی نہیں تھے کیوں کہ شیخ محمد عبداللہ کی طرح انہیں بھی کانگریسی نالی کے کیڑے نظر آتے تھے۔ انہوں نے ایک ہفتہ وار اخبار آئینہ شروع کیا۔ وادی کی صحافتی زندگی میں، آئینہ ایک نیا صحت مند تجربہ تھا۔ نئے انداز اور جذبات کا ترجمان، آئینہ، کافی مقبول ہوا اور شمیم احمد شمیم کی ادا پر صادق صاحب فریفتہ ہو گئے اور انہوں نے شمیم احمد شمیم کو شوپیاں سے اسمبلی کے لئے چناؤ لڑنے کے لئے تیار کیا اور درپردہ سرکاری امداد سے وہ کانگریس کے ایک سینئر لیڈر کو شکست دے کر اسمبلی کے لئے منتخب ہو گئے۔ شمیم احمد شمیم کافی مدت تک صادق صاحب کے اس احسان کو نہیں بھولے حالانکہ فطرتاً وہ احسان فراموش تھے زیادہ دیر تک دوستی نبھانے کی صلاحیت سے محروم تھے۔ وہ اگر سیاست کی نذر نہ ہو جاتے تو ہندوستان کے ایک بہت بڑے صحافی بن جاتے۔ لیکن ہوس اقتدار نے ان سے یہ صلاحیت چھین لی۔ آئینہ جو ایک صحت

www.taemeernews.com

مند صحافتی، روایت قائم کر رہا تھا شمیم احمد شمیم کے سیمابی کردار کی وجہ سے بگڑی اچھال اخبار بن گیا اور اس میں بھی انہوں نے کانگرس کے اندر غلام محمد صادق کے حریفوں کو ہی نشانہ بنایا۔ غلام محمد صادق اور سید میر قاسم، غلام محمد صادق اور در گاپرشاد در کے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور راستے الگ الگ ہوئے اس میں شمیم احمد شمیم کا ایک خاص رول رہا۔

خواجہ غلام محمد صادق انتہائی، ذہین اور دوراندیش تھے لیکن وہ سیاسی زندگی کے اس پہلو سے نظریں چراتے رہے کہ ۱۹۵۲ کے بعد کی سیاسی عمارت سیاسی بلیک میل کی بنیاد پر کھڑی ہے ۔ موقع پرستی، چاپلوسی، چرب زبانی اور ناک رگڑ رگڑ کر سرپرستی حاصل کرنے کی بیماری کینسر بن گئی تھی اور کوئی بھی حکمراں اس بیماری سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ بخشی غلام محمد کے سیاہ چہرے نرم رو پالیسی سے دھلتے رہے اور وہ صادق صاحب کے دسترخوان کی زینت بننے لگے۔ ان میں پیر غیاث الدین، ان کے بھائی پیر عبدل الاحد، میر غلام محمد راجپوری، شیخ نور محمد، عبدالغنی گونی۔ منوہر ناتھ کول، پیارے لال کارہلو وغیرہ شامل ہیں۔ شاید صادق صاحب سمجھوتا نہ کرتے اگر ان کے ارد گرد ان کے رشتہ داروں، ان کی بہن محترمہ زینب بیگم اور ان کے بیٹے رفیق صادق نے گھیرا نہ ڈالا ہوتا۔ صادق صاحب کے یہ نزدیکی لوگ انہیں یہ احساس دلاتے رہے کہ سید میر قاسم اور در گاپرشاد در ان کو اقتدار سے ہٹانے کی سازش کر رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس کچن کیبنٹ، نے پیر غیاث الدین۔ میر غلام محمد راجپوری، شیخ نور محمد وغیرہ کو صادق صاحب کی انگلی پکڑنے کی تحریک دی۔ اور انگلی پکڑنے کے اس چکر میں یہ سیاہ چہرے سفید چہرے بن کر وزیر بھی بن گئے۔

پاکستان کشمیر کے اندر محاذ رائے شماری کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کا جائزہ لے رہا تھا اور کسی نہ کسی طریقے سے اس صورت حال کا فائدہ اٹھانے کی کوشش میں تھا۔ محاذ کے ساتھ براہ راست رابطے کی وجہ سے حکومت پاکستان کو امید تھی کہ اگر وہ وادی کے اندر مقامی آبجنٹوں کے ذریعے شورش برپا کرنے میں کامیاب ہو جائے تو پاکستان مسلح دراندازوں کو وادی میں بھیج دے گا۔ دراندازی کی اسکیم بنی اور شاید حکومت کو اس کا علم نہ ہوتا اگر تنگرگ کے ایک گوجر کو وقت پر ان دراندازوں کی موجودگی کا پتہ نہ چلتا۔ ۱۹۶۵ کی جنگ اسی دراندازی کا نتیجہ تھی۔ دراندازی اتنی کامیاب رہی کہ مسلح پاکستانی سری نگر تک پہنچ گئے لیکن وادی کے اندر ان دراندازوں کے حق میں کوئی عوامی تحریک منظم نہیں ہوئی بلکہ اس کے برعکس کشمیری مسلمانوں نے پاکستانی دراندازوں کے خلاف ہندوستانی فوج کی بھرپور مدد کی۔ غلام محمد میر بجن، غلام مصطفےٰ، میر عبدالغنی نمتہ ہالی۔ غلام قادر آری زال، عبدالغنی لون، محمد شفیع اوڈی وغیرہ دن رات ہندوستانی فوج کے ساتھ کام کرتے رہے۔ غلام رسول کار تو حاجی پیر میں ہندوستانی فوج کے گائڈ

www.taemeernews.com

بنے۔

کشمیری مسلمانوں نے پہاڑیوں، جنگلوں اور گھنے کمینتوں میں چھپے دراندازوں کو گرفتار کرانے میں حکومت کی بھرپور مدد کی۔ یہ ممکن ہے کہ پاکستان کے ایجنٹ وادی کے اندر شورش برپا کرانے میں کامیاب ہو جاتے لیکن کانگرس کے کارکن اور حکومتی مشینری کے درمیان تال میل اور فرض شناسی نے پاکستانی ایجنٹوں کے حوصلے توڑ دئے اور وہ پاکستانی دراندازوں کی کوئی مدد نہ کر سکے۔ لیکن اس دراندازی نے وادی میں پاکستانی ایجنٹوں کو خفیہ ٹھکانوں کا جال بچھانے میں مدد دی جس کی وجہ سے وہ پڑھے لکھے نوجوانوں کو منظم کرنے میں کامیاب ہو سکے۔

www.taemeernews.com

-

www.taemeernews.com

پاکستان اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ جنگ شروع ہوتے ہی کشمیری مسلمان ہندوستان کے خلاف بغاوت کر دے گا۔اس لئے اس نے مسلح دراندازوں کو کشمیر بھیجا تھا۔ لیکن کشمیری مسلمانوں نے دراندازوں کی امداد کرنا تو دور کی بات ہے انھیں پناہ بھی نہیں دی، سیدھے سیکورٹی فورسز کے حوالے کر دیا۔ کشمیری مسلمان ہندوستان کے خلاف شدید نفرت کا اظہار تو کرتا ہے لیکن وہ پاکستان کا حامی بھی نہیں ہے۔ کشمیری خود پرست ہے۔ اسے اپنی تہذیب، اپنے تشخص اور اپنی زبان سے بے حد پیار ہے اور وہ کسی بھی صورت میں پنجابی کلچر کو اپنانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ مسلمان ہو یا ہندو دونوں ہی پنجابی کلچر سے نفرت کرتے ہیں۔ کشمیری مسلمان خاص طور سے پاکستان کے کلچر سے خوفزدہ ہے۔ اسی لئے وہ نظریاتی طور سے پاکستان میں شامل ہونے کے حق میں نہیں ہے۔ البتہ پاکستان کے لئے اس کے دل میں نرم گوشہ ضرور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جب پاکستان زندہ باد کا نعرہ بلند ہوا، کشمیری مسلمان نے اس کی مخالفت نہیں کی لیکن جب کبھی پاکستان کی مداخلت کے لئے زمین ہموار کرنے کا موقع آیا اس نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستان کی شکست کے بعد حکمراں کانگریس کے لیڈروں میں، خاص کر وزیر اعلیٰ خواجہ غلام محمد صادق اور ان کی، کچن کیبنٹ، جس میں ان کی ہمشیرہ محترمہ زینت بیگم، پیر غیاث الدین، نور محمد اور علی محمد طارق شامل تھے، یہ احساس کروٹ لینے لگا کہ اگر کشمیری مسلمانوں کی شکایات اور ناراضگیوں کو دور کرنے کے لئے کشمیری پنڈتوں کو کنارے بھی لگانا پڑے تو سودا مہنگا نہیں ہوگا، گو یہ ایک سیاسی ہتھیار تھا لیکن اس سے کشمیری پنڈتوں میں شدید ناراضگی پیدا ہوئی اور اس کا بھرپور مظاہرہ پنڈت ایجی ٹیشن کے دوران کیا گیا حالاں کہ پنڈت ایجی ٹیشن تو ایک نان ایشو سے کر شروع کیا گیا تھا۔ جو لڑائی حکومت کے خلاف شروع ہوئی وہ کشمیری پنڈتوں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کا موجب بن گئی۔ کشمیری مسلمانوں کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ خود حکمراں جماعت کے چند لیڈروں اور مقامی اخبارات نے اس کو ہندو مسلم مسئلہ بنا کر فرقہ وارانہ ٹکراؤ کا آغاز کیا جس نے سیاست کشمیر کا رخ ہی موڑ دیا۔

www.taemeernews.com

کشمیری پنڈت ایجی ٹیشن باب ۹

اقلیتی فرقہ کشمیری پنڈت تعلیمی لحاظ سے ترقی یافتہ فرقہ ہے۔ اور یہی اس کی بد قسمتی ہے۔ تعلیمی قابلیت، مقابلے کے امتحانوں میں کامیاب ہونے کی صلاحیت اور اپنی بقا کے لئے حالات کے ساتھ سمجھوتے کی سکت نے اس فرقہ کو اپنوں اور غیروں کی نکتہ چینی کا نشانہ بنا دیا ہے، بنکوں، مرکزی اداروں اور دوسرے تجارتی مرکزوں میں اپنی قابلیت کے بل پر اس فرقے کو آبادی کے تناسب سے زیادہ نمائندگی حاصل ہوتی رہی۔ عام طور سے یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ کشمیری پنڈتوں نے مسلمانوں کے حق پر شب خون مار کر نوکریاں حاصل کی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کشمیری پنڈتوں کو مرکزی اداروں اور پیشہ ورانہ کالجوں میں داخلے صرف اپنی قابلیت اور صلاحیت کی بنا پر ہی ملتے رہے ہیں اور اس میں تعصب اور مذہب پرستی کا دخل نہیں رہا ہے۔ کشمیری پنڈت ایک مختصر سی اقلیت ہے اور اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ وادی کی سیاست پر اثر انداز ہو سکتی ہے ایک غیر قدرتی بات ہے لیکن اسکے باوجود اس فرقے پر طرح طرح کے الزامات لگائے جاتے ہیں۔ ایک الزام یہ بھی ہے کہ اس فرقے نے مہاراجہ کے خلاف لڑائی میں مہاراجہ کی حمایت کی جو کہ ایک بے بنیاد الزام ہے۔ ۱۹۳۸ء میں مسلم کانفرنس کے نیشنل کانفرنس میں تبدیل کئے جانے کے بعد کشمیری پنڈتوں نے آزادی کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ ان میں پنڈت کشپ بندھو، در گاپرشاد در، شام لال صراف، جیالال کلم۔ موتی لال مصری۔ اونکار ناتھ در، پران ناتھ جلالی۔ سروپ ناتھ۔ ڈاکٹر چمگتو، پیارے لال کارہلو، رشی دیو، آر سی رینا، ڈاکٹر پشن، جیالال تعمیری۔ ہردے ناتھ درانی قابل ذکر نام ہیں۔ نیشنل کانفرنس کو نظریاتی اسلحہ سے لیس کرنے میں ان کشمیری پنڈتوں کا نمایاں رول رہا ہے۔ پشتنی باشندوں کا ایکٹ بھی کشمیری پنڈتوں کی طویل جدوجہد کا نتیجہ ہے جو انہوں نے مہاراجہ کے خلاف لڑی تھی۔ تحریک آزادی کی کامیابی نے کشمیری پنڈتوں کی معیشت پر وار کیا لیکن کشمیری پنڈتوں نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ ۱۹۵۳ کے بعد جب ہندوستان مخالف تحریک نے زور پکڑا تو کشمیری پنڈت فرقہ اس میں بھی حائل نہیں ہوا لیکن شر پسند عناصر نے کبھی بھی کشمیری پنڈتوں کو کشمیری سماج کا اٹوٹ حصہ نہیں سمجھا بلکہ اسے ہمیشہ ہندوستان کا ایجنٹ ہی قرار دیا۔

www.taemeernews.com

شر پسند عناصر میں کشمیری پنڈتوں کے خلاف جذبہ نفرت سمجھ میں آتا ہے لیکن سیاسی جماعتوں اور خاص کر حکمراں جماعتوں میں بھی یہ احساس کہ کشمیری پنڈتوں نے مسلمانوں کے مفادات پر شب خون مارا ہے ناقابل فہم بات ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد کشمیری پنڈتوں کے خلاف حکمراں جماعت کانگریس میں ناموافق لہر ابھرنے لگی اور اس کو تقویت پہنچانے والوں میں پیر غیاث الدین شیخ نور محمد، علی محمد طارق، پیر عبدالاحد، محترمہ زینب بیگم، اعلا پولس افسر پیر غلام حسن شاہ اور دوسرے اعلا سرکاری افسر شامل تھے۔ جنگ میں پاکستان کی شکست نے حکمراں ٹولے میں یہ احساس پیدا کیا تھا کہ اگر کشمیری مسلمانوں کی شکایت کی طرف سنجیدہ توجہ دی جائے چاہے اس میں اقلیت کو نظر انداز ہی کیوں نہ کرنا پڑے تو کانگریس مسلمانوں میں مقبول ہوجائے گی۔ اس میں بھی گروہی مفاد غالب تھا۔ غلام محمد صادق کو اس بات پر قائل کر دیا گیا تھا کہ سید میر قاسم ان کو اقتدار سے ہٹا دینا چاہتے ہیں اور اس میں درگا پرشاد دران کی حمایت کر رہا ہے۔ غلام محمد صادق دھیرے دھیرے میر قاسم سے بدظن ہو رہے تھے۔ ممبران اسمبلی کی اکثریت میر قاسم کے حق میں تھی اور تنظیمی سطح پر بھی کارکنوں کی نظریں میر قاسم پر ہی لگی ہوئی تھیں۔ اس دوران سرکاری نوکریوں اور پیشہ وارانہ کالجوں میں اکثریتی فرقے کے لیے ۶۰ فیصد اور اقلیتی فرقے کے لئے (جس میں جموں کے ہندو بھی شامل تھے) ۴۰ فیصد اسامیاں ریزرو کی گئیں کشمیری پنڈت اس سے پریشان تو تھا اور اندر ہی اندر اس میں ناراضگی بڑھ رہی تھی۔ وہ حکومت کے خلاف تحریک شروع کرنے پر غور کر رہا تھا لیکن اس کے سامنے کوئی ایشو نہیں تھا۔ ایک پنڈت بیوہ کی بالغ لڑکی نے اپنی مرضی سے ایک مسلمان نوجوان سے شادی کرلی اور پنڈتوں کو یہ ہتھیار حکومت کے خلاف لڑنے کے لئے استعمال کرنے کا موقع مل گیا۔ شادی کا مسئلہ ایک نان ایشو تھا۔ اس پر تحریک شروع کرنا ایک سنگین غلطی تھی اور میں جو کانگرس کا پی آر او تھا اس تحریک کی شدید مخالفت کر رہا تھا۔ مخالفت اس وجہ سے نہیں کہ میں کانگریس سے وابستہ تھا یا مسلمانوں کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ میں دیانتداری سے محسوس کر رہا تھا کہ ایسے معاملے پر تحریک خودکشی ثابت ہوگی۔ کشمیری پنڈتوں نے ایسی لڑائی لڑی کہ یقین کرنا ناممکن کہ ایک چھوٹی سی اقلیت اسی طرح کی لڑائی لڑ سکتی ہے۔ اس تحریک نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی کر دی۔ حکمراں جماعت کا صادق حامی گروپ درپردہ ہندوؤں کے خلاف منظم ہوتا گیا اور ان پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے گئے۔ فائرنگ بھی ہوئی۔ لوگ ہلاک بھی ہوئے۔ اخبارات نے بھی کشمیری پنڈتوں کے خلاف نفرت ابھارنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پنڈت ایجی ٹیشن نے ثابت کر دیا کہ کشمیر میں سیکولرزم کی بنیاد کافی کمزور ہے۔ غلام محمد صادق چاپلوسوں اور شاطر عناصر کے گھیرے میں پھنس گئے تھے اور ان کے نام پر ایسی مذموم

www.taemeernews.com

حرکتیں کی گئیں کہ ان کی شخصیت بھی مشکوک ہو گئی۔

کانگریس کے اندر بھی گروہ بندی تیز ہوگئی اور درگاپرشاد در سمیت ہر کشمیری پنڈت کارکن کی پوزیشن مشکوک بن گئی۔ ہر کوئی بہہ گیا فرقہ پرستی کے سیلاب میں۔ نہ کشمیری پنڈت محفوظ رہا اور نہ ہی مسلمان۔ فرقہ پرستی نے دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ درگاپرشاد در وزیر داخلہ تھے لیکن حکم چلتا تھا صادق گھرانے کا اور پیر غلام حسن شاہ کا۔ تحریک نے حکومت ہند کو بھی ہلا کے رکھ دیا اور وزیر داخلہ وائی بی چوان کو سرینگر آنا پڑا۔ صلح صفائی ہوئی اور کوبلی کمیشن کو سارے معاملہ کی تحقیقات کرنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ ایک طویل مدت گذر جانے کے بعد بھی کوبلی کمیشن کی رپورٹ منظر عام پر نہیں آئی۔

جہاں پنڈت ایجی ٹیشن ایک غیر دانشمندانہ ایجی ٹیشن تھی وہاں حکمراں ٹولے کی حکمت عملی بھی بے اصولی تھی۔ غیر دانشمندی اور بے اصولی نے نہ صرف دونوں فرقوں کے درمیان شکوک و شبہات پیدا کئے بلکہ حکمراں جماعت میں بھی گروہ بندی تیز ہوئی۔ خواجہ غلام محمد صادق نے درگاپرشاد در سے وزارت داخلہ کا قلمدان چھین لیا اور وہ حکومت ہندوستان پر زور دیتے رہے کہ درگاپرشاد در کو ریاست بدر کر دیا جائے۔ نفرت اتنی شدید تھی کہ غلام محمد صادق نے درگاپرشاد در کو راجیہ سبھا کا ممبر بھی بنانے سے صاف انکار کر دیا۔ گو پنڈت ایجی ٹیشن میں سید میر قاسم نے کوئی نمایاں رول نہیں کیا تھا حالاں کہ اسمبلی میں ان کی تقریر سے غلط فہمیاں پیدا ہوئی تھیں کہ وہ بھی پنڈتوں کے دشمن ہیں لیکن صادق کیمپ ان کو اپنانے پر تیار نہیں تھا۔ نرم روپالیسی کی وجہ سے محاذ رائے شماری اور شیخ عبداللہ تقویت حاصل کر رہے تھے۔ کانگریس کارکن اس نئی صورت حال سے پریشان تھا۔ میر قاسم کبھی کبھی اس صورت حال پر برہمی کا اظہار بھی کرتے تھے جس کا براہ راست نتیجہ یہ نکلا کہ کشمیر میں یہ افواہ پھیلائی گئی کہ میر قاسم نرم روپالیسی کے مخالف ہیں۔ خواجہ غلام محمد صادق کی گرفت انتظامیہ پر سے ڈھیلی پڑ رہی تھی۔ کرپشن بڑھ رہا تھا۔ عوامی شکایات کی طرف عدم توجہ سے حکومت لوگوں سے کٹ رہی تھی۔ پنڈتوں پر ظلم سے مسلمان صادق کا حامی نہیں بن سکا تھا ان حالات سے مایوس ہو کر سید میر قاسم نے اسمبلی اور کانگریس کی صدارت سے استعفے دے دیا اور سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا اعلان کیا۔ لیکن کانگریس ممبران اسمبلی کی اکثریت اور تمام ضلع کانگریس کمیٹیوں نے سید میر قاسم کی حمایت جاری رکھی۔ لڑائی نے ایسا شدید رخ اختیار کر لیا کہ صادق گروپ نے کانگریس کے تمام دفتروں پر قبضہ کر لیا۔ میر قاسم حامی تمام ضلع صدروں کو ہٹایا گیا اور میر قاسم کے خلاف ایک تحریک شروع کی گئی۔

مرکزی سرکار سکون سے ایک حساس ریاست میں اس سیاسی افراتفری کا خاموشی سے تماشا

www.taemeernews.com

دیکھتی رہی۔ حقیقت یہ تھی کہ مرکزی سرکار بھی غلام محمد صادق سے خوش نہیں تھی۔ مرحومہ اندرا گاندھی بھی بالواسطہ طور پر غلام محمد صادق کی اونچی گردن کو جھکانے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن منظر عام پر وہ ان کی بھرپور حمایت کر رہی تھیں۔ مرکزی سطح پر بھی کانگریس کے اندر سنڈیکٹ اور اندرا گاندھی کے درمیان ٹکراؤ تیز ہو رہا تھا گویہ ٹکراؤ شخصیات کے درمیان ٹکراؤ کا نتیجہ تھا۔ لیکن اسے رجعت پسندی اور ترقی پسندی کے درمیان جنگ کا نام دیا گیا اور خواجہ غلام محمد صادق اس جنگ میں اندرا گاندھی کے کیمپ میں تھے۔ کانگریس کی مرکزی سطح پر تقسیم کے بعد جموں کشمیر میں اسمبلی کے اندر اور باہر صادق اور قاسم گروپ میں غیر اعلان شدہ جنگ باضابطہ جنگ میں بدل گئی اور ممبران اسمبلی کی اکثریت جموں سے دہلی گئی اور دہلی میں خواجہ غلام محمد صادق کو ہٹانے کا سڑکوں پر مطالبہ ہونے لگا۔ کئی روز تک قاسم گروپ نے نئی دہلی میں اندرا گاندھی سے لیکر وائی بی چوان تک ہر ایک سے ملاقات کی اور غلام محمد صادق کو ہٹانے کا مطالبہ کرتے رہے۔ ممبران اسمبلی کی اکثریت نے گورنر کے نام ایک میمورنڈم پر دستخط بھی کئے جس میں غلام محمد صادق کو ہٹا کر سید میر قاسم کو لیڈر منتخب کیا گیا تھا۔ اس دوران وزیر اعظم اندرا گاندھی نے دہلی میں غلام محمد صادق کو جو کہ ہوائی گھوڑے پر سوار تھے نیچے زمین پر اترنے پر مجبور کر دیا اندرا جی نے اپنا مقصد پورا کر کے قاسم گروپ کو بلایا اور انھیں دھمکی دی کہ "مجھے معلوم ہے کہ کشمیر میں کس طرح کے آزادنہ چناؤ ہوتے ہیں کیسے ممبران اسمبلی بلا مقابلہ کامیاب ہوتے ہیں اکثریت کا عدم اعتماد کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جب تک مرکز چاہے گا غلام محمد صادق وزیر اعلی بنے رہیں گے۔ میں اس میٹنگ میں موجود تھا۔ کانگریس کے جنرل سکریٹری ہیم وتی نندن بہوگنا بھیگی بلی کی طرح جمہوریت پر تقریر سنتے رہے اور قاسم گروپ کے ممبران اسمبلی سر جھکائے بے عزتی برداشت کرتے رہے۔ کسی نے جرائت نہیں کی اندرا گاندھی سے یہ کہنے کی کہ "سوال یہ نہیں کہ چناؤ کیسے جیتے جاتے ہیں سوال یہ ہے کہ کانگریس کیسے کشمیر میں ہندوستان کا جھنڈا لہرا رہی ہے"۔ ممبران اسمبلی خالی ہاتھ جموں واپس آگئے اور خاموشی کے ساتھ اپنے زخموں کو چاٹتے رہے۔ میر قاسم کو قربانی کا بکرا بنایا گیا حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ عدم اعتماد کی تحریک کے حق میں نہیں تھے۔ جس بھی ممبر نے عدم اعتماد کی پر دستخط کئے ان سے سید میر قاسم نے صاف الفاظ میں کہا کہ صادق صاحب کو ہٹایا نہیں جائے گا۔ لیکن ممبران اسمبلی معلوم نہیں کیوں عدم اعتماد کی تحریک پر بضد تھے۔ کئی چہرے نظروں کے سامنے گھوم رہے ہیں۔ غلام محمد میر پونچھی کانگریس کے چیف وہپ تھے۔ گھنٹوں انہوں نے غلام محمد میر سجن کے سامنے گھٹنے ٹیک کر یہ یقین دلایا کہ "میں غلام محمد صادق کا وفادار نہیں ہوں۔" میرے پاس آکر مجھے اطمینان دلایا کہ "میں سید میر قاسم کا وفادار ہوں۔" سید میر قاسم بضد تھے کہ میر پونچھی سے

www.taemeernews.com

عدم اعتماد کی تحریک پر دستخط نہ کرائے جائیں۔ انھیں اس پر کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ میر یونجھی نے نائب وزیر مفتی محمد سعید کی رہائش گاہ پر پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ "غلام محمد صادق پر سے ان کا اعتماد اٹھ گیا ہے۔" اسی رات ان کی اہلیہ مفتی محمد سعید کی سرکاری رہائش گاہ پر آئیں۔ معلوم نہیں کہ اہلیہ نے کس طرح کی خطرناک دھمکی دی کہ میر یونجھی رات کے اندھیرے میں بھاگ کر صادق صاحب کے قدموں پر گر پڑے۔ میاں بشیر ایک اور اسمبلی ممبر تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں چودھری محمد اسلم، مرزا عبدالرشید کے ساتھ صادق صاحب کے گھر گئے اور قرآن کی قسم کھا کر کہا "ہم تو آپکے وفادار ہیں۔" آدھے گھنٹے کے بعد یہ تینوں سید میر قاسم کے گھر پر قسمیں اٹھا رہے تھے کہ ہم تو سید زادوں کے غلام ہیں۔ ہم بھی عدم اعتماد کی تحریک پر دستخط کریں گے۔

نئی دہلی سے واپس آکر ہر ایک کو محسوس ہوا کہ گھر کی لڑائی دہلی کے بازاروں میں لڑ کر گھر کی بنیاد کمزور کی گئی ہے لیکن لڑائی لڑی جا چکی تھی۔ غلام محمد صادق ٹوٹ گئے تھے اور انھیں اس بات کا دکھ تھا کہ "میں خود سید میر قاسم کو اپنا جانشین بنانے کے حق میں تھا لیکن میر قاسم نے جلد بازی سے کام لے کر وشواس گھات کیا۔ غلام محمد صادق نے مجھ سے کہا کہ "وہ جو پگڑی ہم نے دہلی کے بازاروں میں پھینک دی وہ گم ہوگئی ہے۔ اب تو ہم مکمل طور سے ننگے ہو گئے ہیں۔"

سید میر قاسم نے ہتھیار ڈال دئے اور باضابطہ طور پر پردیش کانگریس کمیٹی کی میٹنگ بلا کر وزیر اعلا غلام محمد صادق کو پردیش کانگریس صدر منتخب کیا گیا۔ پنڈت منگت رام شرما جنرل سکریٹری مقرر ہوئے صادق اور قاسم کے درمیان اعتماد مکمل طور سے ٹوٹ گیا لیکن اس کے باوجود سید میر قاسم کو بدستور کانگریس میں ممبران اسمبلی اور کارکنوں کی حمایت حاصل رہی۔

www.taemeernews.com

-

www.taemeernews.com

پردیش کانگرس میں اقتدار کی جنگ باب ۱۰

سید میر قاسم نے سیاست سے کنارہ کشی کا اعلان تو کیا تھا لیکن پردیش کانگرس کے اندر چاہنے والوں کی اکثریت ان کے عملی سیاست سے راہ فرار اختیار کرنے میں حائل تھی۔ مرکزی سرکار بھی انہیں متبادل کی شکل میں سیاسی طور پر زندہ رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وزیر اعلا غلام محمد صادق کی صحت گرتی جا رہی تھی اور ان کے گروپ میں کوئی ایسا لیڈر نہیں تھا جو ان کی جگہ لے سکتا حالانکہ غلام محمد صادق کے قریبی لوگ سید میر قاسم کو سیاسی زندگی سے الگ تھلگ کرنے کی اور ان کی امیج مسخ کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ سید میر قاسم پر اینٹی، نرم رو پالیسی، اینٹی کشمیری مسلم اور کشمیر کی انفرادیت ختم کرنے کا الزام سر عام لگایا جا رہا تھا اور اس میں پولیس کے سربراہ پیر غلام حسن کی خدمات کا بھی استعمال ہو رہا تھا۔ پردیش کانگریس کے صدر محمد ایوب خان اور جنرل سکریٹری پنڈت منگت رام شرما سیاست کی بساط پر محض مہرے تھے جنہیں صادق گروپ استعمال کر رہا تھا۔ محمد ایوب خان کی اپنی کوئی سوچ نہیں تھی۔ وہ ہاں میں ہاں ملانے اور چڑھتے سورج کی پوجا کرنے میں ماہر تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ محض ایک مہرے ہیں جس کی اپنی کوئی انفرادی پوزیشن نہیں ہے۔ پنڈت منگت رام ایک چالاک برہمن ہیں۔ کسی کو ناراض کرنا انہوں نے سیکھا ہی نہیں ہے۔ وہ صادق گروپ اور قاسم گروپ دونوں کو بیک وقت مٹھی میں بند رکھنے کی کوشش کرتے رہے اور ان کی مٹھی اتنی مضبوط ہے کہ اس سے باہر نکلنا مشکل ہے۔ غرض وہ ایک کامیاب سیاست داں ہیں اور اسی گر، نے انہیں ترقی کی منزلوں تک کامیابی سے پہنچنے کا موقع دیا۔ پردیش کانگریس کے اندر نوجوانوں کا ایک اور گروپ ابھر رہا تھا جو نہ ماضی پرست تھا اور نہ ہی روایتی انداز سے سوچنے کا عادی۔ اس میں مفتی محمد سعید، عبدالغنی لون، محمد شفیع اوڈی، پیر حسام الدین اور محمد اشرف شامل تھے۔ مفتی محمد سعید اور عبدالغنی لون دونوں نہ صرف سید میر قاسم کے بہت قریب تھے بلکہ سید میر قاسم کو نازک مرحلوں پر مشورے بھی دیتے تھے۔ مفتی محمد سعید ایک روشن خیال نوجوان تھے اور اپنی سوچ اور اپنے نظریے کو وسعت دینے کے لئے مطالعہ بھی کرتے رہتے تھے اور عالمی سطح پر ابھرتے نئے رجحانات کو سمجھنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ انہیں اخباروں، رسالوں اور کتابوں کے مطالعے کا بہت شوق تھا جو آج

www.taemeernews.com

بھی جاری ہے، اس زمانے میں وہ سیاسی شطرنج کھیلنے کے نہ تو ماہر تھے اور نہ ہی یہ کھیل کھیلنا چاہتے تھے۔ ایک معصوم اور دیانت دار سیاسی کارکن تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ چاپلوسی اور چرب زبانی ان کے کردار کا حصہ نہیں تھی۔ عبدالغنی لون وفادار قسم کے نوجوان تھے۔ سید میر قاسم کے ساتھ ان کے ذاتی مراسم تھے وہ دیہات کے تھے اور اسی لئے ایمانداری کے ساتھ اپنے لی کی بات زبان پر لایا کرتے تھے، چاہے کوئی ناراض ہی کیوں نہ ہو۔۔ نظریاتی طور پر کانگریسی نہیں تھے لیکن کشمیر میں کوئی اور جماعت بھی نہیں تھی جس میں شامل ہوتے۔ ضلع بارہمولہ کے روایتی لیڈر چاہے غلام رسول کار تھے یا غلام نبی سوگامی دونوں عبدالغنی لون سے خوفزدہ تھے۔ حقیقت میں کشمیری سیاست کا المیہ یہی ہے کہ روایتی اور ماضی پرست سیاسی لیڈروں نے نوجوانوں کے راستے میں ہمیشہ رکاوٹیں ڈالیں اور انہیں آگے بڑھنے نہیں دیا۔ مفتی محمد سعید جہاں جارحانہ انداز اختیار کرنے کے قائل نہیں تھے وہاں عبدالغنی لون جارحانہ انداز سے اپنی بات منوانے کے سبب لوگوں کو ناراض کرتے رہتے تھے۔ خواجہ غلام محمد صادق کو اسمبلی اور کانگرس پارلیمانی پارٹی میں اگر کوئی ممبر چیلنج کرتا تھا وہ عبدالغنی لون تھے۔ ڈرنا، خوفزدہ ہونا یا مرعوب ہونا ان کے کردار کا حصہ نہیں تھا۔

مرکز میں محترمہ اندرا گاندھی سنڈیکٹ کو سیاسی طور پر ختم کرکے ایک مضبوط قائد کی حیثیت سے ابھر رہی تھیں اور کشمیر جو ہمیشہ ترقی پسند سیاسی نظریات کا حامی رہا ہے وہ محترمہ اندرا گاندھی کا زبردست حمایتی تھا۔ خواجہ غلام محمد صادق خراب صحت کے باوجود کانگریس کے اندر ترقی پسند قوتوں کی بھرپور حمایت کرتے تھے اور مسز اندرا گاندھی ان کے مشوروں کی قدر کرتی تھیں۔ میر قاسم بھی ترقی پسند تھے لیکن صادق قاسم لڑائی کی وجہ سے نئی دہلی کے ترقی پسندوں نے ان کی امیج کسی حد تک بگاڑ دی تھی۔ مسز گاندھی شاید انہیں سیاسی طور پر بحال نہ کرتیں اگر کشمیر میں کوئی اور سیاسی لیڈر ابھرا ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ مرکزی سرکار سید میر قاسم کو GOOD HUMOUR میں رکھا کرتی تھی مسز گاندھی نے سنڈیکیٹ سے مکمل طور پر آزاد ہونے کے لئے پارلیمنٹ کے ضمنی چناؤ کا اعلان کیا لیکن کشمیر میں سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ محاذ رائے شماری کانگریس کے مقابلے میں بہت مضبوط تھی اور مسز گاندھی یہ نہیں چاہتی تھیں کہ کانگرس کے امیدوار ناکام ہو جائیں۔

محاذ رائے شماری پر پابندی لگانے پر غور و خوض ہو رہا تھا اور اس سلسلے میں نئی دہلی میں مذاکرات جاری تھے۔ وزیر اعلا خواجہ غلام محمد صادق نئی دہلی میں تھے۔ ایک شام سوا آٹھ بجے ان کے سکریٹری مسٹر او این در کا ٹیلی فون آیا کہ کانگرس صدر محمد ایوب خان کی طرف سے فوراً ایک بیان جاری ہونا چاہئے کہ اینٹی نیشنل جماعت محاذ رائے شماری پر پابندی لگائی جائے۔ سوا آٹھ بجے

www.taemeernews.com

ایوب خان کو تلاش کرنا مشکل تھا۔ خود ہی میں نے ایوب خان کا بیان لکھا۔ آل انڈیا ریڈیو کے نمائندہ خصوصی چونی لال ترسل کے ذریعے آل انڈیا ریڈیو کو بھجوایا دیا اور ۹ بجے کی انگریزی خبروں میں ہیڈ لائنز میں ایوب خاں کا بیان نشر ہوا صبح کو جب کانگرس دفتر میں ایوب خاں سے ملاقات ہوئی تو وہ سینہ تان کر پوچھنے لگے "آل انڈیا ریڈیو سے میرا بیان سنا؟"۔ سوچا کہ پوچھوں کہ بیان کا مطلب سمجھ میں آیا، لیکن خاموش رہا۔ ان کے بیان کے دوسرے روز محاذ رائے شماری پر پابندی لگی اور شیخ محمد عبداللہ اور مرزا محمد افضل بیگ کو ریاست بدر کر دیا گیا۔ ایوب خان بدستور اسی خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ ان کے بیان کی ہی وجہ سے پابندی لگی۔ وہ ایک اور بیان جاری کر کے سرکار کے پابندی لگانے کے فیصلے کا خیر مقدم کرنا چاہتے تھے لیکن نئی دہلی سے صادق صاحب نے ہدایت دی "ایوب خان کا کام بیان جاری کرنا تھا، خیر مقدم کرنا نہیں۔"

بخشی غلام محمد کانگریس کے امیدوار تھے لیکن خواجہ غلام محمد صادق نے شمیم احمد شمیم کو تیار کرایا بخشی غلام محمد کے خلاف چناؤ لڑنے کے لئے۔ اس دوران شمیم احمد شمیم نے شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ تعلقات قائم کر لئے تھے اور وہ ان کے بلامعاوضہ پی آر او بن گئے تھے۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد شیخ محمد عبداللہ نے شمیم احمد شمیم کی بطور آزاد امیدوار کے حمایت کا اعلان کیا۔ بقول مولانا محمد مسعودی "اگر شیخ محمد عبداللہ کھمبے کو بھی ووٹ دینے کے لئے کہیں گے تو کشمیری ایسا ہی کریں گے۔" مولانا مسعودی کا یہ بیان ان کی شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ وفاداری کا اظہار نہیں تھا بلکہ شیخ محمد عبداللہ کی سیاست پر بھرپور طنز بھی تھا، صادق گروپ اور ایڈمنسٹریشن کھلم کھلا بخشی غلام محمد کی مخالفت کرتی رہی جب کہ سید میر قاسم دیانت داری کے ساتھ چاہتے تھے کہ بخشی غلام محمد کامیاب ہوں۔ غلام محمد صادق اور شیخ محمد عبداللہ دونوں بخشی غلام محمد سے خائف تھے۔ وہ کسی بھی حالت میں بخشی غلام محمد کی سیاسی زندگی ختم کرنے کی کوششیں کر رہے تھے شمیم احمد شمیم نے جن کو بخشی غلام محمد نے فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا تھا جارحانہ انداز سے یہ چناؤ لڑا اور بخشی غلام محمد کو شکست دی۔ یہ جیت شمیم احمد شمیم کی ذاتی کامیابی نہیں تھی بلکہ شیخ محمد عبداللہ کی کھمبے کو کامیاب کرنے کی سیاست کی جیت تھی۔

اسی دوران سید میر قاسم نے ایک بار پھر سیاسی سطح پر پاکستان کے دو قومی نظریے کی مخالفت اور ہند کشمیر الحاق کی افادیت کو سمجھانے کے لئے وادی کا دورہ کیا۔ گاؤں کی سطح پر گھنٹوں وہ لوگوں سے بات کرتے انہیں سمجھاتے اور انہیں یہ یقین دلاتے تھے کہ کشمیری مسلمانوں کے مفادات صرف ہندوستان میں ہی محفوظ ہیں۔ ان ٹیگوں کا یہ فائدہ بھی ہوا کہ پہلی بار گاؤں کی سطح پر لوگوں سے مشورہ کر کے ان کے نجی اور اجتماعی مسائل کا ایک مسودہ تیار ہوا جسے نام دیا گیا۔

www.taemeernews.com

یہ مسودہ ریاست کے پلاننگ ڈپارٹمنٹ کے حوالے کیا گیا لیکن اس پر نہ تو تب عمل ہوا اور نہ ہی سید میر قاسم کے دور میں۔ ہند پاک جنگ چھڑ گئی تھی اور سید میر قاسم کو وزیر بے قلم دان مقرر کیا گیا۔ خواجہ غلام محمد صادق کی صحت کافی گر چکی تھی اور وہ بمبئی میں زیر علاج تھے۔ سید میر قاسم بالواسطہ طور پر وزیر اعلا کا کام کرنے لگے اور اسی دوران خواجہ غلام محمد صادق فوت ہو گئے۔ ان کی میت ان کی رہائش گاہ پر ہی لوگوں کے آخری دیدار کے لئے رکھی گئی اور گورنر نے سید میر قاسم کو وزیر اعلا کا حلف لینے پر مجبور کیا۔ سید میر قاسم چاہتے تھے کہ تدفین کے بعد رسم پوری کی جائے لیکن گورنر آئینی تقاضوں کو پورا کرنے پر بضد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حلف برداری کے وقت صرف میں، منوہر ناتھ کول اور عبدالغنی موجود تھے اور قوم کے نام جو پیغام راج بھون میں ریکارڈ کیا گیا وہ سید میر قاسم نے بغیر کسی تیاری کے نشر کر دیا اور میری دانست میں سید میر قاسم کا یہ بہترین پیغام تھا۔ تدفین کے بعد جب کابینہ بنانے کا مرحلہ آیا تو جموں کے کانگریسی لیڈر پنڈت ترلوچن دت اس بات پر بضد تھے کہ صادق گروپ کے کسی بھی ممبر کو کابینہ میں نہ لیا جائے لیکن سید میر قاسم اس پر تیار نہیں تھے۔ وہ continuity میں یقین رکھتے تھے اور یہ تاثر بھی نہیں دینا چاہتے تھے کہ وہ صادق گروپ سے انتقام لے رہے ہیں۔ قاسم گروپ برابر دباؤ ڈال رہا تھا کہ کہ صادق گروپ کو ہر سطح پر الگ تھلگ کیا جائے لیکن سید میر قاسم اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ ایک سورج ڈوب چکا تھا۔ نیا سورج طلوع ہو رہا تھا اس کی پرستش کرنے والوں نے اپنا رخ بدل دیا تھا اور اس میں پولس چیف پیر غلام حسن شاہ پیش پیش تھے۔ پیر غلام حسن شاہ جیسا موقع شناس موقع پرست اور خوش آمدی میں نے زندگی بھر نہیں دیکھا۔ راتوں رات وہ میر قاسم کے زبردست مداح بن گئے اور صادق دور کو ایک تاریک دور قرار دینے لگے۔ کشمیر میں سیاست دانوں اور اعلا سرکاری افسروں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے جہلم کے پانی میں بھی آگ لگا دینے کی صلاحیت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔

www.taemeernews.com

-

www.taemeernews.com

سید میر قاسم کے اقتدار میں آتے ہی وہ تمام کانگریسی لیڈر اور کارکن جنہوں نے صادق قاسم لڑائی میں میر قاسم کی حمایت کی تھی اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ انھیں بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کا موقع ملے گا۔ ان کا یہ احساس بے بنیاد بھی نہیں تھا کیوں کہ ماضی میں ایسا ہی ہوتا رہا تھا لیکن میر قاسم ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنی سیاسی حکمت عملی پر عمل کر رہے تھے۔ انہوں نے صادق گروپ کو بھی حالانکہ وہ میر قاسم کے وزیر اعلا بننے پر خوش نہیں تھا، ماہانہ وظیفوں کے بل پر قابو میں رکھا۔ جو لوگ جن میں پیر غیاث الدین، نور محمد شیخ، ٹھاکر رندھیر سنگھ اور میر غلام راجپوری بھی شامل تھے، میر قاسم کی کل تک سر عام پگڑی اچھال رہے تھے، وظیفے حاصل کر کے خاموش ہو گئے۔ میر قاسم کے اپنے وفادار لوگ بھی ماہانہ اجرت حاصل کر کے خوش تو ہوئے لیکن اندر ہی اندر اس نئی صورت حال سے مطمئن نہیں تھے۔ کل تک جو صادق وزارت میں وزیر تھے وہ میر قاسم وزارت میں بھی وزیر بنے۔

میر قاسم کے بارے میں عام سوچ یہ تھی کہ وہ وسیع تر مفادات کے لیے عام اتفاق رائے کی پالیسی کے مخالف ہیں اور وہ صادق سرکار کی پالیسیوں پر نظر ثانی کر کے ایک بار پھر ریاست میں ڈکٹیٹرانہ نظام قائم کریں گے۔ سیاسی حلقوں میں یہ احساس پایا جاتا تھا کہ میر قاسم کسی بھی صورت میں جمہوری نظام قائم نہیں رہنے دیں گے اور بخشی غلام محمد کے دور کی طرح ہندوستان مخالف عناصر کو کچل دیں گے۔ لیکن میر قاسم یہ سب جانتے ہوئے بھی بظاہر خاموش تھے۔ وہ درپردہ شیخ عبداللہ کے ساتھ رابطہ قائم کر رہے تھے اور اس میں بیگم شیخ محمد عبداللہ ان کے داماد غلام محمد شاہ اور شمیم احمد شمیم نہایت اہم رول ادا کر رہے تھے۔ شیخ صاحب کے ایک قریبی ساتھی خواجہ مبارک شاہ بھی خاص مشیروں میں تھے۔ میر قاسم یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ وہ اقتدار کو نہیں بلکہ ریاست کے مجموعی مفادات کو فوقیت دے رہے ہیں اور انھوں نے اقتدار ترک کر کے یہ بات ثابت کر دی۔

www.taemeernews.com

میر قاسم کا دور　　باب ۱۱

میر قاسم کمیونسٹ نہیں تھے لیکن ذہنی اور نظریاتی لحاظ سے کانگرسی بھی نہیں تھے۔ کشمیر کے ماحول میں وہ ایک روشن خیال لیڈر تھے۔ اسلامی فلسفہ کے گہرے مطالعے کے باوجود وہ کٹر بنیاد پرست مسلمان بھی نہیں تھے۔ دوست دشمن دونوں سے یکساں سلوک کرنے کے عادی تھے اور اس حد تک سخی کہ کبھی کبھی جب وہ اپنے ساتھیوں کی وقت وقت پر مالی امداد کرتے تھے تو ان پر بڈشاہ ثانی ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ گو وہ تحریک حریت کشمیر کے آخری دنوں میں شریک ہوئے تھے لیکن اپنی تنظیمی صلاحیتوں اور اپنی شعلہ بیانی سے وہ کافی آگے نکل چکے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ کے زمانے میں وہ وزیر مال مرزا محمد افضل بیگ کے پی اے تھے لیکن اس زمانے میں پی اے ایک سیاسی عہدہ ہوتا تھا۔ آئین سازی میں وہ شامل تھے۔ دہلی ایگریمنٹ تیار کرنے میں بھی انہوں نے نمایاں رول کیا تھا۔ ہند کشمیر الحاق کو حتمی قرار دینے میں وہ کسی بھی مصلحت کے شکار نہیں تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کشمیریوں کے مفاد میں ہے۔ اس لئے ۱۹۵۲ء کے بعد کی ان کی تقریروں میں کسی بھی موقع پر لغزش نہیں آئی۔ اقتدار میں رہ کر اور اقتدار سے باہر رہ کر بھی وہ انہی اصولوں پر قائم رہے کہ ہندوستان کے ساتھ الحاق تحریک حریت کشمیر کا منطقی نتیجہ ہے۔ وزیر اعلا بننے سے قبل ان کے بارے میں ترقی پسندوں نے طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلائیں۔ کسی نے کہا کہ وہ شیخ عبداللہ کے قومی دھارے میں واپس آنے کے مخالف ہیں، کسی نے کہا کہ وہ وزارت داخلہ کے خاص رکن ہیں اور اس میں کسی کو حیران ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے کیوں کہ اس زمانے میں محترمہ اندرا گاندھی کی کمیونسٹ پارٹی پرستش کرتی تھی اور میر قاسم بھی مسز اندرا گاندھی سے اختلاف کرتا تھا ان کے بارے میں کمیونسٹ پارٹی نے رجعت پسند ہونے کا فتوع جاری کیا تھا۔ لیکن اقتدار میں آنے کے بعد میر قاسم نے شیخ محمد عبداللہ کے قومی دھارے میں آنے کے راستوں کو ہر طرح کے کانٹوں سے صاف کیا جس کی وجہ سے ان کی اپنی پارٹی ان سے ناراض تھی حالانکہ کھلے عام کانگرس کا ہر بڑا چھوٹا لیڈر اور کارکن شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ دوستی کرنے کا دعوا کرتا تھا۔ میر قاسم کے ذہن کا میں نے قریب سے پوسٹ مارٹم کیا ہے، ان کی شخصیت کا تجزیہ کیا ہے کیونکہ

www.taemeernews.com

اس زمانے میں موہن چراغی کو ان کا خاص مہرہ قرار دیا جاتا تھا، حالاں کہ یہ الزام درست نہیں تھا۔ میں تو صرف ایک ایسا غیر کانگرسی ہمدرد تھا جو میر قاسم کا بلامعاوضہ ان کی پالیسیوں کی تبلیغ کرتا تھا۔ میں تب بھی بھوکا ننگا تھا اور آج بھی اس صورت حال میں کوئی واضح تبدیلی نہیں آئی ہے البتہ میر امانتا تھا کہ سید میر قاسم دیانت داری کے ساتھ ریاست میں ایک نیا سیاسی ماحول قائم کر کے پرانی تلخیوں کو مٹانا چاہتے تھے۔ میر قاسم میں بس ایک کمزوری تھی جو راز کی بات وہ اپنے ساتھیوں سے کرتے تھے وہی بات وہ نچلی سطح کے کارکنوں سے بھی کرتے تھے اور یہ لاعلاج مرض ان کے ساتھ اس طرح چمٹ گیا کہ وہ سیاسی زندگی کے ہر سودے میں گھاٹا برداشت کرتے رہے۔ لیکن کھلے پن کی بدعت کو ترک نہ کر سکے۔

میر قاسم ایک مضبوط ایڈمنسٹریٹر نہیں تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر ایک پر اعتماد کرتے تھے۔ ہر ایک کو اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرنے کا موقع دیتے تھے۔ عبدالغنی لون ان کی کابینہ کے اہم رکن تھے، وہ الٹے سیدھے بیانات دیتے رہتے تھے، تلخیاں بھی پیدا ہوتی تھیں لیکن میر قاسم ان کی ہر بات نظرانداز کر دیتے تھے۔ کیوں کہ انھیں یقین تھا کہ عبدالغنی لون ان کے وفادار ہیں۔ مفتی محمد سعید بھی ان کی کابینہ میں ایک وزیر تھے اور سید میر قاسم ان کے مشوروں کو کافی اہمیت دیتے تھے۔ مفتی محمد سعید کو معلوم تھا یا نہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ میر قاسم مستقبل کے لئے مفتی محمد سعید کو تیار کر رہے تھے۔ وہ اپنے بعد مفتی محمد سعید کو ہی اپنا سیاسی وارث بنانا چاہتے تھے اور اس کے لئے انھوں نے کئی سینئر ساتھیوں کو نظرانداز کر دیا۔ بیگ پار تھا سارتھی مذاکرات شروع ہو گئے تھے اور دونوں لیڈر قانونی اور آئینی باریکیوں پر گھنٹوں بحث کر رہے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ بدستور کبھی نرم کبھی گرم بیانات دے کر اپنے ریوڑ کو ایک ہی راستے پر ہانکنے کی اپنی پرانی حکمت عملی دہرا رہے تھے اور میر قاسم ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت شیخ محمد عبداللہ کو کبھی بیگم شیخ محمد عبداللہ اور کبھی غلام محمد شاہ کے ذریعہ اس بات پر قائل کرنے کی کوششیں جاری رکھے ہوئے تھے کہ ۱۹۵۳ میں جو اقتدار چھین لیا گیا تھا اس کو باعزت طور سے واپس حاصل کرنے کے لئے دو قدم پیچھے اور دو قدم آگے کی پالیسی سودمند ثابت ہو گی۔ میر قاسم پہلے وزیر اعلا تھے جنھوں نے شیخ محمد عبداللہ کو عید کی مبارک باد دینے کے لئے ان کی رہائش گاہ پر حاضری دی۔ ۱۹۵۳ء کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب شیخ محمد عبداللہ نے یوم جمہوریہ کی سرکاری تقریب میں شرکت کی اس نئی صورت حال نے پردیش کانگرس کمیٹی میں کھلبلی برپا کر دی۔ خواجہ شمس الدین، منوہر ناتھ کول اور دوسرے کئی سرکردہ لیڈر یہ محسوس کرنے لگے کہ سید میر قاسم ہندوستانی مفادات کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ کانگرس کارکنوں پر بھی خوف طاری تھا۔ وہ بھی محسوس کر رہے تھے کہ ان کی چودھراہٹ ختم ہو رہی ہے۔ محاذ رائے شماری

www.taemeernews.com

والے بھی تھک چکے تھے، پاکستان کی دو جنگوں میں شکست اور بنگلادیش کے وجود میں آجانے سے محاذ رائے شماری اس صحیح نتیجہ پر پہنچ گئی تھی کہ رائے شماری کا نعرہ ایک بے مقصد نعرہ ہے۔ شیخ محمد عبداللہ اس صورت حال سے بخوبی واقف تھے لیکن وہ مرکز کے ساتھ گھاٹے کا سودا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ ۱۹۵۲ء کی پوزیشن بحال کرنے پر زور دے رہے تھے۔

سید میر قاسم پر کھلے طور سے تنقید کرنے کی کسی کانگرسی میں جرات تو تھی نہیں کیونکہ اکثر تو وظیفہ خوار تھے اور جو نہیں تھے وہ الجھن میں تھے اس لئے ناراض کانگریسیوں نے پردیش کانگریس کے صدر محمد ایوب خاں پر حملے شروع کیے اور ان پر پارٹی کو کمزور کرنے کی الزام تراشی کی۔ جو کہ بنیادی طور سے سید میر قاسم کی کھلے پن کی پالیسی پر نکتہ چینی تھی۔ میر قاسم نے ایسا داؤ کھیلا کہ ناراض لیڈر ایک ایک کرکے بے نقاب ہو گئے۔ پردیش کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کا ایک اہم ترین اجلاس سرینگر مین بلایا گیا جو کہ تین روز تک جاری رہا۔ میں تینوں روز اس میٹنگ کی کاروائی نوٹ کرتا رہا۔ اس میٹنگ مین محمد ایوب خاں، منگت رام شرما، سید حسین، مفتی محمد سعید، عبدلغنی لون، شام لال صراف، غلام محمد میر بسمن، گرداری لال ڈوگرہ، پنڈت ترلوچن دت، سردار کلبیر سنگھ، نور محمد، بابو پرمانند، خواجہ شمس الدین، منوہر ناتھ کول شریک تھے، چند اور لیڈر بھی تھے لیکن نام ذہن سے اتر گئے ہیں۔ سید میر قاسم نے پہلے ہی روز اپنی سرکار کی پالیسی پر ایک طویل تقریر کی اور صاف طور سے کہا کہ "وہ ریاست میں پرانی تلخیوں کو ختم کرکے ریاست کی تعمیر و ترقی کے لیے ایک پر امن ماحول قائم کرنے کے خواہاں ہیں اور اس مین وہ شیخ محمد عبداللہ کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر مجلس عاملہ کو اس پالیسی سے اختلاف ہے تو وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی موجودگی میں مجلس عاملہ کی میٹنگ بلانے کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر میری لیڈر شپ پر اعتماد نہیں ہے تو میں بغیر کسی، ہچکچاہٹ کے پارلیمانی پارٹی کی قیادت سے استعفا دینے کو تیار ہوں۔ ان کی اس تجویز نے مجلس عاملہ کے ناراض اور مطمئن دونوں گروپوں کو بہ یک زبان کہنے پر مجبور کر دیا کہ مجلس عاملہ ایک بار پھر سید میر قاسم کی قیادت پر غیر متزلزل اعتماد کا اظہار کرتی ہے اور یہ واضح کرتی ہے کہ سید میر قاسم قیادت سنبھالے رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔" میر قاسم نے مجلس عاملہ سے اس طرح کا مینڈیٹ حاصل کر کے اندرونی جنگ میں پہلا مورچہ فتح کرلیا۔ انھوں نے دوسرا پتہ پھینک دیا اور محمد ایوب خاں سے کہا کہ چونکہ مجلس کا خیال ہے کہ کانگرس پارٹی ان کی صدارت میں کمزور ہوئی ہے اس لئے انھیں اپنے عہدے سے دست بردار ہو جانا چاہیئے۔ محمد ایوب خاں بیچارے ایک معصوم ماسٹر جی احتجاج بھی نہیں کر سکے اور علاحدہ ہونے کا اعلان کر دیا اس پر نئے صدر کا انتخاب کا سوال پیش آیا۔ پنڈت ترلوچن دت نے یہ کہہ کر اس تجویز کو رد کر دیا کہ "موجودہ ماحول میں کسی مسلمان ساتھی کو

www.taemeernews.com

ہی صدر بنانا سیاسی دانش مندی ہو گی۔" دوسرا نام تجویز ہوا خواجہ شمس الدین کا۔ قریب قریب اس پر اتفاق رائے کا اظہار ہو رہا تھا کہ پنڈت منگت رام نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ" مجلس عاملہ پردیش کانگرس کمیٹی کا صدر منتخب کرنے کی مجاز نہیں ہے اور پھر مجلس عاملہ نے کیسے یہ طے کر لیا کہ خواجہ شمس الدین بلا مقابلہ کامیاب ہو جائیں گے۔ میں بھی ایک امیدوار ہوں" خواجہ شمس الدین نے جو اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ صدر چنے گئے ہیں نہایت عامیانہ اور بھونڈے ڈھنگ سے منگت رام کو مداخلت کی۔" آپ کیوں اعتراض کر رہے ہیں میں آپ کو جنرل سکریٹری نامزد کروں گا۔ اس پر تھوڑی بہت تلخ کلامی ہوئی۔ لیکن منگت رام اس پر بضد تھے کہ وہ بھی عہدہ صدر کے امیدوار ہیں۔ سید میر قاسم خاموشی سے اپنی حکمت عملی کی کامیابی کی داد دے رہے تھے اور مجلس عاملہ یہ طے نہیں کر پا رہی تھی کہ خواجہ شمس الدین کو صدر بنایا جائے یا نہیں۔ سید میر قاسم نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ جب اس پر اتفاق رائے نہیں ہو رہا ہے تو محمد ایوب خاں کو ہی بدستور صدر کے عہدے پر فائز رہنا چاہیئے۔ جس کی ممبران کی اکثریت نے حمایت کی۔ میر قاسم کا دوسرا داؤ بھی کامیاب رہا۔ انھیں محمد ایوب خاں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ان میں نہ تو تنظیم چلانے کی صلاحیت ہے اور نہ ہی ان کی انفرادی سوچ میں اتنی پختگی ہے کہ وہ پارٹی کو صحیح سمت پر لے جا سکیں، البتہ میر قاسم کے منصوبہ میں محمد ایوب خاں جیسے کمزور مہرے کو اہمیت حاصل تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ پردیش کانگرس ایک متوازی محاذ بنے اور شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ بات چیت میں اڑچن پیدا ہو۔ مجلس عاملہ کی اس میٹنگ میں کئی ڈرامائی نوعیت کے حادثے ہوئے۔ مفتی محمد سعید اور سید حسین ٹکرا گئے۔ سید حسین نے وزارتی گروپ پر نااہلیت اور کرپشن کا الزام لگایا جبکہ مفتی محمد سعید اور عبدالغنی لون نے ان پر اپنے بھائی سید میر قاسم کی پوزیشن کا ناجائز فائدہ اٹھانے کا الزام لگایا۔ سید حسین جن کو یہ غلط فہمی تھی کہ وہ وزیر اعلا کے بھائی ہونے کے ناطے ہر ایک پر حاوی ہو سکتے ہیں اس الزام کو برداشت نہ کر سکے اور مجلس عاملہ سے استعفا دینے کی دھمکی دی۔ البتہ اس دھمکی کا کوئی اثر مجلس عاملہ پر نہیں پڑا۔ ایک موقع پر عبدالغنی لون اور غلام محمد میر سبجن ٹکرا گئے تو دوسرے مرحلہ پر شیام لال صراف کو یہ کہہ کر لون نے خاموش کر دیا کہ" اب تو بوڑھوں کو اس قوم پر رحم کھانا چاہیئے۔" گو مجلس عاملہ میں ایڈمنسٹریشن پر شدید نکتہ چینی کی گئی لیکن سید میر قاسم پہلے سے زیادہ مضبوط ہوئے۔ تین روز کی اس میٹنگ کے بعد میر قاسم سے جب ملاقات ہوئی تو میں نے ان کو خود اعتمادی کے ساتھ یہ کہتے سنا کہ" مجلس عاملہ کے ممبران بیوقوفوں کی دنیا میں رہ رہے ہیں، میں جو کچھ کر رہا ہوں مرکزی سرکار اور مسز اندرا گاندھی کے مشورے سے کر رہا ہوں۔"

www.taemeernews.com

-

www.taemeernews.com

سید میر قاسم ریاست کی سیاسی زندگی کو برسوں کی تلخیوں اور کڑواہٹ سے پاک صاف کرنے کے لئے جس منصوبے کو عملی شکل دینے کی کوشش کر رہے تھے اس منصوبے میں سید میر قاسم کی حیثیت ایک کارگزار وزیر اعلا کی تھی۔ وہ دیانت داری کے ساتھ محسوس کر رہے تھے کہ ۲۲ برسوں کی کشمکش، انتشار اور آپسی لڑائی نے ریاست کی تعمیر و ترقی میں رخنہ ڈال دیا ہے۔ نئی نسل بھی ذہنی انتشار میں مبتلا ہو کر صحیح سمت پر نہیں جا رہی ہے اور اس لئے وہ شیخ محمد عبداللہ کو ریاست کی سیاسی زندگی کو نئی سمت دینے کے لئے قومی دھارے میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ۲۰ برس میں کروڑوں روپئے کی غذائی سبسڈی نے ریاست کو دیوالیہ بنا دیا تھا لیکن سید میر قاسم صفائی سے کہتے تھے۔ "ہم میں سبسڈی ختم کرنے کی جرأت نہیں ہے۔ صرف شیخ محمد عبداللہ ہی اسے ختم کر سکتے ہیں۔" لیکن سید میر قاسم یہ حقیقت سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ شیخ محمد عبداللہ قومی دھارے میں آئیں گے تو اکیلے ہی آئیں گے۔ وہ نئی نسل کو اپنے ساتھ نہیں لا سکتے۔ وجہ یہ تھی کہ ۲۲ برس تک شیخ محمد عبداللہ نے نئی نسل کے ذہنوں میں ہندوستان کے خلاف نفرت کا زہر گھول دیا تھا ہندوستان کو ہندو ریاست قرار دے کر انہوں نے مسلمانوں کو ہندوستان سے دور پھینک دیا تھا۔ محض اپنی انا کی تسکین کے لئے شیخ محمد عبداللہ نے ۲۲ برس تک پوری قوم کو تاریک غار کی طرف دھکیل دیا تھا۔ سید میر قاسم یہ صورت حال سمجھ نہیں رہے تھے جو ان کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ شیخ محمد عبداللہ کو قومی دھارے میں لانا ضروری تھا لیکن عوام کے ساتھ اور ان کے اشتراک سے۔ سید میر قاسم کی تمام تر توجہ مفاہمت پر تھی اور انتظامیہ بے راہ روی کی شکار ہو رہی تھی۔

ماہانہ سرمایہ کاری نے کانگریس کا مفلوج کر دیا تھا۔ ایوب خاں جیسے کمزور اور جی حضور لیڈر نہ نئے حالات کو سمجھ رہے تھے اور نہ ہی ان میں سمجھنے کی صلاحیت تھی۔ ان کی مدد کے لئے منوہر ناتھ کول کو جنرل سکریٹری مقرر کیا گیا لیکن وہ بھی کوئی موثر رول ادا نہ کر سکے کیوں کہ پارٹی سے زیادہ انہیں اپنے مفاد عزیز تھے۔ تھے تو بہت پرانے سیاسی کارکن لیکن ہر دور میں محض ذاتی مفاد کے لئے پینترے بدلنے سے ان کی شخصیت مشکوک بن گئی تھی۔ شاید میر قاسم بھی ایک مضبوط پارٹی کے حق میں نہیں تھے کیوں کہ مضبوط پارٹی ان کے منصوبے میں حائل ہو سکتی تھی۔

www.taemeernews.com

نئی سوچ

باب ۱۲

کبھی کبھی یہ سوال ذہنوں میں کروٹ لیتا رہتا ہے کہ جب سید میر قاسم اور مرکزی سرکار شیخ محمد عبداللہ کو اقتدار میں لانے کو کوشش کر رہی تھی اور شیخ محمد عبداللہ اقتدار سنبھالنے پر آمادہ بھی تھے تو اسمبلی کو توڑ کر شیخ محمد عبداللہ کو چناؤ لڑ کر اسمبلی ممبر منتخب ہونے کا موقع کیوں نہیں دیا گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شیخ محمد عبداللہ کے سیاسی کردار کو دیکھتے ہوئے کوئی بھی ان پر مکمل بھروسہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اگر اسمبلی توڑ کر چناؤ کرائے گئے ہوتے تو شیخ محمد عبداللہ کو یا تو کسی پارٹی کے ٹکٹ پر یا پھر بحیثیت آزاد امیدوار کے چناؤ لڑنا پڑتا۔ لیکن محاذ رائے شماری جو شیخ محمد عبداللہ کی شہ رگ تھی چناؤ میں حصہ نہیں لے سکتی تھی کیونکہ محاذ رائے تو ہند کشمیر الحاق کو نہ تسلیم کرتی تھی نہ ہی وہ آئین ہند کی وفادار تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ شیخ محمد عبداللہ محاذ رائے شماری کے بنیادی ممبر بھی نہیں تھے لیکن محاذ رائے شماری ان کے ہی دم پر عوامی مقبولیت حاصل کر چکی تھی۔ شیخ محمد عبداللہ کو خود بھی نہ تو مرکزی سرکار اور نہ ہی سید میر قاسم پر بھروسہ تھا وہ سمجھتے تھے کہ اگر انھوں نے اسمبلی توڑ کر چناؤ کرانے کا مطالبہ کیا تو اقتدار کی منتقلی ناممکن ہے اور وہ کسی بھی صورت میں اقتدار حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مرکزی حکومت بھی سید میر قاسم کی یقین دہانیوں پر بھروسہ نہیں کرتی تھی وہ کانگریس اکثریت والی اسمبلی کو توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس بات کا واضح اشارہ مرحومہ اندرا گاندھی نے ۱۹۷۵ میں شیخ محمد عبداللہ کی جموں میں تاجپوشی کے بعد جموں کے شاہی محل میں کانگریسی کارکنوں سے خطاب کرتے کہا تھا

To hand over Power to Sheikh Abdullah was as calculated risk.

مرکز کے اس calculated risk کی وضاحت بعد میں کروں گا۔ اس وقت زیر بحث ہے اسمبلی چناؤ۔ یہ چناؤ اس لحاظ سے تاریخ ساز تھے کہ پہلی بار پاکستان نواز جماعت اسلامی کے چند لیڈروں کو اسمبلی چناؤ لڑنے اور کامیاب ہونے کا موقع دیا گیا۔ اکثر اوقات میر قاسم پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے ہی جماعت اسلامی کو عزت کا مقام دیا۔ لیکن یہ الزام بے بنیاد ہے۔ میر قاسم اس حق میں نہیں تھے کہ جماعت اسلامی کو ایسی اسمبلی میں نمائندگی ملے جس اسمبلی کے بل پر شیخ محمد عبداللہ کو اقتدار سنبھالنا ہوگا۔ لیکن مرکزی سرکار کی اپنی پالیسی تھی۔ وہ شیخ محمد عبداللہ پر

www.taemeernews.com

دباؤ برقرار رکھنا چاہتی تھی اور ساتھ ہی یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ جماعت اسلامی جیسی پاکستان نواز جماعت بھی آئین ہند کی وفاداری کا حلف لے کر چناؤ میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ حکومت اور کانگریس نے جماعت اسلامی کی مالی امداد کی اور اس کے امیدوار کامیاب ہوئے حالاں کہ انہوں نے شکست دی صادق صاحب کے وفادار لوگوں کو۔ کافی مدت تک مفتی محمد سعید پر جو کشمیر کے الیکشن انچارج تھے، یہ الزام لگتا رہا کہ انہوں نے جماعت اسلامی کے امیدواروں کو کامیاب بنا کر صادق گروپ کے امیدواروں کو ناکام بنایا۔ مرکز چاہتا تو جماعت اسلامی کا ایک بھی امیدوار کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ پر یہ واضح کرنے کے لئے کہ وہ کشمیری سیاست کے بے تاج بادشاہ نہیں ہیں عوامی مجلس عمل کے میر واعظ مولوی فاروق کو میدان میں اتارا گیا اور ان کی قیادت میں ایک بہت بڑا جلوس نکالا گیا۔ گاندھی پارک میں بہت بڑا جلسہ بھی ہوا جس میں رائے شماری کا مطالبہ دہرایا گیا حالاں کہ خدا گواہ ہے کہ میر واعظ کو رائے شماری سے کچھ بھی لینا دینا نہیں تھا۔ تار کہیں اور سے ہلتا تھا، اشارہ کہیں اور سے ہوتا تھا۔ مولانا ہر اشارے پر ناچنے کے لئے تیار ہوتے تھے مگر بلا معاوضہ نہیں۔ ایک طرف یہ کھیل جاری تھا تو دوسری طرف بیگم شیخ محمد عبداللہ اور ان کے داماد غلام محمد شاہ اقتدار سنبھالنے کے لئے بے تاب تھے۔ وہ شیخ محمد عبداللہ پر بدستور دباؤ ڈالتے رہتے تھے کہ مرکز کا کوئی بھروسہ نہیں کہ کب ارادہ بدل دے اور "ہمیں پھر آوارہ گردی کرنی پڑے۔" نئی دہلی کے کناٹ پلیس میں ایک ٹی ہاؤس ہوا کرتا تھا۔ بیچارہ معصوم غلام محمد شاہ آوارہ گردی کے دن اسی ٹی ہاؤس میں گزارتا تھا۔ ان کے ٹیبل پر اکثر ہپی عورتیں اور ایک کشمیری صحافی برج کشن طفی ہوا کرتے تھے۔ اقتدار کی منزل کبھی نزدیک دکھائی دیتی تھی اور کبھی دور۔ حالاں کہ محاذ رائے شماری کے لیڈروں کے عیش و آرام کے لئے مرکز فراخدلی کے ساتھ سرمایہ میر قاسم کو فراہم کرتا تھا۔ صرف جماعت اسلامی وزارت داخلہ سے فیض یاب نہیں ہو رہی تھی۔ وادی کے ملا، مولوی، اخباروں کے مدیر اور کانگریس کے وظیفہ خواروں کی تو بلاواسطہ طور پر وزارت داخلہ ہی پرورش کر رہی تھی۔ گنگا بہ رہی تھی کس میں ایمان کی پختگی تھی کہ وہ اس نہانے سے انکار کرتا۔

کشمیریوں کو پاکستان کے صحیح حالات سے واقف کرانے اور ہندوستان کے سیکولر جمہوری نظام سے روشناس کرانے کے لئے صادق صاحب کے زمانے میں فیلڈ سروے نام کی ایک تنظیم بنائی گئی۔ اس تنظیم کو سرکاری فنڈ سے رقومات دی جاتی تھیں جن کا حساب کتاب سیکریٹ فنڈ کے اکاؤنٹ میں رکھا جاتا تھا۔ اس تنظیم کے سربراہ جانکی ناتھ زتشی تھے۔ کشمیر کے سرکردہ شاعر غلام رسول نازکی اور سرکردہ ادیب اختر محی الدین بھی اس تنظیم میں اعلا عہدے پر فائز تھے۔ جموں شاخ کے انچارج پنڈت بلدیو پرشاد شرما تھے جو ۱۹۵۳ سے قبل شیخ محمد عبداللہ

www.taemeernews.com

کے پریس ایڈوائزر تھے۔ کانگریس کی اس شکمی جماعت سے سر کردہ صحافی، سیاست داں اور آج اور کل کے معزز لوگ وظیفے حاصل کیا کرتے تھے۔ سید میر قاسم بھی اس تنظیم کو اپنے سیاسی منصوبے کی تکمیل کے لئے استعمال کر رہے تھے۔ بیگ پارتھا سارتھی بات چیت میں کبھی پیش قدمی ہو رہی تھی، کبھی ڈیڈ لاک پیدا ہوتا تھا۔ ڈیڈ لاک ایک ڈھال تھی۔ مرکز شیخ محمد عبداللہ کو اقتدار سونپ دینا چاہتا تھا اور شیخ محمد عبداللہ بھی بے تابی کے ساتھ انتظار کر رہے تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ یہ تاثر نہ پیدا ہو کہ وہ اقتدار کے بھوکے ہیں حالاں کہ ۱۹۷۵ کے بعد انہوں نے جب جموں کے ہوائی اڈے پر اس وقت کی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے سامنے "اندرا گاندھی زندہ باد" کے نعرے بلند کئے تو مجھ جیسا چھوٹا آدمی بھی شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ اقتدار کی بھوک نے شیخ محمد عبداللہ کو عرش سے گرا کر فرشی سلام بجا لانے پر مجبور کر دیا تھا۔ سید میر قاسم بھی جانتے تھے کہ ڈیڈ لاک محض ایک فریب ہے لیکن پھر بھی وہ بیگم عبداللہ اور غلام محمد شاہ کو (دامے، درمے، قدمے، سخنے) خوش رکھ کر شیخ صاحب کو منوانے کی کوششیں جاری رکھتے تھے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ سید میر قاسم ایک سیدھا سادہ انسان ہے وہ بھلا سیاست کی پیچیدگیوں کو کیا سمجھیں۔ یہ ایک غلط احساس ہے۔ سید میر قاسم، لفظ سخت ہے لیکن کہنے میں کوئی تکلیف نہیں کہ ایک شاطر سیاستداں ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کب کس مہرے کو داؤ پر لگانا ہے اور کب کسی مہرے کو بچانا ہے۔ وہ کشمیری عوام اور کانگریسیوں کو اس بات پر تیار کر رہے تھے کہ حالات بدلنے والے ہیں اور اس کے لئے وہ shock therapy کا استعمال کرتے تھے۔ کبھی میرے ذریعے اور کبھی کسی اخبار والے کے ذریعے یہ افواہ اڑا دیتے تھے کہ محاذ رائے شماری کے ایک سر کردہ لیڈر غلام احمد چکن کو وزارت میں لیا جائے گا۔ کبھی یہ خبر اڑا دیتے کہ محمد امین کو وزیر بنایا جائے گا اور کبھی یہ شوشہ چھوڑ دیتے کہ مبارک شاہ جو شیخ صاحب اور بیگم عبداللہ کے بہت نزدیک تھے وزارت میں شامل ہو جائیں گے۔ خبریں گشت کرتی تھیں کانگریسیوں کا ردعمل سامنے آتا تھا اور جب میر قاسم سے پوچھا جاتا تو وہ صاف کہتے۔ "افواہوں کو کیسے روکا جا سکتا تھا۔" لیکن مجھے معلوم تھا کہ خواجہ مبارک شاہ کو وزارت میں شامل کیا جائے گا۔ بارہمولہ میں کانگریسیوں کا ایک جلسہ تھا اور اسٹیج پر اور لیڈروں کے علاوہ مبارک شاہ بھی براجمان تھے۔ کانگریسیوں کے لئے یہ بہت بڑا صدمہ تھا لیکن بارہمولہ کے کانگریسی لیڈر غلام رسول کار جو ہوا کو سونگھنے کے ماہر ہیں مبارک شاہ کو خوش آمدید کہنے میں پیش پیش تھے۔ مبارک شاہ کو کانگریس وزارت میں بطور وزیر صحت شامل کیا گیا اور انہوں نے حلقہ انتخاب ٹنگ مرگ سے چناؤ لڑا۔ بیگم شیخ محمد عبداللہ نے ان کے حق میں تقریریں کیں ان جلسوں میں جو کانگریس کے جھنڈے تلے منعقد ہوتے تھے۔ محاذ رائے شماری سے ناراض ہوئے لیڈر علی محمد نائک اس انتخابی مہم کے انچارج تھے۔ بیگم عبداللہ، اور شیخ محمد

www.taemeernews.com

عبداللہ کی حمایت کے باوجود مقابلہ اتنا سخت تھا کہ کانگریسیوں کو کافی محنت کرنی پڑی مبارک شاہ کامیاب ہو گئے۔

مبارک شاہ کی کابینہ میں شمولیت کے بعد پردیش کانگریس کمیٹی کے لیڈروں میں کھلبلی برپا ہو گئی اور وہ کھلے عام میر قاسم کے خلاف پروپگینڈہ کرنے لگے۔ کئی بار جموں میں پردیش کانگریس کی مجلس عاملہ کی میٹنگ ہوئیں۔ شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ بات چیت کے بارے میں تفصیلی غور و فکر ہوا لیکن کانگریسی مطمئن نہیں تھے وجہ یہ تھی کہ وہ میر قاسم کے اقتدار سے علاحدہ ہونے کی پیشکش سے رنجیدہ ہو رہے تھے۔ وہ خائف تھے کہ اگر شیخ محمد عبداللہ اقتدار میں آئے تو ان کی چودھراہٹ ختم ہو جائے گی اور وہ پھر کبھی واپس اقتدار میں نہیں آئیں گے۔ انہیں خوف تھا کہ شیخ محمد عبداللہ ۱۹۵۲ کے بعد کے سیاست دانوں کی دولت کا محاسبہ کریں گے اور ان کے کردار سے پردہ اٹھا دیں گے حالاں کہ یہ خدشات بے بنیاد تھے۔ شیخ محمد عبداللہ بابائے قوم کے لباس کو تار تار کر کے صرف وزیر اعلا بننے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے ۲۲ برس اقتدار سے علاحدہ رہ کر یہ سبق ضرور سیکھ لیا تھا کہ اقتدار سنبھالے رکھنے کے لئے انکھوں پر پٹی باندھنی پڑتی ہے، کانوں میں روئی دینی پڑتی ہے اور بغیر دیکھے بغیر سنے ہاتھ پاؤں مارنے پڑتے ہیں کانگریسیوں کا ایک گروپ، جو اب بھی درگا پرشاد در کا وفادار تھا، بدستور میر قاسم کے بجائے درگا پرشاد در کے ہی در پر رکھے ہوئے ان کے کھڑاؤں کی پوجا کرتا تھا اور یہ گروپ یہ تاثر دے رہا تھا کہ نئے دور میں وہ شیخ صاحب کا منظور نظر ہو گا۔

لیکن ہوائی قلعے تعمیر کرنے والوں اور آنکھیں بند کر کے چلنے والوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ وہ جب کہ جہلم کا پانی رخ بدل کر شیخ صاحب کی طرف بہ رہا تھا اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ شیخ محمد عبداللہ پھر اقتدار میں آئیں گے۔ سید میر قاسم نے ایک اور پتہ پھینک دیا۔ جموں کے سوئنسر علاقے میں کانگرس کا تربیتی کیمپ لگایا گیا جس میں کانگریس کے صدر دیو کانت برو کے علاوہ وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ نے بھی شرکت کی۔ اس کیمپ میں قاسم مخالف لیڈروں نے اگر کھل کر نہیں تب بھی اشاروں کنایوں میں مرکزی لیڈر شپ کے سامنے یہ بات رکھی کہ ریاست کو تباہ کرنے کے لئے اینٹی انڈیا فورسز کے ساتھ مفاہمت کی جا رہی ہے۔ لیکن سردار سورن سنگھ نے ایک طویل تقریر میں ایک جملے میں یہ مرکزی فرمان سنا دیا کہ "حالات میں بہتری لانے کے لئے قربانیاں بھی دینی پڑتی ہیں اور ہر کانگریسی کو اس کے لئے تیار ہونے چاہئے۔

www.taemeernews.com

-

www.taemeernews.com

۹۔ اگست ۱۹۵۳ء میں شیخ محمد عبداللہ گرفتار ہوئے اور ۲۵ فروری ۱۹۷۵ء کو یعنی ۲۲ برسوں کے بعد انہوں نے اقتدار سنبھال لیا حالاں کہ ان کا اقتدار سنبھالنا ایک غیر جمہوری عمل تھا۔ وہ نہ تو اسمبلی کے ممبر تھے اور نہ ہی قانون ساز کونسل کے۔ اسمبلی میں اکثریت کانگریسی ممبروں کی تھی۔ اپوزیشن ممبروں میں بی جے پی اور جماعت اسلامی کے ممبروں کے علاوہ چند ایک آزاد امیدوار بھی تھے، جو شیخ محمد عبداللہ کی نظریاتی طور پر مخالفت کرتے تھے۔ لیکن اس صورت حال کے باوجود شیخ محمد عبداللہ نے اقتدار سنبھال لیا۔ اگر وہ ایکارڈ پر دستخط کرنے سے قبل اس بات پر زور دیتے کہ اسمبلی کو توڑ دیا جائے، نئے چناؤ کرائیں جائیں اور جس بھی پارٹی کو اکثریت حاصل ہو اس کو اقتدار سنبھالنے کا موقع دیا جائے تو شاید مرکزی سرکار بھی اس مطالبہ کو تسلیم کر لیتی۔ سید میر قاسم بھی اس میں حائل نہ ہوتے، لیکن شیخ محمد عبداللہ اور ان کے خاندان کے افراد میں اقتدار کی ہوس اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ اپنے اصولوں اور نظریات کو بھی قربان کر کے اقتدار حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔ شیخ صاحب کی سوانح حیات آتش چنار کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ شیخ محمد عبداللہ کی سیاسی زندگی میں اصولوں اور نظریات کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ وہ نرگیت کے شکار تھے اور وہ اپنے آپ سے ہی عشق میں مبتلا ہو گئے تھے۔ تنگ نظری اور قدامت پسندی پر انہوں نے کئی خول چڑھا دیے تھے۔ وہ اپنے کسی ساتھی پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ جس کانگریسی کے خلاف انہوں نے تحریک موالات شروع کی، جن کانگرسیوں کو وہ "نالی کے کیڑے" تصور کرتے تھے ان کانگرسیوں کی پیشکش پر انہوں نے اقتدار سنبھال لیا۔ آتش چنار کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ وہ ریاست میں رائے شماری کرانے میں بھی سنجیدہ نہیں تھے۔ اگر ہوتے تو محاذ رائے شماری کے ممبر بنتے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ "حضوری باغ میں جلسہ منعقد ہوا جس میں جے پرکاش نارائن بھی موجود تھے۔ میں نے زوردار لہجے میں حق خود ارادیت کو قوموں کا بنیادی حق قرار دیتے ہوئے کہا کہ آزادی دی نہیں جاتی چھینی جاتی ہے اور نامساعد حالات سے تو نوجوانوں کا حوصلہ پست نہیں ہونا چاہیے۔ جے پرکاش نارائن کو میری یہ تقریر ناگوار گزری لیکن وہ یہاں کے حالات سے واقف نہ تھے۔ ہماری سب سے بڑی ضرورت کشمیر کے لوگوں کا حوصلہ قائم رکھنا تھا۔" اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ رائے شماری کی حمایت صرف لوگوں کا حوصلہ قائم رکھنے کے لئے کر رہے تھے ورنہ انھیں خود بھی یقین تھا کہ رائے شماری ناممکن ہے۔

www.taemeernews.com

تحریک حریت کا پوسٹ مارٹم باب ۱۳

کشمیری مسلمانوں کے ایک حلقہ میں پاکستان کے لئے نرم گوشہ تقسیم ہندوستان سے قبل بھی تھا اور ۱۹۴۷ میں ہندوستان کے ساتھ الحاق کے بعد بھی پاکستان کے لئے یہ حمایت جاری رہی۔ یہ حمایت خالصتاً مذہبی تھی اور اس میں سیاسی نظریات کا دخل نہیں تھا۔ سیاسی اور سماجی طور پر کشمیر کی اپنی ایک علاحدہ پہچان ہے اور وہ کسی بھی صورت میں اس پہچان کو کسی اور پہچان میں ضم کرنے کے لئے نہ پہلے تیار تھا اور نہ اب ہے۔ عام کشمیری اپنی زبان۔ اپنے تمدن اور اپنی روایات پر کسی کے ساتھ سمجھوتا کرنے کے لئے تیار نہیں تھا حالانکہ ۱۹۸۹ کے بعد اس نے اپنے تمدن اور اپنی روایات کے تحفظ کے لئے جنگ شروع ہونے سے قبل ہی ہتھیار ڈال دئے ۱۹۴۷ میں کشمیری مسلمان کی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ تھیں لیکن وہ پاکستان کے ساتھ الحاق کے حق میں نہیں تھا اور نہ ہی آج ہے۔ اگر آج حکومت ہندوستان اعلان بھی کر دے کہ امن کے لئے وہ کشمیر کو پاکستان کے حوالے کرنے پر تیار ہے تو کشمیری اس فیصلہ کی جارحانہ مخالفت کرے گا پاکستان کے ساتھ کشمیر کے تجارتی تعلقات ۱۹۴۷ سے قبل کافی مضبوط تھے لیکن اس کے باوجود کشمیری مسلمانوں نے پنجابی کلچر اور معاشرے میں ضم ہو جانے کی کبھی بھی کوشش نہیں کی۔ کشمیر ہمیشہ سیاسی اور سماجی اعتبار سے باقی دنیا سے کٹ کر رہا اور یہی وجہ ہے کہ ذہنی پسماندگی اور تنگ نظری نے کشمیری کو بانہال پار کی دنیا میں جھانکنے سے روکے رکھا۔ وجہ کچھ بھی ہو کشمیری اپنے تشخص سے محروم ہونے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ہندوستان کے ساتھ الحاق کے وقت شیخ محمد عبداللہ کے ذہن پر کشمیری مسلمان کے تشخص کا سوال خاص اہمیت کا حامل تھا جس کی وجہ سے آئین ہند میں دفعہ ۳۷۰ کا وجود عمل میں آیا۔

اس پس منظر میں تحریک حریت کشمیر کا تجزیہ کرنا نہایت لازمی ہے۔ تحریک میں جموں کے مسلمان لیڈروں نے ایک اہم رول کیا ہے ان لیڈروں میں چودھری غلام عباسی۔ مستری یعقوب علی۔ سردار گوہر رحمان۔ شیخ عبدالحمید ایڈوکیٹ۔ مولوی عبدالرحیم وغیرہ شامل تھے۔ جموں کی غیر کشمیری مسلمان لیڈر شپ میں سر کردہ دانشور۔ شعلہ بیان خطیب اور ذہنی طور سے بالغ لوگوں کی اکثریت تھی۔ شیخ محمد عبداللہ ان لیڈروں سے خایف تھے اور عقل اور دانش میں برتری

www.taemeernews.com

کی وجہ سے شیخ محمد عبداللہ اپنے آپ کو جموں کے مسلمان لیڈروں کے مقابلہ میں پست قد سمجھتے تھے لیکن اسکا احساس نہیں دلاتے تھے کیوں کہ کشمیری مسلمانوں میں وہ بے تاج بادشاہ کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔ اس زمانے میں کشمیری مسلمانوں میں یہ افواہ اڑائی گئی کہ قدرت کا دست شفا شیخ محمد عبداللہ کو حاصل ہے اس وجہ سے چنار کے درختوں کے پتوں پر شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کا نام لکھا ہے۔ کشمیری خود بھی افواہ باز ہیں اور افواہوں پر یقین کرنا انکی عادت ہے۔ مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کا فیصلہ شیخ محمد عبداللہ کا نجی فیصلہ تھا اس میں جموں کی لیڈرشپ کی رائے شامل نہیں تھی۔ خود کشمیر کے شیخ محمد عبداللہ کے اہم ساتھی بھی اس فیصلے سے خوش نہیں تھے لیکن کشمیری مسلمانوں کی اندھی حمایت نے شیخ محمد عبداللہ کو اس حد تک خود سر بنا دیا تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی جماعت کی فیصلہ ساز کمیٹیوں کو دھمکی دیا کرتے تھے کہ اگر میری بات تسلیم نہیں تو میں عوام سے یہ فیصلہ منوالوں گا۔ شیخ محمد عبداللہ کو جموں کی مسلم لیڈرشپ کے ساتھ ساتھ جموں کے مسلمانوں سے بھی کوئی ہمدردی نہیں تھی وجہ یہ تھی کہ شیخ محمد عبداللہ جموں کے مسلمانوں کو اپنا ہمنوا بنا کر کشمیری مسلمانوں کی حمایت سے محروم ہونے پر آمادہ نہیں تھے اور وہ کسی بھی قیمت پر اس حمایت کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔ تحت الشعور پر کشمیریت حاوی تھی۔ اس دور کے چشم دید گواہ کامریڈ کرشن دید سیٹھی نے اپنی خود نوشت میں لکھا ہے کہ " جب جموں سے مسلمان ہجرت کرنے لگے اور ہم نے جیل میں چودھری غلام عباسی اور دوسرے مسلمان لیڈروں سے ملاقات کرکے انہیں ہندوستان میں ہی رہنے پر آمادہ کیا تو میں اور موتی لال بیگڑہ نے شیخ محمد عبداللہ سے ملاقات کرکے انہیں جموں کے مسلمانوں کو پاکستان ہجرت کرنے سے روکنے پر زور دیا اور ساتھ ہی جیل میں بند جموں کے مسلمان لیڈروں کے ساتھ مذاکرات کرنے کی تجویز پیش کی۔ لیکن شیخ محمد عبداللہ نے نہ صرف یہ کہ جموں کے مسلمانوں کی ہجرت کو روکنے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا بلکہ جیلوں میں بند مسلمان لیڈروں کو سرحد پار دھکیل دینے میں مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ سمجھوتا کیا۔ گلگت کے گورنر برگیڈیر گنسارا سنگھ پاکستان جیل میں تھے۔ ان کو چھڑانے کے لئے جموں کے ان نظر بند لیڈروں کا سودا کیا۔

بات ہو رہی تھی تحریک حریت کی۔ تحریک حریت راجواڑا شاہی کو ختم کرنے اور جاگیردارانہ نظام سے آزاد کروانے کے لئے شروع ہوئی لیکن اسنے جو راستہ اختیار کیا وہ خالصتاً فرقہ واریت کا تھا جس کی وجہ سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ مہاراجہ کے خلاف تحریک ہندو فرقہ کے خلاف تحریک ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کی مہاراجہ کے خلاف تحریک مسلم نظریہ سے شروع کرنے کا مقصد شاید کشمیریوں کو فرقہ کی بنیادوں پر تقسیم کرنا نہیں تھا لیکن تحریک کے خدوخال جن زاویوں سے ابھر رہے

www.taemeernews.com

تھے ان سے یہی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شیخ محمد عبداللہ اسلام کو ایک ہتھیار کے طور پر ہندو مہاراجہ کے خلاف استعمال کر رہے تھے یہی وجہ ہے کہ اپنی سیاسی زندگی میں شیخ محمد عبداللہ نے ہمیشہ درگاہ حضرت بل اور متھر مسجد کو ہی سیاسی اغراض کے لئے استعمال کیا۔ جاگیر دارانہ نظام اور راجواڑا شاہی کے خلاف تحریک کوئی مذہبی لڑائی نہیں تھی لیکن اس پر مذہبی لڑائی کا رنگ چڑھا دیا گیا جس سے مسلمانوں میں یہ تاثر گہرا ہوتا گیا کہ مہاراجہ کے خلاف لڑائی اسلامی لڑائی ہے۔

شیخ محمد عبداللہ کا یہ طعنہ کہ کشمیری پنڈت دہلی کے جاسوسوں اور کشمیری مسلمانوں کے خلاف فضتہ کالم کا رول کرتے رہے اسی ذہنیت کو واضح کرتا ہے کہ ان کے ذہن میں کشمیری پنڈتوں کے خلاف کتنی نفرت تھی۔ شیخ محمد عبداللہ اور کشمیری مسلمانوں کو کشمیری پنڈتوں سے زبردست شکایت یہ تھی کہ انھوں نے ۱۹۵۲ کے بعد رائے شماری کی تحریک میں شرکت کیوں نہیں کی۔ لیکن وہ اس بات کو نظر انداز کر رہے ہیں کہ کشمیری پنڈتوں نے اگر حمایت نہیں کی مخالفت بھی نہیں کی۔ وہ مخالفت کر بھی نہیں سکتے تھے۔ ایک مختصر سا مذہبی فرقہ کیسے طوفان کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ اور اگر اس کے باوجود کشمیری پنڈتوں نے ہندوستان کے ساتھ وفاداری کا مظاہرہ کیا تو اس میں کسی کو سیخ پا ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہر ایک کو حق ہے اپنے نظریات پر قائم رہنے کا۔ اور ان نظریات کی کامیابی کے لئے جواز پیش کرنے کا۔ کشمیری پنڈت نے سیاسی سطح پر نہ تو کبھی جن سنگھ کا اور نہ کبھی بھارتیہ جنتا پارٹی کا سیاسی نظریہ اپنایا وہ یا تو نیشنل کانفرنس کی حمایت کرتا رہا یا پھر کانگرس کی۔ اگر انھوں نے جن سنگھ کی بھی حمایت کی ہوتی تو یہ کوئی گناہ نہیں تھا ہر ایک کو اپنے لئے کسی سیاسی پارٹی کا انتخاب کرنے کا حق ہے۔ شیخ محمد عبداللہ نے کشمیری پنڈتوں کو دہلی کا جاسوس تو قرار دیا لیکن ان کے ذہن سے یہ بات اتر گئی کہ اسی کشمیر میں صبح شام ہندوستانی کتوں واپس جاؤ اور پاکستان زندہ باد کے نعرے بھی لگے تھے۔ کیا یہ نعرے بلند کرنے والے پاکستان کے جاسوس نہیں تھے۔ کیا یہ فضتہ کالم کا رول نہیں کر رہے تھے۔ ان حالات میں ۱۹۸۹ میں کشمیر میں مذہبی بنیادوں پر جو شورش شروع ہوئی اس کو ماضی کے حالات اور سیاسی رجحانات سے جوڑنا ضروری ہے جوڑنے سے ہی حالات کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

مہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف تحریک مسلم کانفرنس کے جھنڈے تلے منظم ہوئی اور یہ تحریک محض فرقہ وارانہ بنیادوں پر لڑی جا رہی تھی حالانکہ مقصد راجواڑ شاہی کو ختم کرنا تھا۔ مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدلتے وقت بھی اس طرف توجہ نہیں دی گئی کہ لوگوں کو یہ سمجھایا جاتا کہ لڑائی ہندو راجہ کے خلاف نہیں بلکہ موروثی حکمرانی اور جاگیر دارانہ نظام کے خلاف لڑی جا رہی ہے۔ مسلمان آبادی کو یہ تاثر مل رہا تھا کہ لڑائی ہندو کے خلاف ہے اگر یہ لڑائی کامیاب ہوئی

www.taemeernews.com

توجیت مسلمانوں کی ہوگی ۔ جن انقلابی فیصلوں کا شیخ محمد عبداللہ نے اپنی کتاب میں حوالہ دیا ہے وہ تحریک حریت کشمیری کے مقاصد کے حصول کا معراج تھا لیکن اس پر فرقہ واریت کا لیبل لگ گیا۔ اس سے انکار نہیں کہ ۱۹۴۷ء سے قبل مسلمانوں کے لئے تعلیم حاصل کرنے کے دروازے بند تھے ۔ سودخوار اور بڑے زمیندار اور جاگیرداروں کی اکثریت بھی ہندؤوں کی تھی ۔ غربت ، بھوک اور بیماری سے مسلمانوں کی اکثریت پسماندہ تھی ۔ سرکاری ملازمتوں پر بھی ہندؤوں کا قبضہ تھا لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کئی سرکردہ کشمیری پنڈتوں ،مرحوم جیالال کلم ، شام لال واٹ ،مرحوم درگا پرشاد در ،مرحوم ڈاکٹر ملشن ،مرحوم جانکی ناتھ گکرو ۔ مرحوم پنڈت کشپ بندھو ۔ مرحوم موتی لال مصری ۔ پران ناتھ جلالی ۔ اوم کار ناتھ در ۔ سری کینٹ رینہ ۔ کومین کش تکو ۔ مرحوم پیارے لال کابلو ۔ مرحوم جیا لال تعمیری ۔ ڈاکٹر چکتو ۔ امر ناتھ رینہ ۔ جیسے دوسرے کشمیری پنڈت ان انقلابی اقدامات کے لئے لڑتے رہے اور شیخ محمد عبداللہ نیشنل کانفرنس کی حمایت کرتے رہے ۔ وہ تمام ترقی پسند کشمیری پنڈت جو اس تحریک کی حمایت کر رہے تھے وہ تو اپنے ہی فرقہ میں اچھوت بن گئے لیکن نتائج کی پرواہ کئے بغیر وہ کسانوں ۔ مزدوروں اور محنت کشوں کے لئے لڑتے رہے ۔ لیکن اس کے باوجود یہ بنیادی تاثر ختم نہیں ہوا کہ یہ لڑائی ہندؤوں کے خلاف تھی حالانکہ یہ لڑائی ایک سسٹم کے خلاف تھی

کشمیری مسلمانوں کے لئے شیخ محمد عبداللہ لڑائی کو کشمیریوں تک ہی محدود رکھنے پر بضد تھے اور وہ اس تحریک کو بیرونی اثرات سے پاک رکھنے کی کوشش کرتے رہے ۔ پنجاب کے مسلمانوں میں کشمیری مسلمانوں کے لئے اضطراب پیدا ہو رہا تھا آل انڈیا مجلس احرار نے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے کوششیں شروع کیں وہ شاید اپنی کوششوں میں کامیاب بھی ہو جاتے لیکن شیخ محمد عبداللہ تحریک پر اپنی چودھراہٹ کو اور بیرونی سیاسی اثرات تحریک پر پڑنے سے اپنی اہمیت کو ختم ہوتے دیکھنے کے لئے تیار نہیں تھے ۔ اس لئے احراروں کے ساتھ ایسا سلوک کیا کہ وہ مہاراجہ کے خلاف لڑائی سے کنارہ کش ہوگئے حالانکہ شیخ محمد عبداللہ نے اپنی حکمت عملی پر پردہ ڈالنے کے لئے احراروں کو ہی ذمہ دار ٹھہرایا ہے اپنی سوانح حیات آتش چنار میں احراروں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے "

احرار اور قادیانیوں کی کشمکش

مڈلٹن کمیشن کے سامنے کل ۲۸۴ گواہوں نے اپنے بیانات قلمبند کرائے لیکن مسلمانوں نے اس کمیشن کے ساتھ جو امیدیں وابستہ کی تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں ۔ مسٹر مڈلٹن نے حکام کو

www.taemeernews.com

اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں غفلت کا مرتکب تو قرار دیا مگر انھوں نے ان بد ترین اقدامات کو سند قبولیت عطا کی جو حکومت نے عوامی تحریک کو کچلنے کے لئے اٹھائے تھے۔ اپنے سرکاری کردار کے باوجود مڈلٹن صاحب کے رپورٹ میں کہیں کہیں صداقت کی گونج سنائی دی۔ مثلاً انہوں نے یہ مانتے ہوئے بھی تحریک مسلمان چلا رہے ہیں یہ اعتراف کیا کہ کسی لحاظ سے فرقہ دارانہ نوعیت کی تحریک نہیں ہے۔ مڈلٹن کمیشن کا کام ختم ہوا تو ہم گلینسی کی کاروائی کی طرف لگ گئے۔ اور یہاں بھی مسلمانوں کو اپنا کیس پیش کرنے کے لئے عرق ریزی سے کام کرنے کی ضرورت تھی۔ ہم حقائق کی دستیابی اور ان کی تنظیم و ترتیب میں لگے رہے اور مناسب شہادتیں بھی قلمبند کرتے رہے۔ خود میری شہادت بھی قلمبند کروائی گئی۔ اسی دوران حکومت نے اپنی نیک نیتی کا اظہار کرنے کے لئے متھر مسجد کو مسلمانوں کے حق میں واگذار کرنے کا اعلان کیا۔ متھر مسجد سرینگر کے قلب میں دریائے جہلم کے کنارے خاص تراشے ہوئے کشمیری پتھروں سے بنائی گئی ایک شاندار عمارت ہے جس کو جہانگیر کی مشہور ملکہ نور جہاں بیگم نے تعمیر کیا۔ کشمیر میں بدھ اور ہندو حکمرانوں نے پتھر سے بہت سے شاندار معبد تعمیر کئے۔ جن کے کھنڈر آج بھی اپنے معماروں کی چابکدستی اور کاریگری کے گواہ ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی آمد کے بعد عمارتوں میں چوب کاری کا رجحان بڑھ گیا۔ مسلمانوں نے کشمیر میں پہلا لکڑی کا پل بھی تعمیر کیا۔ اس سے پہلے کشتیوں کو جوڑ کر عارضی پل تیار کئے جاتے تھے۔ بہر کیف متھر مسجد، جسے شاہی مسجد بھی کہا جاتا ہے کشمیر میں مسلمانوں کی پہلی عبادت گاہ ہے۔ جو سب کی سب پتھروں سے بنائی گئی تھی لیکن یہ مسجد اپنی تعمیر کے بعد بہت دنوں تک نماز کے لئے استعمال نہیں کی جاتی تھی۔ ایسا کرنے کے سلسلے میں بہت سی روایات مشہور ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ جب مسجد بن کر تیار ہوگئی تو کسی نے ملکہ نور جہاں سے سوال کیا کہ اس کی تعمیر پر کتنا سرمایہ خرچ ہوا ہے۔ نور جہاں نازو ادا اور زنانہ جاذبیت کا مجسمہ تھی۔ اس نے اپنے غرور حسن میں اپنے شاندار کفش، جس پر لعل و جواہر جڑے ہوئے تھے، کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ جتنی اس جوڑے میں سے ایک کی قیمت ہے۔ نور جہاں اس قسم کی آزاد خیالوں کے مشہور تھی۔ مثلاً ایک مرتبہ عید رمضان کا چاند نظر آنے پر جہانگیر نے نے ساختہ کہا ہلال عید بر اوج فلک ہویدا شد

نور جہاں نے اس ہلال کے تقدس پر کوئی توجہ نہ دی اور برجستہ گرہ لگادی

کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد

اور اس طرح وہ اپنے پیر مرشد کے پاس یہ شعر پڑھتی تھی

چہار چیز کے دل می برد کدام چہار؟

نماز روزہ تسبیح و توبہ استغفار

www.taemeernews.com

مگر جب جہانگیر کی خلوت میں پہونچی تو اس کا یہ حلیہ بگاڑ دیا

چہار چیز کہ دل می برد کدام چہار

شراب و سبزہ و آب رواں و روئے نگار

بہر حال یہ بات عام ہوئی تو مسلمانوں نے اس غرور سلطانی کا یہ جواب دیا کہ اس مسجد میں نماز کے لئے نہ آئے اور بادشاہی سرپرستی کے باوجود یہ غیر آباد اور نمازیوں کے لئے مرثیہ خواں رہی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ کشمیری مغلوں کی بالادستی کو پسند نہ کرتے تھے اور اس لئے یہ ان کی خاموشی مزاحمت کا ایک اظہار تھا۔ یہ مسجد سکھ دور حکومت میں ضبط کر لی گئی اور یہاں گولہ بارود کا ذخیرہ کیا گیا۔ ڈوگرہ حکومت کے دوران یہ دھان اور دوسری اجناس کے گودام کے طور پر استعمال کی جاتی رہی۔ اور یہاں پر ان اجناس کی حفاظت کے لئے ایک پولیس چوکی بھی قائم کی گئی تھی۔ ڈوگرہ حکومت نے اس کو ایک سو سال سے زیادہ عرصے کے بعد واگذار کیا تو مسلمانوں نے اسے اپنی نجات کی پہلی کرن سے تعبیر کیا۔ اس دن سارے شہر مین چراغاں ہوا اور مسجد کے احاطے میں ایک بھاری عوامی جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسے کی صدارت خواجہ سعد الدین شال نے کی اور میرے علاوہ اس میں سید میر ک شاہ اندرابی، مولوی عبداللہ وکیل وغیرہ نے تقریریں کیں۔ بہت جلد اس مقام کو ہماری سیاسی تحریک کے دل کی حیثیت اختیار کرلینا تھی اور یہیں پر مجاہد منزل کی تعمیر شروع ہونے والی تھی۔

ادھر ہم اپنے اندرونی مسائل میں الجھے ہوئے تھے، ادھر سارے ہندوستان اور خاص طور پر پنجاب کے مسلمانوں میں اپنے کشمیری برادران ملت کی ممکنہ امداد کے متعلق اضطراب پیدا ہو رہا تھا ۔ ہم بھی اس وقت مناسب مدد کے انتظار اور استقبال میں تھے۔ آل انڈیا مجلس احرار نے ہماری مصیبت کو اپنی سیاسی دوکان کی رونق بڑھانے کا اچھا موقع خیال کیا۔ اس جماعت کی بنیاد چودھری افضل حق اور ہندوستانی مسلمانوں کے چند سرکردہ عالم رہنماؤں نے ڈالی تھی۔ یہ اصحاب انڈین نیشنل کانگرس سے مختلف اختلافات کی بناء پر علیحدہ ہو گئے تھے۔ مگر ان کو آل انڈیا مسلم لیگ کی سیاست سے بھی کوئی علاقہ نہ تھا بلکہ یہ اس کو مسلمانان ہند کے مفادات کے لیے سم قاتل خیال کرتے تھے۔ مجلس کی صفوں میں رئیس الاحرار سید عطا اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی، مولانا داؤد غزنوی امرتسری، مولانا مظہر علی اظہر، شیخ حسام الدین امرتسری جیسے مشاہیر موجود تھے۔ اور وہی اس جماعت کے روح رواں تھے۔ مجلس اپنے رہنماؤں کی امتیازی حیثیت کے اعتبار سے کافی اہمیت رکھتی تھی۔ لیکن مجلس نے شہید گنج لاہور کے معاملے کے متعلق جو روش اختیار کی تھی اس کی بنا پر اس کی شہرت کو دھکا لگا تھا۔ اب مجلس کے اکابر تحریک کشمیر سے وابستگی ظاہر کر کے اس دھبے کو دور کرنا چاہتے تھے۔ ان کا ایک وفد راجہ ہری کرشن کول کی

www.taemeernews.com

دعوت پر کشمیر آیا اور سرینگر میں راجہ صاحب کی کوٹھی کے نزدیک لال منڈی میں سرکاری مہمانوں کی حیثیت سے ایک سجے سجائے ہاؤس بوٹ میں قیام پذیر ہوا۔ راجہ صاحب کے ساتھ ان کی کئی نجی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان ملاقاتوں میں کیا کھچڑی پکتی رہی اس کا تو علم نہیں ہو سکا لیکن شہر میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں کہ راجہ صاحب کے ساتھ سودے بازی ہو رہی ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ پنجاب میں کشمیر کے معاملے پر حکومت کے خلاف جو آگ لگی ہوئی تھی مجلس احرار اس پر پانی ڈالنے کے لئے اپنی خدمات کسی خطیر رقم کے عوض پیش کرنے پر بھی آمادہ تھی۔ مجلس احرار کو مالی وسائل کی بڑی ضرورت تھی۔ ان کا مقابلہ ایک طرف تو مسلم لیگ کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ سے تھا۔ دوسرے علامہ عنایت اللہ مشرقی کی مجلس خاکساران بھی ان پر بازی لے جا رہی تھی وہ روپے کا ایندھن ڈال کر اپنی جماعت کا انجن چالو کرنا چاہتے تھے۔ اور تمام ہندوستان میں پھیل جانا چاہتے تھے۔ ادھر کشمیر میں راجہ صاحب نے تجوریوں کے منہ کھول دیے تھے۔ اس لئے ہر ضرورت مند طالع آزمائی کے لئے سرینگر پہونچ رہا تھا۔ میری ملاقات وفد کے ممبروں سے ان کے ہاؤس بوٹ میں ہوئی۔ میں نے منہ پھٹ بن کر گلہ کیا کہ ان جیسے اکابرین ملت نے کس طرح سرکاری دعوت پر کشمیر آنا اور پھر حکومت کے لقمے توڑنا گوارہ کیا۔ یہی حکومت ایک طرف تو ان کو ضیافتیں کھلا رہی ہے اور دوسری طرف کشمیری مسلمانوں کے خون کی پیاسی بنی ہوئی ہے۔ میں نے اپنے احراری کرم فرماؤں کو بتایا کہ آپ نے راجہ ہری کشن کول کا مہمان بن کر غلطی کی ہے، عوام کے مہمان بنتے تو آپ کو اس قدر آرام و اسائش حاصل نہ ہوتی۔ لیکن ان کی میزبانی قبول کر کے آپ ان مظلوموں کو جو نفسیاتی سہارا دیتے، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ وفد کے لیڈر چودھری افضل حق نے میری تلخ گوئی پر تیوری چڑھائی اور پھر اپنے زور کلام سے سرکاری مہمان بننے کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میرا دل نہ مانا۔ عوام میں بھی وفد کی نسبت بد گمانیاں بڑھتی ہی گئیں۔ بہر کیف سرینگر میں ہفتہ دس دن گذارنے کے بعد مجلس احرار کے یہ نمائندے واپس چلے گئے۔

میری دوسری گرفتاری کے بعد اکتوبر، نومبر ۳۱ء میں مجلس احرار کا یہ وفد پھر سرینگر آیا۔ بدقسمتی سے اس بار بھی وہ سرکاری مہمانوں کی حیثیت سے ہی آئے۔ اور ان کے قیام و طعام کا انتظام پھر سرکار کے ذریعے سے ہی کیا گیا۔ البتہ اب کی بار ان کا ہاؤس بوٹ دریا کے شمالی کنارے عدالت سے ذرا دور آبی گذرگاہ پر لنگر انداز کر دیا گیا۔ وفد کے ارکان اپنے اوقات کا زیادہ حصہ راجہ ہری کرشن کول کے ساتھ رازو نیاز میں ہی صرف کر دیتے تھے۔ اس طرح سے عوام ان کو اپنے ہمدردوں میں شمار نہ کرنے لگے اور انہوں نے وفد کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ چنانچہ جب میں ایک بار ان سے ملنے کے لئے گیا تو وفد کے ارکان نے شکوہ کیا کہ "جہاں کشمیر کمیٹی کے

www.taemeernews.com

نمائندوں کے پاس عام لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے وہاں ہمیں کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ میں نے جواب دیا کہ " قصور آپ کا اپنا ہے۔ آپ پہلی بار سرکاری مہمان بن کر آئے تو آپ کو علم ہے کہ یہاں لوگوں پر اس کا ایک اثر ہوا۔ پھر آپ کے ہوتے ہوئے سرکار نے یہاں مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی اور آپ بدستور اس کی بانہوں میں بانہیں حمائل کرتے رہے۔ آپ کو تو شہیدوں کے گھر جاکر زبانی ہمدردی کرنے کا خیال بھی نہ آیا۔ حالانکہ سرکاری موٹریں آپ کے انتظار میں کھڑی رہتی تھیں۔ آپ نے حالات کا چشم دید مشاہدہ کرنے کے لیے معمولی زحمت بھی گوارہ نہیں کی۔ آپ پھر سرکاری مہمان ہیں اور ہاؤس بوٹوں میں سرکاری دسترخوان کے چٹخارے لے رہے ہیں۔ تو بھلا عوام آپ کے پاس آئیں تو کیوں؟ حکومت کے گولیوں سے ان کے بے گناہ سینے چھلنی ہو چکے ہیں۔ سرکاری تازیوں نے ان کے جسم کی کھالیں ادھیڑ دی ہیں۔ انہیں بھانت بھانت کے فرضی مقدمات میں ماخوذ کرکے پریشان کیا جا رہا ہے۔ انہیں علاج و معالج کے لئے پیسے کی ضرورت ہے ماہرانہ قانونی مشورے کی ضرورت ہے۔ آپ ان ضروریات میں کہیں بھی ان کی دست گیری نہیں کر رہے ہیں۔ مگر کشمیر کمیٹی اپنے خرچے پر وکلاء بھیج کر ان کی امداد کر رہی ہے۔ مڈلٹن کمیشن کے سامنے اگر کشمیری مسلمان اپنا کیس پیش کر سکے تو کشمیر کمیٹی کی ہی مدد سے۔ اتنا ہی نہیں، کشمیر کمیٹی کے نمائندے شہدا اور قیدیوں کے گھروں میں جا کر اپنی بساط کے مطابق نقد و جنس سے ان کا بوجھ ہلکا کر رہے ہیں۔ اس لیے اگر وہ آپ کے دیوان خانے کو بھول کر کشمیر کمیٹی کے نمائندوں کا دامن پکڑ لیں تو اس میں اچنبھے کی بات کیا ہے؟

کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں رہی

میر سے ان دلائل کا احرار حضرات کے پاس جواب نہ تھا اس لیے مذاق مذاق میں بات کو ٹال گئے۔ لیکن جب وہ لاہور واپس پہنچے تو وہاں ان سے پوچھا گیا کہ آپ کشمیر میں رہ کر کیا کر آئے ہیں اور آپ نے وہاں کے عوام کے لیے کیا کیا ہے؟ اس کا جواب بھلا وہ کیا دیتے۔ لگے بغلیں جھانکنے۔ لیکن اپنی کوتاہیوں اور کوتاہ بینی پر دہ ڈالنے کے لئے انہوں نے یہ کہانی گھڑ لی کہ شیخ محمد عبداللہ احمدی بن گیا ہے اور وہاں سنگین مسئلہ اسی کا ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہو چکا ہے۔ ان ہی دنوں مسلم نمائندگان مہاراجہ کے سامنے اپنے مطالبات کو پیش کرنے کے لیے ایک عرض داشت مرتب کر رہے تھے۔ مجلس احرار کی سیاسی لائن نمائندگان کے اجلاس میں زیر بحث آئی اور مسترد ہوگئی۔ اس کے مقابلے میں یہ عرض داشت کشمیر کمیٹی کے نظریات سے زیادہ ہم آہنگ تھی۔ احراری حضرات اس بات سے بدک گئے۔ اور لاہور جاکر انہوں نے یہ مشہور کر دیا کہ ہم قادیانیوں کے اثر میں ہیں۔ اور کشمیر کمیٹی کے سربراہ

www.taemeernews.com

مرزا محمود احمد صاحب، جو احمدی فرقے کے بانی مرزا غلام احمد صاحب کے پوتے تھے، تحریک کشمیر کو قادیانی عقیدے کا مرکز بنانا چاہتے ہیں۔ احرار صاحبان نے اس بات پر زور دینا شروع کر دیا کہ فتنۂ قادیانیت کے سد باب کے لیے کشمیر کمیٹی کو قادیانیوں سے پاک کیا جانا چاہیے۔ اور کسی غیر قادیانی مسلمان کو کشمیر کمیٹی کی صدارت سونپ دینی چاہیئے۔ احراروں نے قادیانیوں کے خلاف اپنی ساری قوت میدان میں جھونک دی اور بالآخر مرزا محمود کو کمیٹی کی صدارت سے مستعفی ہو جانا پڑا۔ کشمیر کمیٹی کی صدارت کی پیش کش ڈاکٹر سر سید محمد اقبال کو کی گئی جسے انہوں نے کشمیر سے اپنے گہرے شغف کی اور کشمیریوں سے دلی ہمدردی کی بنا پر قبول فرمالیا۔

ذاتی طور پر مجھے مجلس احرار کی روش سے اختلاف تھا اور میں اسے کشمیری مسلمانوں کے مفادات کے لیے خطرناک سمجھتا تھا۔ کشمیری مسلمان اسی تفرقہ بازی کا شکار ہو کر کہیں کے نہ رہے تھے۔ ہم نے خدا خدا کر کے انہیں جزوی وفاداریوں کی سطح سے اوپر اٹھا کر ایک اجتماعی مقصد کے لئے جدوجہد کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ لیکن احرار کی روش سے زخموں کے ٹانکے کھلنے کا امکان پھر پیدا ہو گیا تھا۔ میں عقیدتاً احمدیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس فرقہ کے بنیادی عقائد کا نہ زیادہ علم ہی تھا اور نہ ان سے دلچسپی ہی تھی۔ میری دلچسپی تو مسلمانوں کی شیرازہ بندی کرنے سے تھی۔ تاکہ مشترکہ دشمن کا موثر طور پر مقابلہ کیا جا سکے لیکن بدقسمتی سے احرار کشمیر میں اپنی ناکامی کا سب سے بڑا کارن مجھے سمجھتے تھے۔ اس لیے مجھے اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے انہوں نے مجھے احمدی قرار دے دیا اور پنجاب کے مسلمانوں میں مجھے بدنام کرنے کی کافی کوشش کی گئی۔ روزنامہ "زمیندار" لاہور کے شعلہ بیان اور آتش نگار ایڈیٹر مولانا ظفر علی خان ان دنوں "قادیان کی مادیان" پر زوروں سے قلم کے چابک چلا رہے تھے۔ انہوں نے بھی اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے احرار حضرات کی اچھی خاصی امداد کی۔ ادھر داخلی محاذ پر مولوی یوسف شاہ صاحب نے ان حالات سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ وہ کسی اور طریقے سے مجھے نیچا نہ دکھا سکے تو انہوں نے بھی مجھ پر احمدی ہونے کا الزام عاید کر دیا۔ کچھ نوجوان مجلس احرار کے اثر میں آ گئے۔ جن کی رہنمائی اندر اندر سے مولوی محمد سعید مسعودی، کر رہے تھے۔ خود مولوی سعید کے اپنے نظریات اور طریق کار پر احراری مسلک کی گہری چھاپ تھی۔ اور ان کے کردار کے تجزیے میں اس امر کو بہر حال ملحوظ خاطر رکھا جانا چاہیئے

مجلس احرار نے تمام پنجاب میں کشمیر کے طلسم نما نام پر اپنی تحریک کی کافی آبیاری کی۔ احراریوں نے مظلومین کشمیر کے نام پر کافی رقومات اکٹھا کیں۔ لیکن اس روپیہ کو کشمیر کے اندر خرچ کرنے کے بجائے اپنی تحریک کو تقویت دینے کے لیے استعمال کرتے رہے۔ البتہ اس نے کشمیریوں پر ہو رہے مظالم کی طرف دنیا کی توجہ مبذول کرنے کے لیے کچھ جتھے

www.taemeernews.com

ریاست کے اندر ضرور بھیجے۔ چناچہ ان کی ایک بھاری۔ جمعیت، مولانا مظہر علی کی قیادت میں سوچیت گڑھ کی سرحد کو عبور کرتے ہوئے ریاست میں داخل ہوگئی۔ ریاستی حکومت نے طاقت کے ذریعے مزاحمت کی تو بہت سارے رضا کاروں نے جام شہادت نوش کرلیا۔ لیکن انہوں نے ریاست میں داخل ہو کر ہی دم لیا۔ ان ہی دنوں کی بات ہے کہ احرار نے سوچیت گڑھ میں صرف دو دن کے اندر اندر ایک شاندار مسجد کی تعمیر مکمل کی، جو آج تک مسجد احرار کے نام سے مشہور ہے۔

یہ تو معاملے کا ایک پہلو تھا۔ بہت جلد ہم پر قادیانی حضرات کے اصل مقاصد بھی آشکارا ہونے لگے۔ انہوں نے جب ہماری تحریک کی آڑ میں اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو عام کرنا شروع کیا تو میرے ساتھ کچھ اور ساتھیوں نے اس غلط رجحان پر تشویش محسوس کی اور قادیانی حضرات مجھ سے بھی برگشتہ ہوگئے۔ میری حالت اقبال کے الفاظ میں یوں تھی کہ

اپنے بھی خفا مجھ سے بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

مجھے یاد ہے کہ اپنی شادی کے بعد میں، لاہور میں اپنے سسرال والوں کی کوٹھی واقع مشن روڈ میں قیام پذیر تھا کہ میں نے احمدیوں کی اس بدلتی ہوئی روش پر تبادلہ خیال کرنے کے لیے ایک میٹنگ طلب کی۔ اس میں کشمیر کمیٹی کے دوسرے سربراہ اور دوسرے اشخاص کی مانند مرزا محمود احمد نے بھی شمولیت فرمائی۔ مولانا غلام رسول مہر بھی اس محفل میں شامل تھے۔ میں نے اجلاس میں اپنے خیالات ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ کشمیری مسلمانوں کی حالت زار کی سب سے بڑی وجہ ان کا آپسی تفرقہ ہے۔ کسی قومی تنظیم کی تحریک اور نصرت کے لیے پہلے شرط یہ ہے کہ اس تفرقے کو ختم کیا جائے اور تمام مکاتب خیال کے مسلمانوں کو ایک ہی محور پر جمع کیا جائے۔ اس مقصد کی کامیابی سے تحریک کی کامیابی بھی وابستہ ہے۔ یہ تبھی ممکن ہو سکتا ہے جب ہر مکتب خیال سے وابستہ رہنما یہ طے کرلیں کہ وہ تحریک کے پلیٹ فارم کو اپنے ذیلی عقاید کی تبلیغ کی نشر گاہ نہیں بنائیں گے۔ لیکن کچھ عرصے سے قادیانی عقیدے کے دوستوں نے اس پلیٹ فارم سے اپنے مسلک کو تبلیغ شروع کر دی ہے۔ اگر اس پر روک نہ لگائی گئی تو نتائج بہت تباہ کن ہوں گے۔" مرزا صاحب نے میری تقدیر صبر و سکون کے ساتھ سنی اور پھر بولے کہ "احمدی جماعت بنیادی طور پر ایک تبلیغی جماعت ہے۔ ہم نے پہلے پہل کشمیر میں اس قسم کی سرگرمیوں پر روک لگا رکھی تھی۔ لیکن وہ ایک عارضی مرحلہ تھا۔ ہمارے لئے مستقل طور پر اس کی پابندی کرنا اور اپنے مشن سے دستبردار ہونا ممکن نہیں ہے۔" اس پر میں نے دو ٹوک جواب دیا کہ ایسے حالات میں احمدی جماعت کے ہم خیال کارکنوں کا تحریک وابستہ رہنا نہ مناسب ہے اور نہ ممکن۔ کیوں کہ ان کا تحریک کا جزو بن کر تبلیغی سرگرمیوں

www.taemeernews.com

میں مصروف رہنا کانفرنس میں فرقہ واریت کے شعلے بھڑکا سکتا ہے۔ جن میں ہمارا سارا حاصل خاکستر ہو کر رہ جائے گا۔ اس دن کے بعد ہی سے احمدی جماعت کا رویہ تحریک کے ساتھ پہلے پہل سرد مہری کا رہا، بعد میں وہ ہماری مخالفت کرتے رہے اور آخر کار کھلم کھلا ہمارے خلاف صف آرا ہو گئے۔ ہماری تحریک سے مولوی عبداللہ وکیل، خواجہ غلام نبی گلکار اور دوسرے کچھ اہم ساتھیوں کی علحدگی کی بنیادی وجہ یہی تھی۔ خواجہ غلام نبی گلکار کی علحدگی تو ذاتی طور پر میرے بے حد تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ وہ میرے ہم سن تھے اور میرے اولین رفیقوں میں سے ایک۔ پڑھے لکھے بھی تھے لیکن اس سے بڑھ کر یہ کہ بڑے باہمت، حوصلہ مند اور جری تھے۔ تھے تو بڑے پر خلوص لیکن قادیانی عقیدے کی وجہ سے سیاسی مسائل پر ان کی ہی رہنمائی قبول کرتے تھے۔ ان کو قوم کی زبوں حال کا بڑا احساس تھا۔ اور ان کا زرخیز دماغ لمبی چوڑی اور دراز کار اسکیموں کا تانا بانا بنتا رہا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ لیکن وہاں بھی اپنے وطن مالوف (کشمیر) کے متعلق حکومت پاکستان کی پالیسی سے نالاں رہے۔ وہ جموں کشمیر کے لیے مکمل آزادی کو بہترین حل سمجھتے تھے۔ آخر کار یہ سرفروش محب وطن اپنے دل میں کشمیر کی یاد بسائے پاکستان میں ہی راہی ملک بقا ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا جسد خاکی لحد میں بھی مادر کشمیر کے آنچل میں پہونچنے کے لیے بے قرار ہو گا۔

احمدیوں کے ساتھ کنارہ کشی کے سلسلے میں مجھے ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے۔ جس سے ان کی روش کا اندازہ ہو سکے گا۔ ایک بار ہمیں جماعت احمدیہ نے کسی تقریب کے سلسلے میں بڑے اصرار سے قادیان بلایا۔ ان دنوں زین العابدین صاحب ان کے امور خارجہ کے نگراں تھے۔ ہم ان کے مہمان تھے۔ ایک بار باتوں باتوں میں انہوں نے کہا کہ غیر احمدی تو احمدی امام کے پیچھے نماز ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن احمدیوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی غیر احمدی کے پیچھے نماز پڑھیں۔ میں نے جب وجہ جاننا چاہا تو وہ کچھ رازداری کے سے لہجے میں بولے کہ احمدی مرزا غلام احمد صاحب کو ہی نبی مانتے ہیں اور جو ان پر ایمان نہ لائے اسے خارج از اسلام سمجھتے ہیں۔ ان حالات میں ہم کیسے کسی غیر احمدی کے مقتدی بن سکتے ہیں؟ ان کی اس صاف گوئی سے میری آنکھوں پر سے پردہ سا ہٹ گیا اور ان کی نیت اور حکمت عملی کا سارا راز فاش ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ ہمارے درمیان راستوں کی علحدگی ٹالی نہیں جا سکتی تھی۔'

کشمیری کو ایک تنگ تاریک دائرے میں قید رکھنے کی شیخ محمد عبداللہ کی اس پالیسی کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کے بعد بھی ۱۹۶۵ تک کسی قومی سیاسی پارٹی نے اپنی سرگرمیاں کشمیر میں شروع نہیں کیں۔ اسے قومی مسئلہ قرار دے کر اسے بیرونی اثرات سے دور رکھنے کی کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب بھی رہے۔ مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں

www.taemeernews.com

تبدیل کرنے کے باوجود بھی شیخ محمد عبداللہ کی سوچ میں وسعت پیدا نہیں ہوئی۔ ان کے ذہن پر ہمیشہ درگاہ حضرت بل سے سیاسی لڑائی لڑنے کا جذبہ سوار رہا جس سے وہ ہمیشہ ایک تنگ دائرے کے اندر ہی قید رہ کر اہم فیصلے لیتے رہے۔ ۱۹۴۷ کے بعد انھوں نے دور رس نتائج کے کئی انقلابی قدم اٹھائے لیکن انقلابی اقدام کے بارے میں بھی تاثر یہی تھا کہ یہ ہندوؤں کے مفادات کو ذک پہنچانے کے لئے کئے جا رہے ہیں حالانکہ ان اقدامات کی پس پردہ ٹھوس سماجی اور سیاسی نظریات کو دخل تھا۔ نیا کشمیر کا پروگرام تو کمیونسٹ دانشوروں کی دانشورانہ صلاحیتوں کا نتیجہ تھا لیکن ان پروگراموں کو کامیاب بنانے کے لئے اسلام کا ہتھیار استعمال کیا۔ انقلابی اقدامات کا ذکر کرتے ہوئے شیخ محمد عبداللہ لکھتے ہیں کہ"

انقلابی آفریں اقدمات

جوں ہی محاذ جنگ پر توپوں کی گرج دھیمی پڑنے لگی، ہمیں اپنے خوابوں کے نقوش ابھارنے کی امنگ نے آن لیا۔ ریاستی عوام کی مظلومی اور محکومی کا سب سے بڑا نشان ہمارا دہقان تھا۔ اس کے دست دولت آفرین دن رات فرہاد کی طرح جوئے شیر کاٹتے رہے۔ لیکن جب اس کے خوشوں کا کندن اس کے کھیتوں میں جھلملانے لگتا تو جاگیردار اور چکدار اس کو سال بھی کی محنت سے محروم کر کے فاقہ کرنے کے لئے چھوڑ دیتا۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے دیہات کے اکثر کسان جاڑوں میں اپنا پیٹ پالنے کے لئے پہاڑوں اور میدانوں کا رخ اختیار کرتے اور وہاں خون پسینہ ایک کر کے چند لقمے حاصل کرتے۔ چنانچہ ہم نے اس ناسور کی جڑ کاٹنے کے لئے زمینی اصلاحات کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ ہم نے "نیا کشمیر" کے آئینی اور اقتصادی منصوبے میں کاشتکار کو زمین کا مالک بنانے کے متعلق جو خاکہ پیش کیا تھا اب اسی مین رنگ بھرنے لگے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ایک سو بیاسی کنال یا سوا بائیس ایکڑ سے زیادہ اراضی کوئی شخص اپنی ملکیت میں رکھ نہیں سکتا باقی زمینیں اسے اپنے کاشتکاروں کے نام بلا معاوضہ منتقل کرنا ہوں گی۔ اس طرح سے ۳۹۶ بڑی جاگیریں تحلیل کر دی گئیں۔ نو ہزار سے کچھ زیادہ مالکان کی ساڑھے چار لاکھ ایکڑ زمین کی ملکیت زائل کر دی گئی۔ جس سے کوئی ڈھائی لاکھ کاشتکاروں کو زمین کے مالکانہ حقوق حاصل ہو گئے۔ البتہ باغات اس حکم سے مستثنی رکھے گئے۔ ان اصلاحات کی انقلاب آفریں نوعیت کو سمجھنے کے لئے کشمیر میں مہاراجہ کے خاص حقوق پر نظر ڈالنا ضروری ہو گی۔ جب ۱۸۴۶ء میں بیع نامہ امر تسر کے ذریعہ انگریزوں نے کشمیر کو مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کر دیا تو اس وقت ریاست کی ساری زرعی آراضی بھی مہاراجہ کی ملکیت قرار دی گئی۔ چنانچہ اس بنا پر اس وقت سے وادی کی

www.taemeernews.com

ساری زرعی زمین فرمانروائے وقت کی ملکیت قرار دی جاتی رہی۔ یعنی جو مہاراجہ تخت نشین ہوتا تھا وہ اس کا مالک بن بیٹھتا تھا۔ بعد میں مہاراجوں نے اپنے جابرانہ نظام حکومت کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے رشتہ داروں، مصاحبوں، حاشیہ نشینوں، منظوران نظر اور وظیفہ خواروں کو بڑی بڑی جاگیریں اور چک عطا کئے۔ جن کا مالیہ وغیرہ تو کاشتکار کو بھرنا پڑتا تھا۔ لیکن اسے کمائی کا صرف چوتھائی حصہ ملتا تھا۔ چنانچہ اس صورت حال کی سفاکی کو ابھارنے اور عوامی جذبات کی ترجمانی کرنے کے لئے میں تحریک کے دوران اکثر جلسوں میں اقبال کا یہ شعر گنگناتا رہتا تھا۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلادو

بعد میں ۱۹۳۱ء کی تحریک کے نتیجے میں جب گلینسی کمیشن قائم ہوا تو ہم نے اس کے سامنے مطالبہ رکھا کہ زمین کو کسان کی ملکیت قرار دیا جائے۔ اس کمیشن کی سفارشات پر کسانوں کو کچھ سہولیات ملیں۔ لیکن مجموعی حیثیت سے صورت حال علامہ اقبال کے اس فرمودہ کو دہرا رہی تھی۔

از جفائے دہ خدایاں کشت دہقانان خراب۔ انقلاب، انقلاب، انقلاب، اے انقلاب

کشمیر ایک زرعی ملک ہے، جہاں نوے فیصدی لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ یہاں کی زمینوں کو حکمراں طبقے نے اکثر جاگیروں میں بانٹ رکھا تھا۔ بعض جاگیردار صاحبان کو ابھی یہ معلوم نہ تھا کہ ان کی زمینیں کہاں واقع ہیں اور کس طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کا کام تو یہ تھا کہ جب اناج کاشتکار کے خون سے سیراب ہو کر پک جاتے تو وہ اپنے کاردار کو اس کے سر پر یم راج کی طرح بھیج دیں۔ اور پیداوار کے بیشتر حصے کو کوہسار (گودام) میں ڈال کر اس پر اپنا قفل چڑھا دیں۔ صورت حال یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اگر کاشتکار کے کسی چھوٹے بچے کا دل مچل جاتا اور وہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے مکی کا ایک بھٹہ کھیت سے نکالتا اور کاردار کی نظر اس پر پڑتی تو غضب ٹوٹ پڑتا۔ کاردار نہ صرف اسے مار مار کر ادھ موا کر دیتا بلکہ اس کے منہ سے مکی کے چبائے ہوئے دانے بھی باہر اگلوا کے ہی دم لیتا تھا۔ کاشتکار کو مشکل سے تین چار مہینے کی روٹی ملتی باقی کے لئے وہ جاگیردار کے دروازے پر دم بلاتا رہتا یا منجاب کی خاک چھانتا اور بعض اوقات اس صحرا نوردی میں فاقہ مستی کی موت مر جاتا۔ ایسے بہت سے کم نصیبوں کی زندگی کی شام لاہور، امرتسر یا راولپنڈی کے کسی گلی کوچے میں ہو جاتی۔ جب میں لاہور میں زیر تعلیم تھا کبھی کبھی یہ کشمیری بھیک مانگنے کے لئے میرے ہوسٹل میں بھی آیا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے ایک ایسے ہی کشمیری سے پوچھا کہ تم جو دن بھر محنت مزدوری کرتے اور کماتے ہو پھر شام کو کیوں بھیک مانگتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے دن بھر کی محنت کے بعد دو سے تین روپے تک ملتے

www.taemeernews.com

ہیں۔ وہ میں پیٹ کے ساتھ باندھ کے رکھتا ہوں تا کہ وطن واپسی پر مالیہ ادا کر سکوں اور ہو سکے تو کچھ کپڑے لتے اپنی بیوی بچوں کے لئے لے جاؤں۔ ان بیچاروں کی حالت زار پر رحم کھانے کی بجائے پنجاب کے لوگ انہیں حقارت کے ساتھ "ہاتو" کہہ کر پکارتے۔ وہ انھیں باربرداری کے حیوان سے زیادہ حیثیت نہ دیتے تھے۔ بہت کم لوگ تھے جو ان کی بپتا سے متاثر ہوتے تھے۔ علامہ اقبال نے شاید اسی حالت زار سے متاثر ہو کر فرمایا تھا

بہ ریشم قبا خواجہ از محنت او
نصیب تنش جامہ تار تارے

یا ابوالاثر حفیظ جالندھری پکار اٹھے تھے شیر سے محروم ہے مالک ہے جو ئے شیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے اجارے ختم کرنا ان سے کسی معاوضے کے بغیر میں چھین لینا اور پھر اسے ان بدنصیب لوگوں کے حوالے کرنا ایک دلیرانہ ہی نہیں بلکہ جان جوکھوں کا کام تھا۔ ہندوستان میں سالہا سال بعد تک بھی اس قسم کا قدم اٹھایا نہیں جاسکا۔ ہم پر کئی اطراف سے سخت نکتہ چینی کی گئی لیکن ہم حق بجانب تھے۔ اس لئے ہم نہ ڈرے اور نہ دبے۔ ہم نے معاوضے کا مطالبہ کرنے والوں سے کہا کہ زمینوں کے اصل مالکوں سے زمین زور زبردستی چھین لی گئی۔ اور جاگیروں اور چکوں میں بانٹ دی گئی تھی لہذا ان سے معاوضے کا مطالبہ کرنا نہ منصفانہ ہے اور نہ معقول۔ جن لوگوں نے یہ زمین مہاراجے کی جی حضوری کر کے حاصل کی تھی اور کاشت کاروں کی محنت سے عالیشان محلات کا اینٹ گارا اٹھایا تھا ان کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کے اصل مالکوں سے ان کا معاوضہ مانگیں۔ معاوضے کا اگر کوئی حقدار ہے تو وہ کاشکار ہے جس کو ایک صدی سے دو ہاتھوں سے لوٹا گیا ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ ہم اتنے لائیں کہاں سے جن سے ہم جاگیرداروں اور زمینداروں کی لبالب بھری ہوئی تجوریوں میں اور اضافہ کر دیں؟ ہم نے "نیا کشمیر" کا منشور پیش کر کے اپنا عندیہ بہ خوبی واضح کر دیا تھا کہ اگر کبھی نیشنل کانفرنس اقتدار میں آ گئی تو ہم کاشکاروں کو بلا معاوضہ زمین واپس لوٹا دیں گے۔ اور جاگیرداری اور چکداری کا خاتمہ کر چھوڑیں گے۔ اس لئے ہم نے پہلے ہی عوام اور استحصالی طبقوں کو ان اصلاحات کے لئے ذہنی طور پر تیار کر رکھا تھا۔ لیکن ہندوستان میں ابھی اس قسم کی کوئی سوچ نہیں ابھری تھی۔ اس ریاست کے، استحصالی طبقے اور مرکز میں ان کی پیٹھ ٹھونکنے والوں نے ہماری ان اصلاحات کو پسند نہیں کیا۔ سردار پٹیل نے خاص طور پر اس کی مخالفت کی۔ اس مخالفت کا ایک بڑا کارن تھا کہ ریاست کے ہندو جاگیرداروں نے ان کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ ہم سب کچھ مذہبی تعصب کی بنا پر کر رہے ہیں۔ کیوں کہ ان اصلاحات کی زد زیادہ تر غیر مسلم جاگیرداروں پر پڑتی

www.taemeernews.com

ہے۔ میں نے سردار کو عداد و شمار کے آئینے دکھا کر یہ اطمینان دلانے کی کوششیں کیں کہ ہندو اور مسلمان کا کوئی سوال اس معاملے میں نہیں آتا۔ میں نے انھیں بتایا کہ ہندو جاگیرداروں کے دوش بدوش مسلمان جاگیردار بھی ان کی زد میں آتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھانے والوں میں ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں۔ لیکن سردار کی ضد راج ہٹ کے مانند تھی اور برابر ان اصلاحات کی مخالفت کرتے رہے البتہ جواہر لال اور مولانا ابوالکلام آزاد ان اصلاحات کو پسند کرتے تھے اور ان کے حق میں تھے۔ مقام شکر ہے کہ ہم ابھی ہندوستان کے آئین کے بندھنوں اور موشگافیوں میں اسیر نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے ہم مرکز کی رضامندی کے پابند نہیں تھے۔ میں نے لال چوک کے ایک بڑے اجتماع میں اس فیصلے کا اعلان کیا اور زرعی اصلاحات نافذ ہوگئی ان کے نفاذ سے لکھوکھا مظلوم اور بے سہارا کاشکاروں کی غلامی کی زنجیریں آن واحد میں کٹ کر رہ گئیں۔ رات کو جو کاشکار غلام کی حیثیت سے سو گیا تھا، صبح کی پہلی کرن کے ساتھ اس اپنے آپ کو زمین کے مالک کی شکل میں پایا۔ بہت سے کاشکاروں پر ایسی ذہنی کیفیت طاری رہی کہ انھیں کئی دن تک باور نہ آیا کہ ایسا بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کے علاوہ پاکستان میں بھی یہ اپنی نوعیت کا بڑا ہی عہد آفریں تجربہ تھا۔ ان اصلاحات پر عمل درآمد کرنا بھی ایک مشکل مرحلہ تھا۔ میری کابینہ کے چند ساتھیوں نے اس سلسلے میں لیت ولعل اور ٹال مٹول کی پالیسی اپنائی۔ لیکن میں نے ان کو عملی جامہ پہنانے کا پکا ارادہ کرلیا تھا۔ اس لئے میں مضبوطی سے قدم اٹھاتا گیا اور حق یہ ہے کہ مشیر مال کی حیثیت سے مرزا محمد افضل بیگ نے بھی اس سلسلے میں قابل تعریف کام کیا۔ کشمیر میں سود خواروں، وڈداروں، اور مہاجنوں کے علاوہ حکومت نے ایسے قرضوں میں دیہاتوں کو بال بال جکڑ رکھا تھا۔ جو ہر سال ادائیگی کے بعد سود مرکب کے طفیل پھر اپنی اصل حد تک آجاتے تھے۔ کئی صورتوں میں قرضہ لینے والوں نے اصل رقم سے کئی گنا زیادہ رقم ادا کی تھی مگر پھر بھی ان کے سر پر قرضے کی تلوار لٹکی رہتی تھی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ اگر مقروض نے اصل رقم سے ڈیڑھ گنا زیادہ بطور اقساط نقدی و جنسی ادا کر دیا ہو قرضہ کالعدم تصور کیا جائے گا۔ ان اصلاحات کو عدالتوں کے دائرے سے باہر رکھا گیا اور ڈبٹ ریکونسلیشن بورڈ DEBT RECONCILATION BOARD مقرر کرکے ان کا فیصلہ اس کے دائرہ اختیار میں رکھا گیا۔ ان بورڈوں میں کوئی وکیل پیش کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی تھی تاکہ قانونی گورکھ دھندوں میں انصاف کو الجھا کر فیصلے کو طوالت کی نذر نہ ہونے دیا جائے۔ جس حوصلے اور ولولے کے ساتھ میں نے ان اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے میں تعجیل کی اس کو دیکھتے ہوئے یہ بات فطری تھی کہ بعض استحصالی عناصر میرے دشمن بن جائیں۔ لیکن ایسا ہونا میرے لئے کوئی اچھنبے کی بات نہیں تھی۔ ان عناصر کا جال سرینگر اور جموں سے ہوتا ہوا

www.taemeernews.com

دہلی تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ لوگ دہلی میں بیٹھے ہوئے ارباب اقتدار کے کانوں میں میرے خلاف زہر گھول دینے میں اور بھی زیادہ سر گرم ہو گئے۔ اور مجھے ایک فرقہ پرست کے روپ میں پیش کرنے کے لئے نئے نئے سوانگ رچاتے رہے۔ سردار پٹیل کی کوٹھی ایسے عناصر کی آماجگاہ بن گئی اور مجھ پر ان کی تیر اندازی کی کمیں گاہ۔

بیگار ریاست میں ایک ایسی بدعت تھی، جس نے شہر و دیہات میں وحشت کا عالم طاری کر دیا تھا۔ اس ظالمانہ رواج کی نذر ہزاروں کشمیری اسکردو، بھونجی، اور لداخ کے دشوار گذار علاقے میں ہو گئے تھے۔ اور اس سے نجات حاصل کرنا انھیں ناممکن نظر آتا تھا۔ میری حکومت نے نہ صرف بیگار کا خاتمہ کر دیا بلکہ اسے غیر قانونی بھی قرار دیا۔

میری ایک اور بد قسمتی یہ تھی کہ کشمیر سب سے پہلی ریاست تھی جہاں میں نے موروثی حکمران کے خلاف ۱۹۳۱ء میں تحریک شروع کی تھی۔ اتفاق سے یہاں کا راجہ ہندو تھا۔ اس لئے کشمیر کو نہ معلوم کس پیمانے سے ہندو ریاست سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ یہاں پچاسی فیصد سے زیادہ آبادی مسلمانوں کی تھی۔ کوئی تحریک جو صحیح معنوں میں عوامی تحریک ہوتی، مسلمانوں کی شمولیت کے بغیر نہیں چل سکتی تھی۔ لہذا مہاراجہ اس کے حواریوں اور بھائی بندوں نے ہماری تحریک کو فرقہ پرستی کا نام دے کر بدنام کرنا چاہا۔ چونکہ کشمیر میں سوڈیڑھ سو سال غیر مسلم حکمران برسر اقتدار رہے تھے لہذا مسلمانوں کی حالت ایک محکوم، مقہور اور مظلوم طبقے کی سی تھی۔ ان کو جملہ حقوق سے محروم رکھا گیا تھا۔ حکومت کے نظم و نسق میں ان کا تناسب صفر کے برابر تھا۔ تعلیم میں وہ سب سے زیادہ پسماندہ تھے۔ اور تجارت میں بھی وہ پچھڑے ہوئے تھے۔ الغرض ان کی حالت گونگے اور بے زبان مویشیوں سے بہتر نہ تھی اور سر البین بینرجی نے ان کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ ہو بہو درست تھا۔

اس لئے جب ملک آزاد ہوا اور ہم نے حکومت سنبھالی ہو مسلمانوں کے پسماندہ طبقوں کی حالت کو بہتر بنانا ہمیں انصاف و مساوات کا منطقی اور منصفانہ تقاضہ معلوم ہوا۔ لیکن ہندو طبقے کے لوگ، جو حکومت پر چھائے ہوئے تھے، اس تبدیلی کو اپنی اجارہ داری پر حملہ تصور کرنے لگے۔ انھیں اپنے موقف کی کمزوری کا احساس تھا۔ اس لئے ذہنوں میں انتشار پیدا کرنے کے لئے انھوں نے بے تحاشہ شور مچانا شروع کر دیا تا کہ اس گڑ گڑاہٹ میں اصل مسئلے کے خدو خال چھپ جائیں۔ انھوں نے بڑے رنگ آمیزی کے ساتھ اس تبدیلی کے اثرات اور حقائق کو پیش کرنا شروع کیا۔ چنانچہ سردار پٹیل نے کئی بار اس بارے میں ہم سے استفسار کیا۔ جب ہم نے ریاست کے مختلف محکموں میں کام کرنے والے ملازموں کے اعداد شمار اور ان میں مختلف فرقوں کے لوگوں کا تناسب الگ الگ کر کے انھیں دکھایا تو وہ سناٹے میں آ گئے۔ وہ بولنے لگے کہ شکایت تو

www.taemeernews.com

مسلمانوں کو ہونی چاہیے تھی لیکن سر اٹھاتے ہیں ہندو لوگ۔ میں نے جواب میں کہا کہ شاید اپنی جگہ سمجھتے ہیں کہ مرکز صرف ان کے حقوق کی حفاظت کے لئے ہے اور مسلمان کے لئے اس کے دل اور دروازے دونوں بند ہیں۔ سردار یہ سن کر صرف مسکرا کر رہ گئے۔

جہاں تک ملازمتوں کے شعبے کا تعلق ہے۔ مسلمانوں کا تناسب آج بھی ان کی آبادی کے توازن سے بہت کم ہے۔ یہ عدم مساوات ان محکموں میں ہی نمایاں ہے جو براہ راست مرکز کے ماتحت ہیں۔ حالانکہ ہندوستان کی سیکولر شبیہ کے لحاظ سے انھیں سیکولرزم کا کا جھروکا درشن SHOW WINDOW ہونا چاہیے تھا۔ لیکن حالات میں کسی بہتری کے آثار نظر نہیں آتے۔ حالانکہ ہم بار بار مرکزی حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کراتے رہتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ریاست کے مسلمانوں کے لئے یہ بات مشکل بن جاتی ہے کہ وہ ہندوستان کے سیکولرازم دعووں پر اعتماد کر لیں۔ وہ جب بھی دعوی اور عمل میں زمین و آسمان کی تفاوت پاتے ہیں تو ان کی نفسیات میں کچھ ایسی گرہیں پڑ جاتی ہیں جو قومی احساس کے لئے ہر گز مفید اور معاون نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دعوے اور عمل کا یہ فرق ہندوستانی راہنماؤں کا سب سے بڑا المیہ رہا ہے اور انھوں نے کئی بار خود بھی اس مہلک عواقب کا اعتراف کیا ہے۔

ایک اور انقلاب آفریں اقدام جس نے ہماری تحریک کے مقاصد کو سر خرو کیا، لیکن میرے دشمنوں کی صفوں میں کئی گنا اضافہ کر دیا، کشمیر کے موروثی راجواڑے کا خاتمہ تھا۔ ہم نے ایک سو سال سے زیادہ عرصے کے بعد ڈوگرہ خاندان کے چنگل سے کشمیر کو چھڑا لیا تھا۔ جس کی زیادتیوں نے کشمیریوں کو غلاموں سے بدتر حالات سے دوچار کر دیا تھا۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء کے اس دور کی کچھ اہم کامیابیوں کا ایک مختصر سا خاکہ یہ ہے۔

(۔ موروثی حکمرانی کا خاتمہ کیا گیا۔ ریاست کے آئینی سربراہ کی تقرری چناؤ کے ذریعہ کرانی طے پائی۔ چنانچہ ماہرین نے کشمیر کو بجا طور پر وفاق کے اندر وفاق REPUBLIC WITHIN A REPUBLIC سے موسوم کیا ہے۔ ہری سنگھ کشمیر کو چھوڑ کر ایسے چلے گئے کہ پھر انھیں یہاں کا رخ کرنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔

ب۔ ریاست کے جاگیرداروں کی جاگیریں ضبط کر کے زمین کسانوں میں تقسیم کر دی گئی اور جاگیرداروں وغیرہ کو کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا گیا۔ سالہا سال کے قرضے معاف کر دیئے گئے۔

ج۔ کشمیر میں پہلی یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ سرکاری بجٹ کا ۲۵ فیصد حصہ تعلیمی اخراجات کے لئے وقف کر دیا گیا۔

(د) کشمیر میں چار صدیوں کے بعد کشمیریوں پر مشتمل فوج نیشنل ملیشیا کا قیام عمل میں

www.taemeernews.com

لایا گیا اور انھیں اسلحہ رکھنے اور استعمال کرنے کی اجازت دی گئی۔

(س) ریاستی انتظامیہ میں پہلی بار ریاستی باشندوں کو کلیدی عہدوں اور گزٹیڈ اسامیوں میں بڑا حصہ ملا۔ جن میں مسلمانوں کی ایک اچھی تعداد بھی شامل تھی۔ انھیں ۱۸۱۹ء میں یعنی کشمیر میں سکھ شاہی کے آغاز سے خال خال ہی کسی اہم اسامی پر تعینات کیا جاتا تھا

(ش) کشمیر زبان اس کے لئے اس کے مخصوص لہجے اور ضروریات کے مطابق ایک الیسار سم الخط اختراع کیا گیا جو ٹائپ میں آسکتا تھا اور اسکولوں میں کشمیری اور ڈوگری زبان میں تعلیم کا آغاز کیا گیا۔ ۱۹۵۳ء کے بعد یہ اقدام بھی نئی حکومت کی کوتاہی بینی کا شکار ہو کر رہ گیا۔ جو لاکھوں نصابی کتابیں ہم نے چھاپ دی تھیں انھیں ردی کے مول بیچ دیا گیا۔

(ص) جو تارکین وطن ۱۹۴۷ء میں جان کے لالے پڑنے پر سرحد پار کر کے بھاگ گئے تھے انھیں واپس لا کر ان کی بحالی کا کام شروع کیا گیا۔ انھیں تقاوی قرضے دیئے گئے اور ان کی آباد کاری کے لئے خاص عملہ مہیا کیا گیا۔

(ن) کشمیر اپنے ہنرمندوں کی محنت اور عرق ریزی کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور رہا ہے یہاں کے کاری گروں کی انگلیوں میں حسن اور خوبصورتی کے چمن زار آراستہ کرنے کی صلاحیت ہے۔ چنانچہ ان کے بنائے ہوئے شال دوشالے۔ قالین۔ چوب کاری، پیپر میشی، سونے اور چاندی کے جڑے ہوئے ظروف وغیرہ ساری دنیا میں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے ہیں۔ لیکن خود یہ کاری گر کارخانہ داروں اور درمیانہ داروں کے استحصال کا نشانہ بن کر عشرت کی زندگی بسر کرتے رہے ہیں ہم نے انھیں استحصالیوں کے چنگل سے آزاد کرانے کے لئے گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم کا قیام عمل میں لایا۔ اور اس کا دفتر اس عالی شان عمارت میں رکھا گیا جہاں کبھی برطانوی حکومت کا ریزیڈنٹ رہا کرتا تھا۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کشمیر کو ہندوستان کے آئینی ڈھانچے میں دفعہ ۳۷۰ کے تحت عزت و آبرو کا مقام دلانے میں کامیابی حاصل کرلی گئی تھی جس کے تحت ہمیں ہندوستان کی مجموعی سرداری کے چوکھٹے میں اپنا ذیلی آئین اپنا ذیلی پرچم اور اپنی ذیلی آئین ساز اسمبلی قائم کرنے کا حق حاصل ہوا۔ ان میں سے اکثر کامیابیوں کا مغز ۱۹۵۳ء کے بعد نکال کر دلی کے حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی سعی کی گئی۔ اور کشمیری عوام کو بہلانے کے لئے صرف ان کا خول ہی خول باقی رہنے دیا گیا۔

ریاست جموں کشمیر واحد ریاست ہے جہاں ۱۹۴۷ میں ہی ایسے انقلابی نوعیت کے پروگراموں کا تصور ابھرنے لگا کہ نیشنل کانفرنس پر اشتراکیت کے فلسفہ سے متاثر ہونے کا الزام لگا لیکن اس اشتراکی فلسفہ کو حقیقت کا روپ دینے کے لئے مذہبی ہتھیار استعمال کئے گئے اور پھر

www.taemeernews.com

اس اشترا کی پروگرام کے لئے عوامی لڑائی بھی سرینگر۔ اننت ناگ۔ بارہمولہ اور چھوٹے قصبوں تک ہی محدود رہی۔ کشمیر کی دیہی آبادی جس کی خوشحالی اور ترقی کے لئے یہ تحریک چلائی جارہی تھی۔ وہ مجموعی طور سے اس تحریک میں سرگرم نہیں تھی۔ سیاسی تربیت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انقلاب تو آیا لیکن انقلاب کی اہمیت اور اس کے نظریات اور فلسفہ سے کشمیری مسلمان بے بہرہ رہا۔ وہ اس تبدیلی کو اسلام کی فتح اور ہندو راجہ کے خلاف کامیاب لڑائی قرار دے رہا تھا۔ ۱۹۵۲ میں جب شیخ محمد عبداللہ نے یہ محسوس کیا کہ ان کے ساتھ کشمیری مسلمانوں نے جو توقعات وابستہ کئے تھے وہ پورا نہیں ہورہے ہیں تو انھوں نے ایک ایسی کروٹ لی کہ کشمیر اور نئی دہلی میں شک و شبہات پیدا ہونے لگے۔ زیر زمین کمیونسٹ پارٹی جو کہ نیشنل کانفرنس کی شکمی تنظیم تھی وہ اس نئی کروٹ سے گھبرا گئی اور اس نے پہلی بار کسانوں اور مزدوروں کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ اس میں گریس گنڈ یعنی کسان اتحاد۔ مجوزہ سسٹم جو اس وقت کے وزیر مال مرزا محمد افضل بیگ نے شروع کیا اس کے خلاف کسانوں کو منظم کیا گیا اور دیہی علاقوں میں شیخ محمد عبداللہ کی پالیسیوں کے خلاف ایک منظم تحریک شروع ہوئی۔ پہلی بار مسجد کے تنگ دائرے سے نکل کر نیشنل کانفرنس لیڈر شپ کا ایک بااثر حلقہ اس نئی جدو جہد میں جٹ گیا حالانکہ اس نئی غلام محمد کی سرپرستی شامل تھی جو کہ شیخ محمد عبداللہ کے خلاف کمیونسٹوں کے ساتھ ساز باز کر رہے تھے۔ بخشی غلام محمد اپنے ذاتی اغراض کے لئے اس جدو جہد کو استعمال کر رہا تھا اور کمیونسٹ ایک نئی تحریک جو کہ بنیادی طور سے ایک سیاسی تحریک تھی منظم کر رہے تھے۔ ۱۹۵۳ میں سیاسی تبدیلی کے بعد جب بخشی غلام محمد وزیر اعظم بنے تو کمیونسٹوں نے بھی کھل کر کسانوں۔ مزدوروں اور طلبہ کو سیاسی تربیت دینے کا سلسلہ شروع کیا اور اس سلسلہ میں ملنگ پورہ میں ایک سیاسی اسکول بھی قائم کیا گیا۔ جس میں پیر غیاث الدین، حومین لال مصری اور دوسرے سرکردہ کمیونسٹ تعلیم دینے پر مامور تھے۔ لیکن جس تحریک کو سیاسی اقتدار کی منتقلی کے لئے شروع کیا گیا وہ تحریک بخشی غلام محمد کی ہوس اقتدار اور ہوس زر کی وجہ سے دم توڑ گئی۔ جو نیشنل کانفرنسی لیڈر اس تحریک میں پیش پیش تھے وہ یا تو وزیر بن گئے یا پھر اعلاسر کاری نوکریوں پر مامور کئے گئے۔ جو کمیونسٹ دیانت داری کے ساتھ نیشنل کانفرنس کو فرقہ واریت کے محدود دائرے سے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے وہ پھر مایوس ہو گئے اور مایوسی کا فائدہ بخشی غلام محمد نے اٹھاتے ہوئے کمیونسٹوں میں بھی نفاق کے بیج بو دئے۔

اس پس منظر میں کشمیر میں راجواڑ شاہی کے خلاف نیشنل کانفرنس کی تحریک یا پھر رائے شماری کے لئے شیخ محمد عبداللہ کی ۲۲ برس تک سرد گرم جنگ کا تجزیہ کرنے سے صاف نظر

www.taemeernews.com

آتا ہے کہ تحریک فرقہ واریت سے پاک نہیں تھی۔ ہندوستان کو ایک ہندو ملک قرار دے کر ہندؤوں کے خلاف نفرت کے بیج بو دئے گئے۔ ہندؤوں اور مسلمانوں کے بیچ ایک اونچی دیوار کھڑی کی گئی اور نفرت کا زہر آہستہ آہستہ کشمیر کی سیاسی زندگی میں سرایت کرنے لگا۔ ۱۹۸۹ میں شورش شروع ہوتے ہی نظام مصطفے قائم کرنے اور کشمیری ہندؤوں کو بھگانے کا جو عمل شروع ہوا اس کے لئے زمین ہموار کی گئی تھی۔ کشمیری پنڈتوں کے بارے میں شیخ محمد عبداللہ نے اپنے سوانح حیات آتش چنار میں لکھا ہے"

جب ۱۹۳۱ء میں تحریک کشمیر آزادی کا آغاز ہوا تو مہاراجہ کی انتظامیہ پر کشمیری پنڈتوں کا غلبہ تھا۔ سر تیج بہادر سپرو۔ کے۔ وائل، اے۔ کے۔ وائل، اور کیلاش نارائن ہکسر کی مہاراجہ کے ساتھ گاڑھی چھنتی تھی۔ چناچہ جب یہاں کے عوام نے اپنی مظلومیت کے خلاف آواز بلند کی تو وہ ڈوگرہ مہاراجوں نے کشمیری پنڈتوں کو اپنے مفادات کی ڈھال کے طور پر استعمال کیا اور انھیں اس بات کی شہ دی کہ دراصل یہ ہندو مہاراجہ کے خلاف مسلمانوں کی بغاوت ہے۔ ایک پرانے کشمیری پنڈت راجہ ہری کرشن کول کو وزیر اعظم مقرر کرکے اس کے ہاتھوں ظلم و ستم کا دور روا رکھا۔ افسوس یہ ہے کہ ایک عرصے تک کشمیری پنڈت جیسے روشن خیال لوگ اس جھانسے میں رہے اور انھوں نے سارے ہندوستان کے ہندو پریس میں" کشمیری پنڈت خطرے میں" کا شور بپا کر ڈالا۔ مگر ہم بار بار انھیں یقین دلاتے رہے کہ یہ تحریک ہرگز غیر مسلموں یا کشمیری پنڈتوں کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ یہ ظالم و مظلوم کی لڑائی ہے۔ جہاں ظالموں مین غیر مسلموں کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی موجود ہیں وہاں مظلوموں کی صف میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم اور کشمیر پنڈت بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن جب کچھ معمولی سرکاری نوکریاں مسلمانوں کو بھی ملنے لگیں تو کشمیری پنڈت صاحبان گھبرا گئے کہ ان کے رزق کا آخری نوالہ بھی چھن جائے گا۔ چناچہ انھوں نے اس کے خلاف" روٹی ایجی ٹیشن" کے نام سے ایک ہنگامہ کھڑا کرلیا لیکن جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ یہ جلد ہی ایک مذاق میں تبدیل ہو گیا۔ اور اپنی موت آپ مر گیا۔ انھوں نے مہاراجہ کو ایک میمورنڈم پیش کیا۔ اس میں کشمیری پنڈتوں کے لیے علاقہ کو لگام میں ایک الگ پنڈت وطن (REGION) بنانے کی مانگ بھی کی۔ آخر کار تاریخ کی منطق اس طبقے کے چند ترقی پسند نوجوانوں کو اپیل کرنے لگی۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز نے گلینسی کمیشن میں کہا کہ مسلمانوں کے مقابلے میں کشمیری پنڈتوں کی حالت بہت بہتر ہے۔ کیشپ بندھو، جیالال کلہم اور دوسرے لوگ بھی ہمارے ہم خیال ہونے لگے اور آخر کار مسلمان اور پنڈت لیڈروں کے مشترکہ دستخطوں سے وہ قومی منشور NATIONAL DEMAND والی دستاویز سامنے آ گئی جو نیشنل کانفرنس کے قیام کا پہلا پتھر ثابت ہوئی۔ جب ۱۹۸۳ء میں نیشنل کانفرنس کا وجود عمل میں

www.taemeernews.com

آیا تو کچھ عرصہ کے لیے پنڈت ہمارے کاندھے سے کاندھا ملاتے ہوئے آگے آئے لیکن انھیں بھی یہ احساس ہونے لگا کہ آزادی کا مطلب یہ ہے کہ مظلوموں کی اکثریت ان کے حقوق ملیں گے اور سوا اتفاق سے اس اکثریت میں مسلمانوں کا حصہ بڑا تھا تو انھیں طبقاتی برتری پر زور پڑنے کا اندیشہ محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ وہ طرح طرح کے بہانوں سے نیشنل کانفرنس سے الگ ہونے لگے اگرچہ اس کے باوجود بھی بعض روشن خیال اور دور اندیش پنڈت نوجوان نیشنل کانفرنس کے کام میں جوش و خروش سے شریک رہے لیکن سچ تو یہ ہے ان کی حیثیت طبقاتی سے زیادہ ذاتی اور انفرادی تھی۔ طبقاتی حیثیت سے تو وہ مجموعی طور پر نیشنل کانفرنس اور تحریک آزادی سے بڑے دھارے سے کٹے ہی رہے۔ چنانچہ خود جواہر لال نہرو کو کشمیری پنڈتوں کے گڑھ۔ شیتل ناتھ۔ میں جا کر انھیں فہمائش کرنا پڑی اور انھیں مشورہ دینا پڑا کہ وہ ظالم اور مظلوم کی اس جدوجہد میں ظالموں کے خلاف کھل کر آ جائیں اور نیشنل کانفرنس کی صفوں کو مضبوط بنائیں۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ دلچسپ ہے۔ جواہر لال نہرو نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ کشمیری پنڈت سماجی سطح پر مسلمانوں کے ساتھ چھوت چھات سے پرہیز کریں۔ اس وقت تو پنڈت خاموش رہے لیکن دوسرے روز جواہر لال کے پاس ایک وفد آیا اور ان سے کہا کہ انھوں نے سماجی سطح پر چھوت چھات کی جو بات کہی تھی وہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے شادی بیاہ میں ماشکی اور دوسرے مزدور مسلمان ہی ہوتے ہیں۔ جواہر لال نے ایک قہقہہ لگا کر کہا کہ "جی ہاں، ماشکی تو ہوتے ہیں۔ لیکن رسوئی میں اور دستر خوان پر انھیں آنے کی اجازت نہیں۔"

پنڈت صاحبان نے نہرو جی کی یہ فہمائش تو اپنے روایتی اخلاق سے سنی۔ مگر "پرنالہ وہیں کا وہیں بہنے لگا۔" کے مصداق مطلق العنان حکومت کی پیٹھ ہی ٹھونکتے رہے۔ اتفاق سے ۱۹۴۵ء میں مہاراجہ نے اپنے ایک ملازم رام چند کاک کو وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ رام چند کاک صرف کشمیری پنڈت ہی نہ تھا۔ بلکہ کشمیری زبان بولنے والا بھی، بس پھر کیا تھا نوکر شاہی کو دیوتا سمجھنے والے کشمیری پنڈت سمجھنے لگے کہ اب انہی کا راج ہے اور انہی کے ٹھاٹھ ہیں۔ چنانچہ "کشمیر چھوڑو دو" تحریک کی مخالفت میں محمد علی جناح اور مسلم کانفرنس کے ساتھ کشمیری پنڈت بھی (چند معزز استثنیات کو چھوڑ کر جو انگریزی کہاوت کے مطابق کلیے۔ کو ہی سچ ثابت کرتے ہیں) ہم آواز اور ہم آہنگ ہو گئے۔ یہ بات بڑی فکر انگیز ہے کہ کشمیر میں تحریک آزادی اور خاص طور پر کشمیر چھوڑ دو کے زمانے میں جتنے شہید پولیس اور فوج کی گولیوں سے جاں بحق ہو گئے۔ ان میں شاید ایک آدھ کشمیری پنڈت بھی نہ ہو گا۔ بہر کیف۔ یہ صورت حال اس وقت اپنی ستم ظریفانہ انتہا کو پہنچ گئی جب جواہر لال نہرو ڈوگرہ مہاراجہ کی مخالفت اور کشمیری عوام کی حمایت کے لئے ۱۹۴۷ء میں کوہالہ آئے۔ اس وقت جہاں مہاراجے کی فوج اور

www.taemeernews.com

سنگینوں سے ان کا راستہ روک رہی تھی وہاں ان کو "واپس جاؤ" کے نعرے سنانے والوں میں مولوی یوسف شاہ کے پیرو، جموں کے مہاسبھائی ہندو اور جواہر لال نہرو کے ہم نسب اور ہم گوتر کشمیری پنڈت بھی شامل تھے۔ انھیں کوئی احساس نہ تھا کہ اپنے خون، اپنے آدرش اور اپنے وطن کا ساتھ دینے کے بجائے وہ ایک ریت کی دیوار اور ظلم کے پھندے کا ساتھ دے رہے ہیں۔ شاید شاعر نے ایسے ہی موقع کے لئے کہا تھا۔

شراب سیخ پر ڈالی، کباب شیشے میں

کشمیری پنڈتوں نے اسی کردار کا مظاہرہ ۱۹۷۷ء میں بھی کیا۔ انھوں نے نیشنل کانفرنس اور اپنے نسب کی عظیم خاتون، اندرا گاندھی کی کانگریس کا ساتھ دینے کے بجائے جنتا پارٹی کا ساتھ دیا۔ جن میں ایک طرف جن سنگھ کے عناصر شامل تھے اور دوسری طرف مولوی فاروق کے بکرے۔ بہر کیف۔ رام چند کاک کی فرعونیت جواہر لال کی کشمیر دوستی کے آگے جھک گئی۔ کشمیر میں صورت حال نے پلٹا کھایا۔ قبائلی حملہ آور چڑھ آئے۔ اپنے آپ کو پنڈتوں کا دھرم رکھشک کہنے والے مہاراجہ رات کی تاریکی میں ان بے چاروں کو اپنے حال پر چھوڑ کر دم دبا کر جموں بھاگ گئے۔ اس وقت سارے ملک میں اقلیتوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کے ساتھ کھلم کھلا ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ لیکن کشمیریوں کی قومی روایات سامنے آئیں۔ نیشنل کانفرنسی قیادت کا نظریاتی استحکام آڑے آیا اور ہم نے سب سے پہلے کشمیری پنڈتوں کو عزت و آبرو اور جان و مال کی سلامتی کے لیے اقدامات کیئے۔ ہم نے ان کے تیرتھ استھانوں کی حفاظت کو اولین ترجیح دی۔ تولہ مولہ سے جہاں راگنی دیوی یا کھیر بھوانی کا مشہور استھان واقع ہے، قبائلیوں کے ڈر کی وجہ سے وہاں کشمیری پنڈت، پجاری اور مہنت تک بھاگ آئے تھے۔ وہاں کے مسلمانوں نے استھان کی حفاظت اپنے متبرک مقام کی طرح کی۔ اسی طرح ہم نے دوسرے مندروں اور تیرتھوں کی حفاظت کے لیے کڑے انتظامات کیے۔ چنانچہ ہماری تحویل میں کسی پنڈت کا بال تک بیکا نہ ہوا۔ یہ اس قدر شاندار کارنامہ ہے کہ اس سے کشمیر کے اتحاد اور اتہاس کی ایک نئی جوت پیدا ہو گئی ہے۔ ہماری آئندہ نسلیں اس پر فخر سے سر اونچا کریں گی۔ جس وقت کشمیری پنڈتوں پر اجل اور قضا کی شمشیریں لہرا رہی تھیں اس وقت یہاں مہاراجے یا ہندوستان کا کوئی سپاہی نہ تھا۔ صرف انھیں اپنے مسلم ہم وطنوں کی خیر سگالی اور جذبہ، محبت کی سپر بچائے ہوئے تھی۔ یہ معجزہ ایسا فرحت بخش تھا کہ برصغیر کے شعلوں کو دیکھنے والے مہاتما گاندھی کی جلتی ہوئی آنکھوں میں اس سے ٹھنڈک پڑ گئی اور وہ بے ساختہ پکار اٹھے "مجھے کشمیر سے روشنی کی کرن نظر آتی ہے۔" روشنی کی اس کرن میں روغن کشمیر کی رواداری کی روایات نے ڈالا تھا۔ لیکن کشمیری پنڈتوں نے از راہ نوازش اس کا سہرا میرے سر باندھ لیا۔ ان دنوں جب میں پنڈت

www.taemeernews.com

علاقوں میں جاتا تھا تو مجھے خاص طور پر سادہ و معصوم پنڈت خواتین کے اجلے مکھڑوں پر شکرگزاری کا ایسا تاثر دیکھنے کو ملتا جسے میں اپنی حقیر خدمات کے نہایت ہی قیمتی انعامات میں شمار کرتا ہوں۔ کچھ پنڈت دوست تو یہاں تک غلو کر گئے کہ مجھے وشنو کا اوتار قرار دینے لگے۔ جس نے ان کی رکھشا کے لیے ستی سر کشمیر میں پنر جنم لیا تھا۔

میں نے اگر کشمیری پنڈتوں کے لیے کچھ کیا تھا تو یہ کوئی اترانے کی بات نہ تھی۔ یہ میرے قومی مزاج، ہماری تحریک کے آدرشوں اور خود میرے ذاتی کردار سے مطابقت رکھتا تھا۔ میں نے ہی ۱۹۳۲ء کے فسادات میں ایک پنڈت خاتون کے مردہ جسم کو کئی دن کے بعد شمشان گھاٹ تک پہنچانے کے لئے جان جوکھم میں ڈالی تھی اور میں نے ہی تو جناح صاحب سے تقسیم ملک سے بہت پہلے کہا تھا کہ کشمیر میں دو قومی نظریئے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ مسلم لیگ ریاست سے باہر جو چاہے کرے۔ ریاستی عوام نیشنل کانفرنس کے پرچم تلے باہم شیر و شکر رہنے کے علاوہ اور کوئی راستہ اختیار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جب ۱۹۴۴ء میں ہم نے پرتاپ باغ سرینگر میں جناح صاحب کو خیر مقدم میں جلسہ منعقد کیا تو وہاں استقبالیہ جلسے میں سپاس نامہ پیش کرنے کے لئے ہمارے ایک پنڈت ساتھی کلہم صاحب کو ہی چنا گیا۔ ۱۹۴۸ء کے بعد جب ہم نے کشمیر میں زرعی اصلاحات نافذ کیں تو بد قسمتی سے اس کی زد میں جموں کے راجپوتوں کے ساتھ ساتھ کشمیری پنڈت جاگیردار بھی آئے۔ اس زد میں مسلم جاگیردار اور چک دار بھی آئے۔ لیکن اپنی آبادی کے تناسب سے کشمیری پنڈتوں کو دربار میں قرب اور اپنی "خدمات فائقہ" کے لحاظ سے کچھ زیادہ ہی جاگیریں وغیرہ ملی تھیں۔ لیکن یہ زمانے کی منطق اور تاریخ کا فتوی تھا۔ اس میں کسی تعصب کا کوئی سوال نہ تھا۔ مگر کشمیری پنڈتوں نے اسے عقل و استدلال کی عینک سے نہیں دیکھا بلکہ ذاتی مفادات اور طبقاتی تعصب کی ترازو سے تولا۔ اس مرحلہ پر یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ کشمیری پنڈت ظلم و ناانصافی کے اس نظام کی بقاء کے لئے بہت پہلے سے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے ۱۸۸۷ء میں جب کشمیر میں غریب کاشکاروں کی حالت زار کا چرچا برطانوی ہند میں ہونے لگا تو دلی کی حکومت کے مشورے سے کشمیر میں مسٹر ونگیٹ کو بندوبست آراضی کے لیے سٹلیمنٹ کمشنر بنا کر بھیجا گیا۔ لیکن بڑی بڑی زمینیں اور جاگیریں پنڈتوں نے اپنی مصاحبت اور سرکار نوازی کے عوض حاصل کر لی تھی لہذا انھوں نے اس اچھے اراوں والے انگریز افسر کے خلاف ایسی مہم چلائی کہ اسے اپنا کام ادھورا چھوڑ کر مستعفی ہو کر جانا پڑا اور اس طرح کشمیری پنڈتوں کے خصوصی مفادات پر آئی ہوئی بلا ٹل گئی۔ ان کی شکایات میں چونکہ وزن نہ تھا اور ان کے استدلال میں کاٹ نہ تھی اس لیے وہ کھلم کھلا بحث و مباحثے کے بدلے کانا پھوسی اور کھسر پھسر کی مہم چلانے لگے۔ دہلی میں جا کر انھوں نے اپنے ہندو مذہب کی دہائی دینا شروع کر دی۔

www.taemeernews.com

حالانکہ ان کے اسلاف نے اپنی کشمیرنوازی کے افتخار میں اپنے لیے سرکاری فرمان کے وزن سے " کشمیری پنڈت" کی امتیازی لکیر کھنچوا دی تھی۔ انھوں نے دہلی کے فرقہ پرست ذہنیت کے چند طاقتور حلقوں کو اکسانے کے لیے ہمارے خلاف صرف یہی نہیں کہا کہ ہم فرقہ پرست ہیں بلکہ تحریک حریت کے آغاز کے وقت تراشا ہوا یہ الزام پھر تازہ کر دیا کہ ہم اشترا کی بالشویک اور روسی ایجنٹ ہیں۔ وہ کشمیر کو بھول گئے اور فرقہ واری کے پیمانے سے معاملات کو جانچنے لگے۔ بد قسمتی سے دہلی کے ایوانوں کی غلام گردشوں میں ایسے افراد کی کمی نہیں تھی۔ جن کے دل اسی سم اور تال پر دھڑکتے تھے۔ چنانچہ کشمیر سے لے کر دہلی تک ایک اکھنڈ پاٹھ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کشمیری پنڈت پھر مغلوں کے زمانے کی طرح اپنے عوام سے کٹ کر کسی اور کے اشارے پر ناچنے لگے۔ درقبیلہ کے ایک اور چشم و چراغ درگا پرشاد در نے اپنے بزرگوں کی روایات کو آگے بڑھاتے ہوئے کار خاص میں مہارت حاصل کر لی اور وہ کشمیر کی عوامی تحریک کے جگر میں خنجر کی طرح پیوست کر دیئے گئے۔ ۱۹۵۳ء کے المیے میں اس کھسر پسر کا بھی ایک عنصر شامل رہا۔ وہ یہ بھول گئے کہ پاکستان کے ساتھ سازباز کا الزام جس شیخ محمد عبداللہ پر عائد کیا جاتا ہے وہ جب ۹۔ اگست ۵۳ء کو گلمرگ میں گرفتار ہوا تو اس کی پارٹی صرف تین کشمیری پنڈت افسروں پر مشتمل تھی۔ لیکن مجھے یہ اطمینان حاصل رہا کہ ہمارے ساتھ پنڈت کیشپ بندھو اور جانکی ناتھ گکرو نے ضرور کچھ سال جیل میں گذارے دیئے اگرچہ ہمیں ان کی غالب اکثریت امریکی، پاکستانی اور چینی ایجنٹ کہ کر پکارتی تھی۔

کشمیری پنڈت ہندوستان میں پچھلے زمانے سے ہی اپنی قابلیت کی دھاک بٹھائے آئے تھے۔ کشمیری شاعر بلبن دکن گیا تو وہاں کا راج کوی بن گیا۔ رتن ناتھ سرشار، برج نرائن چکبست، سرتیج بہادر سپرو، پنڈت موتی لال نہرو اور بیسوں کشمیری پنڈتوں کے تذکرے کئے بغیر ہندوستان کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ آج بھی سارا ملک ان کی قابلیتوں کا جولانگاہ ہے۔ انہیں ہماری وزارت خارجہ، مرکزی سکریٹریٹ، فوج اور دوسرے اہم سروسوں، پرائیوٹ کمپنیوں اور پریس میں اہم مقام حاصل ہے اور یہ ہندوستان کے شہریوں کی حیثیت سے ان کا حق ہے۔ دہلی اور جموں میں انھوں نے اپنی ہاؤسنگ کالونیاں اور محلے آباد کیے ہیں۔ بہت سے کشمیری پنڈتوں کے تو سرینگر، جموں اور دہلی میں بیک وقت مکانات ہیں۔ تقسیم سے پہلے وہ اپنی برادری سے باہر رشتے طے نہ کرتے تھے۔ مگر اب وہ غیر ریاستوں کے ساتھ سمبندھ قائم کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے۔ ان کے سارے ملک میں تعلقات ہیں اور رسوخ ہے اور ہم کشمیریوں کو ان کے کارناموں پر فخر ہے کشمیریوں میں جمہوری نظام کی برکتوں کے لحاظ سے آزادی کے ثمراب ان طبقوں اور جاتیوں میں بھی تقسیم کئے جا رہے ہیں جو تاریخ کی اندھی منطق کے سبب پیچھے رہ گئے تھے۔

www.taemeernews.com

چنانچہ ان میں کشمیر کے دیہاتیوں کے علاوہ گوجر۔ بکروال۔ جموں کنڈی میں لینے والے ہریجن اور لداخ اور کرگل کے پسماندہ باشندے وغیرہ شامل ہیں۔ چونکہ کشمیری پنڈت صاحبان کو پہلے خاص حالات کی وجہ سے ان معاملات میں اگر اجارہ نہیں تو بھی غلبہ حاصل تھا۔ اس لئے انھیں صورت حال سے کوفت ہو رہی ہے۔ لیکن واقعات گواہ ہیں کہ اپنی قابلیت کے بل بوتے پر وہ اب بھی ریاست کے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں اپنی تعداد کے تناسب سے کہیں زیادہ موجود اور مقتدر ہیں۔ اور تو اور جموں کے کچھ باشندے وہاں ان کی بالادستی پر ناراضگی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ سارے ملک میں جتنی ان کی مانگ اور کھپت ہے ریاست کے کسی دوسرے طبقے کے خواب خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ تیسرے ریاست میں جتنے مرکزی دفاتر ہیں ان میں جو تقرریاں ہوتی ہیں ان میں کشمیری پنڈتوں کا تناسب ساٹھ سے سو فیصد تک ہے حالانکہ ان کی آبادی کا اوسط دو ڈھائی فیصد سے زیادہ تک نہیں پہنچتا۔ ان حالات میں اگر کشمیری پنڈت صاحبان اپنے بلاشک و شبہ بے اندازہ ذرائع اور ملک گیر اثر و رسوخ اور خاص طور پر صحافتی حلقوں میں اپنے اثر و نفوذ سے طوفان بپا کرتے رہتے ہیں تو ان کے باقی برادران وطن کو اس پر جائز طور گلہ ہو سکتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ واقعات کی منطق کے ساتھ ساتھ اپنے ہم وطنوں کی اکثریت اپنی ریاست کے جغرافیائی مفادات کے تقاضوں اور اس کی ہیبت ترکیبی مصلحتوں پر بھی نظر رکھیں اور صرف دلی کے ایوانوں کی جاگزیں نوکر شاہی کو ہی اپنا قبلہ و کعبہ تصور نہ کریں۔ کشمیری پنڈت ریاست کو اپنی صلاحیتوں سے مالامال کر سکتے ہیں اور باقی ملک کے ساتھ اس کے جذباتی رشتوں کو کمزور بنانے کی بجائے ان کے درمیان ایک مضبوط پل کا کام کر سکتے ہیں۔ کشمیریوں نے دو قومی نظریئے کو ٹھکرا کر اپنے کشمیری پنڈت بھائیوں کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ان پر تاریخ نے یہ ذمہ داری ڈال دی ہے کہ وہ اس ہاتھ کو نہ جھٹکیں جس طرح وہ خود ظلم اور ناانصافی کو ناپسند کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کے دوسرے ہم وطن بھائی بھی ظلم و ناانصافی سے نالاں ہیں۔ جواہر لال اور اندرا گاندھی کے ملک میں جہاں کشمیری پنڈت اقتدار کی چوٹیوں پر کمندیں ڈالے ہوئے ہیں ان کی رسائی کشمیریوں کے لیے فیض و برکت کا سرچشمہ ہونا چاہیئے۔ بغض و شرارت کا ذریعہ نہیں۔ ملک کے بڑے دھارے میں ان کی ممتاز حیثیت اس قدر نمایاں ہے کہ چند ہی سال پہلے ایک وقت وہ تقریباً سارے اہم مناصب پر فائز تھے۔ کشمیر کے چھوٹے دائرے میں بھی انھیں کشمیریوں نے محبت شفقت اور پیار دیا ہے اور اپنے جذبات کی صداقت اور سنگینی کا مظاہرہ انتہائی آزمائش کے وقت بھی کیا ہے جب انھوں نے اپنے ہم مذہبوں کو ظالموں کے روپ میں دیکھ کر ان کے خلاف ہتھیار اٹھائے۔ لیکن قدرت کسی متوازن نظام میں اونچ نیچ کے خلاف ہے۔ ریاست میں وہ اونچ نیچ کی فضا جو صدیوں کی غلامی کا نتیجہ ہے۔ تیزی سے ہموار ہو رہی ہے اور اس میں شک نہیں

www.taemeernews.com

کہ اس کے باوجود کشمیری پنڈت اپنی خوبیوں کی وجہ سے آگے آگے رہیں گے۔ کشمیر کے گلدستے کا روپ کشمیری پنڈت کے لالہ احمر جیسے چہرے کی رنگت، اور اس کی مہذب شخصیت کی مہک کے بغیر ادھورا ہے۔ لیکن اسے بھی جاگیر داری تصورات کی سطح سے اٹھ کر آگے آنا ہو گا۔ ان کی سوچ کا محور ہمیشہ چھوٹی چھوٹی نوکریاں رہی ہیں اور انھیں حکمرانوں کی خدمت اور جاسوسی ـــ میں سکون ملتا رہا ہے۔ نئی جمہوری برادری میں وہ کارکن نہیں بلکہ برابر سے بھی ایک انچ زیادہ کے شریک و شامل ہیں۔ ان میں اتنی لوچ اور لچک ضرور موجود ہے کہ وہ اپنے آپ کو نئے تقاضوں کے قالب میں ڈھال کر اپنی امتیازی شان برقرار رکھیں صرف بات بتنگڑ بنا کر یہاں دہلی کے جاسوسوں اور کشمیریوں کے پانچوں کالم کا رول، جو وہ برسہا برس سے ادا کرتے ہیں۔ چھوڑ کر اپنے دوسری کشمیری بھائیوں کے دکھ درد کا ہمدم اور ہمدرد بننا چاہیے۔ جنھوں نے فرقہ وارانہ برادری کے لیے خود اپنے ہم مذہبوں کا جگر داری سے مقابلہ کیا۔ مولانا رومی کے اس شعر کا مخاطب شاید وہی ہے۔

تو برائے وصل کردن، آمدی
نے برائے فصل کردن، آمدی

www.taemeernews.com

-

www.taemeernews.com

وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ کی تقریر کے بعد کانگرسیوں پر یہ بات واضح ہوگئی کہ سید میر قاسم سیاسی مفاہمت کے لئے شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ جو گہرا رابطہ قائم کر رہے ہیں وہ ان کی اپنی کوئی نجی پالیسی نہیں بلکہ مرکزی لیڈر شپ بھی شیخ محمد عبداللہ کو واپس قومی دھارے میں اپنی TERMS پر واپس لانا چاہتی ہے۔ موقع پرستی کشمیری سیاست کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ ذاتی مفادات کے لئے اونچی گردنوں کو جھکانے کی بیماری بھی بہت پرانی ہے اور وزیر خارجہ کی اس تقریر کے بعد یہ بیماری ناسور کی شکل اختیار کر گئی۔ شیخ محمد عبداللہ سے ملاقات کرنے کے لئے ان کے در پر پرانے اور نئے کانگریسی ناک رگڑنے لگے۔

۹۔ اگست ۱۹۵۳ء کے واقعہ کی مذمت ہونے لگی جنہوں نے ۹۔ اگست کے بعد بلیک میل بیساکھی کو استعمال کر کے کروڑوں روپے کمائے تھے وہ بھی شیخ محمد عبداللہ کی آمد کی خوشی میں بینڈ باجے کا انتظام کرنے لگے۔ حالاں کہ سید میر قاسم بار بار یہ احساس دلاتے رہے کہ شیخ محمد عبداللہ کے قدموں پر پگڑی رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں، عزت و وقار کے ساتھ سیاسی طور پر زندہ رہنے کی کوشش کرو۔ لیکن عمر بھر قدم بوسی کرنے والے کب کسی کی بات سننے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ ان کانگرسیوں نے میر قاسم کے خلاف بھی سازش شروع کی کہ "جب شیخ صاحب کو اقتدار سپرد کرنا ہی ہے تو میر قاسم اس کا کریڈٹ کیوں لیں۔ ہم خود ہی یہ فریضہ کیوں نہ ادا کریں۔" یہ لوگ چاہتے تھے کہ شیخ محمد عبداللہ کو اقتدار سونپنے سے قبل ہی میر قاسم کو پارلیمنٹری پارٹی کے لیڈر کے عہدے سے ہٹایا جائے۔ شاید یہ سازش کامیاب ہو جاتی اگر جموں کے ایک پرانے نیشنل کانفرنس کے لیڈر کرشن دیو سیٹھی میدان میں نہیں اترتے اور ان کانگرسیوں کو راہ راست پر نہ لاتے۔ کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری موتی لال مصری کو مرکزی لیڈر شپ نے اس عہدے سے صرف اس وجہ سے ہٹایا تھا کہ انہیں ایک طویل مدت کے بعد احساس ہوا تھا کہ مسلم اکثریتی علاقہ میں کشمیری پنڈت کا جنرل سکریٹری ہونا مارکس کی توہین ہے۔ اس شاک نے موتی لال مصری کو کانگرس کی گود میں بٹھا دیا تھا۔ انہوں نے بھی شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ براہ راست پائپ لائن بچھانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ حقیقت میں شیخ محمد عبداللہ بھی اس نازک موقع پر سید میر قاسم کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے وہ ان کے مخالف گروپ کی حوصلہ افزائی نہیں کر رہے تھے جس کی وجہ سے موقع پرستی کی سجائی گئی دوکانیں بند تو نہیں ہوئیں لیکن خرید و فروخت کا کاروبار بند ہو گیا۔

www.taemeernews.com

شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ مفاہمت باب ۱۴

شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ مفاہمت کشمیر کے کانگریسیوں کیلئے جان لیوا ثابت ہو رہی تھی۔ انھوں نے ۲۲ برس تک شیخ محمد عبداللہ کی منفی سیاست کا مقابلہ کیا تھا انھوں نے ترک موالات کی نفرت آمیز جذباتی تحریک بھی برداشت کی تھی۔ انھوں نے محاذ رائے شماری کی ہندوستان مخالف تحریک کے خطرناک رجحانات کو بھی دیکھ لیا تھا۔ اس لئے وہ شیخ محمد عبداللہ کو اقتدار سپرد کرنے کے حق میں نہیں تھے اور پھر وہ جانتے تھے کہ جس مقصد کے لئے شیخ محمد عبداللہ کو اقتدار سپرد کیا جارہا ہے وہ مقصد پورا نہیں ہو گا۔ کشمیر کا عام مسلمان شیخ محمد عبداللہ کی مفاہمت کی کوششوں کے حق میں نہیں تھا۔ اس میں قصور کشمیریوں کا نہیں تھا۔ ۱۹۵۲ کے بعد شیخ محمد عبداللہ نے ہندوستان کے خلاف نئی نسل کے ذہنوں میں ایسا زہر بھر دیا تھا کہ وہ ہندوستان کے ساتھ مفاہمت کی بات سننے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اور پھر اس دوران پاکستان نے بھی وادی میں ایسے سیل قائم کئے تھے جو پاکستان کے حق میں فضا ساز گار کرنے کے لئے کام کر رہے تھے۔ وہ محاذ رائے شماری کو کثیر سرمایہ بھی فراہم کر رہا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ پاکستان کی ان سرگرمیوں سے بخوبی واقف تھے۔ وہ اس بات کو بھی بخوبی جانتے تھے کہ لاکھوں روپے پاکستان سے وصول کیے جاتے ہیں وہ چاہتے تو اس صورت حال پر قابو پا سکتے تھے لیکن انہوں نے اس طرف دانستہ طور پر کوئی توجہ نہیں دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عام کشمیری مسلمان نوجوان اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ شیخ محمد عبداللہ رائے شماری کی آڑ میں پاکستان کے ساتھ الحاق کے لیے جدو جہد کر رہے ہیں۔ حالاں کہ شیخ محمد عبداللہ ذہنی طور سے پاکستان کے خلاف تھے اس لیے نہیں کہ پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ پر رکھی گئی تھی بلکہ اس لیے کہ پاکستان میں وہ کھو جاتے اور ان کا نام لیوا بھی کوئی نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں وہ ایک پوری قوم کے بلا تاج بادشاہ تھے۔ اور ہندوستان نے ۹ اگست کو ان کی گرفتاری کے بعد بھی ان کے اس تاج کو چھیننے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ پاکستان کے حق میں بنیادی سطح پر جو فضا ساز گار بنتی جارہی تھی اس کے خطرات سے کانگرسی بخوبی واقف تھے۔ اور وہ یہ چاہتے ہوئے بھی کہ شیخ محمد عبداللہ واپس قومی دھارے میں آجائیں، انہیں اقتدار سپرد کرنے کے حق میں نہیں تھے اس کے برعکس چونکہ جموں کے کانگریسیوں کو شیخ محمد عبداللہ

www.taemeernews.com

اور محاذ رائے شماری کی منفی سیاست کا مقابلہ کرنے کی کبھی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی تھی ۔ وہ ہندو اکثریت کے بل پر اسمبلی کے ممبر بھی بنتے رہے تھے اور وزیر بھی ۔ پھر بھی وہ بھی شیخ محمد عبداللہ کے اقتدار میں آنے کی مخالفت کر رہے تھے ۔ ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ ۲۲ برسوں کے بعد کشمیر کا ایک مقبول اور قد آور لیڈر وزیر اعلا بنے گا تو ان کی اہمیت کم ہو جائے گی ساتھ ہی کشمیر کے سیاست دانوں کو انگلیوں پر نچانے کا کھیل بھی ختم ہو جائے گا البتہ جموں کے sputnik شیخ محمد عبداللہ کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس سلسلہ میں امرت ملہوترہ کی رہائش گاہ شیخ محمد عبداللہ سے لیکر غلام محمد شاہ تک کے لئے ذہنی تفریح کی آرام گاہ بن گئی۔

سید میر قاسم نے بدلتے حالات میں چند کانگرسیوں کے لئے روزی روٹی کا انتظام کرنے کا بندوبست بھی کر دیا۔ قانون ساز کونسل کے جو ممبر ریٹائر ہو رہے تھے ان کو پھر سے ممبر بنوا دیا۔ اس کے ساتھ محاذ رائے شماری کے پرانے نوجوان شعبہ لیڈر مولوی افتخار حسین انصاری کو بھی کونسل کا ممبر بنا دیا حالانکہ وہ کانگرس کے بنیادی ممبر بھی نہیں تھے۔ شاید آج بھی نہیں ہیں جب کہ ان کا شمار حالانکہ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں، کانگرسی لیڈروں میں ہوتا ہے ۔ مرکز میں ایمرجنسی کے بعد کانگرس کی شکست نے مولوی انصاری کو جنتا دل کی گود میں بٹھا دیا۔ وہ بار بار رخ بدلتے رہے ہیں اور ہمیشہ ڈوبتے سورج سے آنکھیں چراتے رہے ہیں۔ اس دوران درگا پرشاد در نے اپنے ذاتی وفادار ممبران اسمبلی کو good humour میں رکھنے کے لئے جموں کا دورہ کیا اور جموں میں انہوں نے یہ تاثر دیا کہ میر قاسم تو سیاسی طور پر ختم ہو چکا ہے اب ریاست کی سیاسی زندگی میں ان کے ذریعہ ہی شیخ محمد عبداللہ operate کریں گے ۔ اس سے ان کے وفاداروں کو یقین ہو گیا کہ شیخ محمد عبداللہ کی کابینہ میں بھی وہ وزیر ہونگے ایک روز جب میں اور وید بھسین سید میر قاسم کے یہاں کسی خاص مسئلہ پر بات کر رہے تھے تو سید میر قاسم نے سخت لہجہ میں مکھن لال فوطیدار سے کہا "

DP or no DP, you can not be a minister in Sheikh Sahibs cabinet. Do not be under any false impression and stop creating problems at this crucial stage

مکھن لال فوطیدار اس وقت تو وہ خاموش رہے لیکن اس بے عزتی کا انتقام انہوں نے ایک طویل مدت کے بعد اس وقت لیا جب مرحومہ اندرا گاندھی کے پرسنل اسٹاف میں تھے۔ اس کا تفصیلی جائزہ بعد میں لیا جائے گا۔

بیگ پارتھا سارتھی مذاکرات مکمل ہو چکے تھے البتہ شیخ محمد عبداللہ اس بات پر اصرار کر رہے تھے کہ ۱۹۵۳ کی پوزیشن بحال کی جائے ۔ خود شیخ محمد عبداللہ نے اپنی سوانح حیات آتش چنار میں

www.taemeernews.com

نوٹ کیا ہے، میں نے اپنے ہندوستانی دوستوں سے کہا کہ میرا ہندوستان کے ساتھ الحاق کی واقعیت پر اختلاف نہیں ہے۔ البتہ الحاق کی حدود پر ضرور ان کے اور میرے درمیان اختلاف رائے ہے۔ ہم نے ۱۹۴۷ میں الحاق کی حدود طے کر کے اسے اسمبلی معاہدات کی رو سے جس طرح دفعہ ۳۷۰ کی شکل میں طے کیا تھا ہندوستانی رہنماؤں نے زبردستی اور غیر آئینی طور پر ــــ من مانی کرتے ہوئے اس کو مسخ کیا۔ یہی چیز ہمارے راستے جدا ہونے کی بنیاد بنی۔ اب اگر پھر سے حدود کو بحال کیا جائے تو اختلافات رفع ہو سکتے ہیں۔ شیخ صاحب لکھتے ہیں کہ " میں وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے گھر گیا انہوں نے بڑے تپاک سے میرا خیر مقدم کیا۔ کشمیر کے معاملات پر گفتگو ہوئی اور مسز اندرا گاندھی نے مسکراتے ہوئے کہا کہ شیخ صاحب جو کچھ ہوا اس کو بھول جانے کی ضرورت ہے۔ ہم پھر ایک نیا باب شروع کرنا چاہتے ہیں اور میں نے جواب دیا اگر آپ کا ارادہ ہے تو آگے بڑھ کر آپ کا ہاتھ تھام لینے کے لئے تیار ہوں۔ کیوں کہ میں نے جو کچھ سہا اور برداشت کیا ہے وہ ایک مقصد کے حصول کے لیے تھا، مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں اور اگر ہم اب بھی ایک صحیح سمت کی طرف گامزن ہو سکیں تو اس سے زیادہ خوش آئند بات اور کون ہو سکتی ہے۔ " مسز گاندھی نے شیخ محمد عبداللہ سے صاف طور سے یہ بات کہی کہ " گھڑی کی سوئیاں پیچھے کی طرف گھمائی نہیں جا سکتیں اس لئے ۱۹۵۳ کی پوزیشن کو بحال کرنا ناممکن ہے۔"

اس کے بعد شیخ محمد عبداللہ اقتدار پھر سے سنبھالنے کے لئے تیار ہو گئے۔ شیخ عبداللہ نہ محاذ رائے شماری کے ممبر تھے اور نہ ہی کانگریس کے اور اسمبلی میں اکثریت کانگریس ممبروں کی تھی۔ انہیں کیسے وزیر اعلا کا حلف دلایا جائے یہ ایک آئینی اور قانونی مسئلہ تھا اور یہ مسئلہ مرکزی سرکار نے سید میر قاسم کے مشورہ سے اس طرح حل کر دیا کہ انھیں کانگریس پارلیمانی پارٹی کا لیڈر منتخب کرے گی۔ یعنی شیخ محمد عبداللہ براہ راست کانگریس میں شامل ہو کر کانگریس سرکار بنائیں گے۔ میر قاسم اس سے دو مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے ایک تو یہ کہ شیخ محمد عبداللہ کانگریس کلچر اور ڈسپلن کے پابند ہوں گے اور دوسرا یہ کہ سیاسی زندگی میں continuity رہے گی۔ جس روز کانگریس پارلیمانی پارٹی کی میٹنگ ہونے والی تھی اس روز پہلے سے ہی کانگریس پارلیمانی پارٹی کی قرارداد تیار کی گئی تھی جس میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ، " The Congress Legislative party unanimously elects Sheikh Mohammad Abdullah as its leader in place of Syed Mir Qasim who has on his own steped down in national interest." میں یہ قرارداد قاسم صاحب کو دکھانے ان کی رہائش گاہ پر گیا جہاں پہلے سے وید بھسین براجمان تھے۔ اسی دوران نئی دہلی سے secro phone پر سید میر قاسم رایت دی گئی کہ شیخ محمد عبداللہ کو کانگرس پارلیمانی پارٹی کا نہیں بلکہ ایوان اسمبلی کا لیڈر منتخب کیا جائے

www.taemeernews.com

اور سید میر قاسم بدستور لیڈر کے عہدے پر فائز رہیں گے، فیصلہ کیوں بدل دیا گیا یہ تو معلوم نہیں ہو سکا البتہ اوم مہتہ، ڈاکٹر کرن سنگھ اور محمد شفیع قریشی نے جو تینوں مرکزی کابینہ میں وزیر تھے، وزیر اعظم پر دباؤ ڈال کر فیصلہ منسوخ کرایا۔ میر قاسم کو اس فیصلہ نے توڑ دیا اور انہوں نے پیشن گوئی کی، "India is digging its grave in Kashmir. Petty politicians played game and entire nation will have to pay for it."

نئی قرارداد تیار کی گئی لیکن شیخ محمد عبداللہ کو اس نئے فیصلہ سے آگاہ نہیں کیا گیا، یہی وجہ ہے کہ اس موقع پر جو بیان انہوں نے تیار کیا تھا اس کا پہلا جملہ یہ تھا : on being elected as leader of Congress Legislative Party.

شیخ محمد عبداللہ نے سوانح حیات میں کانگریس پارلیمانی پارٹی کا ماحول یوں بیان کرتے ہیں "سہ پہر کو وزیر اعلا کے نجی دفتر کی عمارت میں کانگریس پارلیمانی پارٹی کی ایک خاص نشست ہوئی جس میں مجھے اتفاق رائے سے پارلیمانی پارٹی کا لیڈر چن لیا گیا۔ اس نشست میں دیو کانت برو بھی موجود تھے لیکن مجھے صورت حال کچھ عجیب لگ رہی تھی۔ اس موقع پر ڈاکٹر کرن سنگھ جنہوں نے مجھے ۹۔ اگست ۱۹۵۳ میں ڈسمس کر دیا تھا موجود تھے اب میرے گلے میں نئی ذمہ داری قبول کرنے پر پھولوں کے ہار ڈال رہے تھے۔ میں نے لیڈر چنے جانے کے بعد اپنی مختصر سی تقریر میں کہا کہ دہلی ایکارڈ کو میں اس اعتماد کی بحالی سے تعبیر کرتا ہوں جس میں ۱۹۵۳ میں بال آ گیا تھا اور میرے دل میں کوئی تلخی موجود نہیں ہے۔ تحریک اور تاریخ کی ٹیڑھی میڑھی راہوں پر جدا ہونا اور پھر ملنا کوئی انوکھی بات نہیں۔ میرے ساتھ میرے ساتھیوں نے جو معاملہ کیا وہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے اور اس کے کیف و کم پر فیصلہ صادر کرنا میں مورخ پر چھوڑ دیتا ہوں۔ میں اپنی نئی ذمہ داری پورے خلوص کی بنیاد پر سنبھال رہا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ دوسری جانب سے بھی وشواس گھات کی تاریخ دہرائی نہ جائے گی۔"

شیخ صاحب کو یہ حقیقت اسی رات کو معلوم ہوئی کہ انہیں کانگریس پارلیمانی پارٹی کا لیڈر منتخب نہیں کیا گیا ہے اور انہوں نے دوسرے روز راج بھون میں حلف اٹھانے سے انکار کر دیا تھا سید میر قاسم، شمیم احمد شمیم اور بیگم عبداللہ نے ان کو وشواس دلایا کہ کوئی وشواس گھات نہیں ہوا ہے اور وہ حلف اٹھانے پر آمادہ ہو گئے۔ پارلیمانی پارٹی میٹنگ میں کئی کانگرسی ممبروں نے ایسی بھونڈی حرکتیں کیں کہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ میر قاسم کے ساتھ ان کا تعلق صرف وزیر اعلا کے منصب کا ہی تھا۔ کئی ممبران جو کل تک وزیر تھے وہ میر قاسم کے قد کو کم کرنے کی سوچ رہے تھے۔ لیکن میر قاسم یہ سب جانتے ہوئے بھی، محسوس کرتے ہوئے بھی، سکون کے ساتھ اپنے منصوبہ کو کامیاب ہوتے دیکھ کر مطمئن نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے ان تمام

www.taemeernews.com

چھوٹے لوگوں کو واپس سڑک پر بھیج کر انہیں یہ احساس دلایا تھا کہ ان کی اصلی حیثیت کیا ہے۔

ان میں اکثر چھوٹے لوگ آسمان سے گرے کہ گرتے ہی اسمبلی میں اٹک گئے اور اسمبلی سے اڑان کی تو سیدھے کابینہ میں اتر گئے۔ گھریلو ملازموں کی ذہنیت رکھنے والے کئی نوجوان تو اس تیزی سے اڑ رہے تھے کہ لگتا تھا کہ خاندانی پیشہ ہی ہوا میں اڑنا ہے۔ میر قاسم نے اپنی قر. دیکر ان سبھوں کے پر کاٹ دئے اور ہر ایک کو معلوم ہوا کہ اس کی قیمت کیا ہے۔ میٹنگ ختم ہوئی تو شیخ محمد عبداللہ، مرزا محمد افضل بیگ، سید میر قاسم، شمیم احمد شمیم اور میں وزیر اعلا کی رہائش گاہ کی طرف چل پڑے۔ جہاں سید میر قاسم رہتے تھے۔ میر قاسم نے شیخ صاحب سے پوچھا۔ "آپ کب یہاں آرہے ہیں"؟ تو شیخ صاحب نے برملا کہا کہ قاسم صاحب آپ میرے بھائی ہیں، آپ اسی سرکاری رہائش گاہ میں رہیں گے۔ مجھے یہاں آنے کی ابھی ضرورت نہیں اور وہ اس پر اصرار کرتے رہے۔ شمیم احمد شمیم اور میں نے بھی اصرار کیا۔ بعد میں جب سب لوگ چلے گئے تو میں نے میر قاسم سے پوچھا کہ آپ شیخ صاحب کی پیشکش پر اسی عمارت میں رہنے سے کیوں انکار کر رہے ہیں تو انہوں نے کہا۔ تم شیخ عبداللہ کو جانتے نہیں ہو۔ یہ چھوٹے دل کا آدمی کل دھکے دیکر مجھے یہاں سے نکال دے گا۔ دراز قد ہونے کا مطلب وسعت قلبی نہیں ہے۔ میں ایک طویل مدت سے شیخ صاحب کو جانتا ہوں اور مجھ اپنی عزت پیاری ہے۔ میں نے کل ہی اپنے بھائی سعید حسین (جو کہ قانون ساز کونسل کے چیرمین تھے) کے یہاں اپنا ذاتی سامان بھیج دیا ہے اور میں نے کوٹھی خالی کر دی ہے۔"

شام کو پردیش کانگریس کمیٹی کی طرف سے شیخ صاحب کے اعزاز میں ڈنر دیا گیا اور اس دن ریڈیو نے شیخ محمد عبداللہ کا قوم کے نام پیغام ریکارڈ کرلیا تھا۔ گانے بجانے کا پروگرام بھی تھا۔ ایک نوجوان گائکہ فیض احمد فیض کی غزل سنا رہی تھی کہ ریڈیو سے پیغام نشر ہوا اور ایک دھماکہ ہوا" میں تمام حرام خور سرکاری ملازموں کو وارننگ دیتا ہوں" ابھی شیخ صاحب نے وزیر اعلا کے عہدے کا حلف بھی نہیں اٹھایا تھا کہ انہوں نے حرام خور ملازموں کا محاسبہ شروع کیا۔ گائکہ اپنی مستی میں گا رہی تھی کہ مرزا افضل بیگ نے مجھے بلایا اور کان میں چپکے سے کہا" گائکہ سے کہو کہ اب یہاں سے چلی جائے۔ دیکھتے نہیں کہ شیر کشمیر کے چہرے سے جوانی کیسے پھوٹ کر گائکہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہے۔"

www.taemeernews.com

۲۲ برسوں کے بعد کشمیر میں ہندوستان مخالف طاقتور آواز خاموش ہو گئی تھی اور سیاسی زندگی ایک نئے راستے پر چل پڑی تھی۔ اس سے انکار نہیں کہ محاذ رائے شماری کو توڑ کر نیشنل کانفرنس بنائی گئی لیکن اس نیشنل کانفرنس کا کردار اس نیشنل کانفرنس سے یکسر مختلف تھا جس نے تحریک آزادی کی جنگ لڑی تھی اور کشمیر کو موروثی حکمرانی سے آزاد کیا تھا نئی نیشنل کانفرنس ہندوستان مخالف سیاست کے شکم سے پیدا ہوئی جبکہ پرانی نیشنل کانفرنس ہندوستان کی سیکولر جمہوری تحریک سے متاثر تھی۔ محاذ کے توڑے جانے کے بعد صرف نام بدل گئے تھے ورنہ نئی بوتلوں میں پرانی دیسی شراب تھی۔ محاذ کے لیڈر اور اس کے ہزاروں کارکن جو ہندوستان سے نفرت اور کانگریس کے خلاف نفرت آمیز تحریک کی پیداوار تھے ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ نئے ماحول میں نئے انداز سے حالات پر غور و فکر کریں گے ان کے ساتھ ناانصافی تھی۔ جو ذہن ہندوستان کی مخالفت میں پختہ ہو گئے تھے وہ شیخ محمد عبداللہ کے رخ بدلنے سے کیسے تبدیل ہو سکتے تھے۔ یہی حال کانگریس کا بھی تھا کانگریس نے ایک طویل جدو جہد کی تھی محاذ کے خلاف۔ کانگرس نے عوامی غم و غصہ کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا وہ نئی صورت حال سے کیسے سمجھوتا کر سکتی تھی اور اس میں قصور شیخ محمد عبداللہ اور سید میر قاسم دونوں کا تھا۔ نہ شیخ محمد عبداللہ نے کشمیری عوام کو سمجھایا کہ رائے شماری کا نعرہ کیوں آؤٹ آف ڈیٹ ہے اور نہ ہی سید میر قاسم کانگریسیوں کو یہ سمجھا سکے کہ شیخ محمد عبداللہ کو واپس قومی دھارے میں لانا کیوں ضروری ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کسی بھی قیمت پر اقتدار سنبھالے رکھنا چاہتے تھے اور سید میر قاسم ایکارڈ کی کامیابی کے لیے بے چین نظر آتے تھے۔ لیکن دونوں لیڈر کانگرس اور نیشنل کانفرنس کے درمیان ٹکراؤ کو ختم نہیں کر سکے۔ شیخ محمد عبداللہ مرکز یعنی مسز اندرا گاندھی سے خوفزدہ تھے اس لئے بے غیرتی کی حد تک ان کے ہر حکم پر سرخم کر دیتے تھے۔ اور سید میر قاسم کمزور پوزیشن کی وجہ سے نازک مرحلوں پر مسز گاندھی سے ٹکر لینے کی پوزیشن میں نہیں تھے اور یہی وجہ ہے کہ ایکارڈ کامیاب نہیں ہوا۔

www.taemeernews.com

سیاسی آوارہ گردی کے بعد باب ۱۵

۲۶ فروری کو شیخ محمد عبداللہ، محاذ رائے شماری کے صدر مرزا محمد افضل بیگ، ٹھاکر دیوی داس اور صنم نربو نے کابینہ کے درجہ کے وزیروں کی حیثیت میں حلف اٹھایا؟ یہ چاروں نہ تو کانگریس کے اور نہ ہی اسمبلی کے ممبر تھے اور بقول شیخ محمد عبداللہ کے "میرے خیال میں یہ پارلیمانی جمہوریت کی تاریخ میں ایک انوکھی مثال تھی کہ قانون سازیہ کے دونوں ایوان موجود ہوں اور کابینہ کے ایک بھی رکن کا تعلق دونوں ایوانوں سے نہ ہو۔ ٹھاکر دیوی داس اس وقت ریاستی ہائی کورٹ کے جج تھے۔ صنم نربو پیشہ کے لحاظ سے انجینئر تھے اور اس وقت منگولیا میں ہندوستان کے سفیر تھے۔ ٹھاکر دیوی داس کے بارے میں خود شیخ صاحب نے کہا کہ میں نہ تو ٹھاکر دیوی داس کو جانتا تھا نہ مجھے معلوم تھا کہ وہ کون ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حلف برداری سے قبل انھوں نے مرزا محمد افضل بیگ سے پوچھا کہ "ٹھاکر دیوی داس کون ہیں" دراصل شیخ محمد عبداللہ اپنی سیاسی زندگی میں جذباتی فیصلے لیتے رہے ہیں اور انھوں نے کبھی بھی اپنے ساتھیوں سے مشورہ لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ جس شخص کو وہ جانتے بھی نہیں تھے۔ جس کو وہ پہچانتے بھی نہیں تھے اسکو بھی انھوں نے اپنی کابینہ کا ممبر بنالیا۔ یہ ذہنی کجے پن کی علامت نہیں تو اور کیا ہے۔

راج بھون میں حلف اٹھانے کے بعد جموں کے سول سیکریٹیریٹ میں ایک عوامی جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے صدر دیو کانت بروا نے کی۔ دیو کانت بروا کو اس زمانے میں LAUGHING BUDDHA کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ دیو کانت بروا حکمراں پارٹی کے صدر ہوتے ہوئے بھی چاپلوس قسم کے سیاسی لیڈر تھے اس جلسہ میں انھوں نے شیخ محمد عبداللہ کو "شیر ہند" کا خطاب دیا۔ جس کا جواب شیخ محمد عبداللہ نے غیر مہذب الفاظ میں دیا۔ " کانگریس کی سفید ٹوپی پہننے والے ڈاکو ہیں، یہ ٹوپی سرمایہ کمانے کی ایک مشین بن گئی ہے۔"
اپنی تقریر میں شیخ محمد عبداللہ نے کہا کہ :

"اکیس سال کے طویل وقفے کے بعد میں آج ایک بار اور ریاستی انتظامیہ کی ذمہ داریاں سنبھال رہا ہوں۔ اس دوران مجھ پر، میرے ساتھیوں پر اور آپ پر کیا گزری اس سے سبھی واقف

www.taemeernews.com

ہیں اور میں یہ شکایت دہرا کر آپ کی سمع خراشی نہیں کرنا چاہتا۔۔۔۔۔۔۔ میں اس مرحلے پر ان واقعات و شخصیات پر بھی کوئی فیصلہ صادر کرنے سے احتراز کروں گا جو اگست ۱۹۵۳ء میں میری گرفتاری اور اس کے بعد رونما ہونے والے حالات کے ذمہ دار تھے۔ میں یہ فیصلہ مستقبل کے مورخ اور آنے والی نسلوں پر چھوڑ دیتا ہوں کہ وہی اس بارے میں بے لاگ اور غیر جانب دارانہ رائے دینے کے قابل ہو سکتے ہیں۔۔۔۔۔ میری ساری زندگی چند بنیادی قدروں کے تحفظ اور اپنے ہم وطنوں کی عزت و آبرو کے لئے وقف ہے اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اکیس سال پہلے اقتدار کو ٹھکرا کر آج اکیس سال بعد اقتدار سنبھالنا میری نگاہوں میں انھیں قدروں کے تحفظ اور مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے گذشتہ بیس بائیس برسوں کی بد انتظامی اور بے راہ روی سے پیدا شدہ صورت حال کے تصور نے مجھے بہت دنوں تک اس کشمکش میں مبتلا کر رکھا تھا کہ مجھے ان حالات میں وزارت کی ذمہ داریاں سنبھالنی چاہئے یا نہیں۔ مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ میں ایک نقاد تماشائی بن کر دوسروں کی غلطیوں پر حرف گیری کرتا اور حب الوطنی احساس فرض اور دیانت داری کا تقاضا تھا کہ ذاتی عافیت اور مصلحت کی سطح سے بلند ہو کر بگڑی ہوئی صورت حال کو مزید بگڑنے سے روکنے اور غریب عوام کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لئے مجھے حالات کی سنگینی اور مسائل کی پروا کئے بغیر آگے آنا چاہئے۔ ایک فرار کا راستہ تھا اور دوسرا پیش قدمی کا اور ماضی گواہ ہے کہ میں نے انتہائی نامساعد اور پیچیدہ ترین صورت حال میں نئی ذمہ داریاں سنبھالنے سے گریز نہیں کیا ہے۔"

رائے شماری کے نعرے کو دفن کر کے شیخ محمد عبداللہ نے پاکستان سے وہ لاٹھی چھین لی تھی جس کے بل پر وہ ہندوستان کو بین اقوامی اداروں میں پچھاڑنے کا عادی ہو چکا تھا ۲۲ برس تک وہ شیخ محمد عبداللہ کی بغاوت کو پالتا رہا۔ باغیوں کی پرورش کرتا رہا۔ کروڑوں روپے کی سرمایہ کاری کرتا رہا لیکن شیخ محمد عبداللہ نے کانگریس کی حمایت سے اقتدار سنبھال کر پاکستان کی اس محنت پر پانی پھیر دیا۔ پاکستانی حکمرانوں کے لئے یہ ایک ایسا صدمہ تھا جسے وہ برداشت نہیں کر سکے انہوں نے شیخ محمد عبداللہ کی اس "غداری" کے خلاف ریاست بھر میں مکمل ہڑتال کی کال دی اور یہ ہڑتال غیر متوقع طور پر کامیاب رہی۔ معمول کی زندگی معطل ہو گئی۔ سڑکیں ویران۔ لوگ گھر میں بیٹھے شیخ صاحب کی غداری پر سینہ کوبی کرتے رہے اور بزرگوں کا کہنا ہے کہ کشمیر کی تاریخ میں ایسا سیاہ ماتم کبھی نہیں منایا گیا گو کشمیریوں کی اس بغاوت نے شیخ محمد عبداللہ کو مایوس کر دیا لیکن انہیں اس کے باوجود اپنی قوم پر مکمل بھروسہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جس قوم کو وہ ۵۰ برس تک کبھی ایک نعرہ سے اور کبھی دوسرے نعرے سے بیوقوف بناتے رہے ہیں وہ قوم وقتی طور پر باغی ہو سکتی ہے لیکن واپس پھر ان ہی کے ریوڑ میں شامل ہو جائے گی۔ وہ جانتے تھے کہ جس قوم سے بخشی غلام محمد نے ہندوستان زندہ باد کے نعرے بلند کرنے کی مشق کرائی ہے

www.taemeernews.com

وہ قوم پاکستان کے احتجاج کے باوجود ان کو پھر اپنا قائد تسلیم کرے گی۔

شیخ محمد عبداللہ ایک شعلہ بیان مقرر تھے قرآن خوانی میں ان کے مدمقابل کوئی کھڑا نہیں رہ سکتا تھا اور پھر جب وہ سریلی آواز میں اقبال کی نظم خودی کو کربلند اتنا سناتے تھے تو اقبال کا قد چھوٹا اور شیخ عبداللہ کی خودی دراز قد نظر آتی تھی۔ ۳ مارچ کو شیخ محمد عبداللہ کا کارواں بہ راستہ بانہال سرینگر کے لئے روانہ ہوا۔ بہار کی آمد آمد تھی اور کشمیر سرما کی لمبی رات کے بعد رنگ و خوشبو کے خوب صورت دفتر پھر کھول رہا تھا اس روح پرور فضا میں عوام نے سرینگر تک کے راستے کو سجایا اور ہر جگہ لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ نظر آرہے تھے انسانی سروں کا امنڈتا طوفان، قدم قدم پر خوبصورت گیٹ اور چاروں طرف فلک شگاف نعرے "آؤہا آؤہا شیر ببر (یعنی شیر ببر آ گیا) یی کیری تی کیری بب کیری بب کیری (یعنی جو کرے گا بب کرے گا) ہلی کیری وانگن کیری بب کیری لولو (یعنی کشمیریوں کو کدو بنائے یا بینگن بنانے کا بب ہی کو اختیار ہے یہ سب کرنے کا۔) کشمیری زبان میں بب والد کو کہتے ہیں اور کشمیری مسلمان ایک مدت تک شیخ محمد عبداللہ عرف شیر کشمیر کو ہی بب سمجھتے رہے۔ جو قوم ایک فرد کو (وہ بھی ایسا فرد جس نے عمر بھر جمہوریت اور آزادی کی قسمیں کھا کھا کر اس قوم کو خوابوں کی دنیا کا دیوانہ بنایا) اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق اور اختیار دے، کیا وہ قوم جمہوریت اور آزادی کی آبیاری کرنے کی اہل ہو سکتی ہے۔ شیخ محمد عبداللہ نے کشمیری قوم کے ذہنوں کو اس حد تک یرغمال بنایا تھا کہ وہ ان کی وفات تک اپنے تمام مسائل اور اپنی تمام خواہشات کو لانگ لیو عبداللہ کے نعرے پر قربان کرتے رہے۔ کسی نے خاموشی سے پوچھا بھی نہیں کہ ۲۲ برس تک رائے شماری فوراً کراؤ کی رٹ لگاتے لگاتے سیکڑوں کو ہلاک کروایا اب اچانک رائے شماری کا نعرہ کیوں دفن کیا۔ اگر کسی نے احتجاج بھی کیا وہ لانگ لیو کے نعرے میں کھو گیا۔ اس موقع پر شیخ محمد عبداللہ نے سرینگر کے تاریخی لال چوک میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "اس امر کے باوجود کہ بعض لوگوں نے طرح طرح کی افواہیں پھیلا کر آپ کو پریشان کرنے کی کوشش کی تھیں، آپ نے میرا پر محبت استقبال کر کے ان کو برجستہ جواب دیا ہے۔ سرحد کے پار پاکستانی حکمرانوں نے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کرنا چاہیں لیکن آپ ان کو خاطر میں نہ لائے آج سے چند دن پہلے پاکستان کے بڑے حکمرانوں نے اپنے "آزاد کشمیر" کے دورے میں کہا تھا کہ کشمیر پر اقوام کی قرارداد پر ذکر ہو تو میں نے اس پر سخت احتجاج کیا تھا اور کہا تھا کہ کشمیری عوام نے اپنا خون بہا کر اقوام متحدہ سے یہ حق منوایا ہے اور ہم ان قراردادوں کو ردی کا کاغذ نہیں سمجھتے ہیں۔ میں پاکستانی حکمرانوں سے پوچھتا ہوں کہ ریاستی عوام کے حق خود ارادیت کی بات کرتے ہوئے کیا انہیں یہ خیال آیا کہ وہ ان پندرہ لاکھ کشمیریوں کو جو ان کے آزاد کشمیر میں رہتے ہیں حق خود ارادیت

www.taemeernews.com

دیں۔ وہ پہلے اپنے گھر کو سنبھالیں پھر ہماری غمگساری کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ پاکستانی حکمرانوں کے قول و فعل میں ہمیشہ تضاد رہا ہے انہیں کشمیر کی خوبصورتی سے دلچسپی ہے۔یہاں کے عوام کے فلاح و بہبود سے نہیں۔ میں کشمیری عوام کو ان مصائب سے نجات دلانا چاہتا ہوں جو ایک مصنوعی قیادت اور فریب انگریز نظام کو ان پر مسلط کر کے پیدا کئے گئے ہیں۔اس وقت قانون کی عمل داری اور دیانت دارانہ نظام کی بحالی قوم کی فلاح و بقا کا اولین تقاضا بن گئے ہیں۔

شیخ محمد عبداللہ کے وزیر اعلا بنتے ہی کشمیر میں کانگریس کے خلاف ایک طویل مدت سے نفرت کی جو ایک دیوار کھڑی تھی ٹوٹنی شروع ہوئی۔ کانگریسی اب کھل کر سیاسی میدان میں اچھل کود کرنے لگے۔ سرگرمیاں بھی شروع کیں پہلے پتھر پڑتے تھے اب پتھر تو کیا مخالف نعرے بھی بند ہو گئے۔ وجہ یہ تھی کہ جو موقف کانگریس نے ۲۲ برسوں سے عوامی حمایت کے بغیر اپنایا تھا اسی موقف کو شیخ محمد عبداللہ نے محض اقتدار کے لئے اپنایا۔سید میر قاسم نے قربانی دے کر کانگریسیوں کو RESPECTABILITY دی لیکن اب بھی ایکارڈ میں محاذ رائے شماری تنظیم حائل تھی اور کابینہ کے وزیر مرزا محمد افضل بیگ بدستور اس کے صدر تھے۔ شیخ محمد عبداللہ نے اپنی آتش چنار میں اس صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ "انتظامیہ کے علاوہ ایک فعال اور مستعد سیاسی جماعت کا وجود ہمارے مقاصد اور منشور کی بجا آوری کے لئے نہایت اہم درجہ رکھتا تھا۔ نئے حالات میں محاذ رائے شماری کے کارکنوں نے محسوس کیا کہ ان کا دائرہ کار مفہوم معانی اور مقاصد کے اعتبار سے بدل گیا ہے۔ چنانچہ محاذ کے خصوصی اجلاس منعقدہ مجاہد منزل سری نگر میں ایک عظیم اکثریت کے ساتھ محاذ کو توڑنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اب نئی تنظیم بنانے کا سوال آیا تو میں نے نیشنل کانفرنس کو پھر سے زندہ کرنا مناسب سمجھا۔ ۱۹۵۲ میں میری گرفتاری کے بعد نیشنل کانفرنس پر بخشی غلام محمد نے غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا جس کی وجہ سے یہ جماعت خاصی بدنام ہو گئی تھی۔ ادھر غلام محمد صادق اور ان کے ساتھیوں نے دہلی دربار کو اپنی وفاداری کا زیادہ یقین دلانے کے لئے ریاست میں کانگریس کی شاخ منظم کی تھی۔ لیکن یہ جماعت کبھی بھی عوامی سطح پر مقبول نہ ہو سکی۔ میں بہرحال نیشنل کانفرنس کی احیا نو کا حامی تھا۔ چنانچہ میں نے مرزا محمد افضل اور سید میر قاسم کو نیشنل کانفرنس میں شمولیت کی دعوت دی۔ بیگ صاحب کے نام میں نے لکھا "اب جب کہ آپ نے محاذ کو توڑنے کا باقاعدہ اعلان کیا ہے ایک نئی سیاسی جماعت کے قیام کا مسئلہ ایک ذہنی ورزش نہیں بلکہ ایک ٹھوس اور فوری ضرورت کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔۔ تاکہ موجودہ سیاسی خلا دور ہو اور ہم ریاستی عوام کے ایک مثبت اقتصادی پروگرام اور صحت مند سیاسی نظام کا وہ خاکہ پیش کر سکیں جس کی خاطر ہم نے اقتدار کی ذمہ داریاں سنبھالی ہیں۔ نئی جماعت کا فیصلہ کرتے ہوئے ہمیں اپنے بنیادی مقاصد، اپنی جدوجہد کی تاریخ، اپنے سیاسی رول

www.taemeernews.com

کی اہمیت، اپنی انفرادیت اور اپنے ماحول کے تقاضوں کو مد نظر رکھنا ہو گا۔ ہمیں کسی قیمت پر یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم ایک شاندار ماضی اور قابل فخر میراث کے مالک ہیں اور ہمیں اس تاریخی تسلسل کو درہم برہم نہیں کرنا چاہیے، جس پر ہماری عزت اور عظمت کا مینار قائم ہے کیا ہم اپنے ماضی سے صرف اس لئے دست بردار ہو جائیں کہ ہماری جدو جہد کے ایک اہم ترین موڑ پر کچھ رہزنوں نے ہمارے قافلے پر شب خون مارا تھا۔۔۔۔ وہ دوست جو نیشنل کانفرنس کے اس دور سے خائف ہیں کہ جو ۱۹۵۳ء کے بعد اس سے وابستہ ہیں ان کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ ۱۹۴۷ء کے خون آشام دور میں بہت سے مندروں، مسجدوں اور عبادت گاہوں پر بھی غاصبوں اور لیٹروں نے جبراً قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن اس قبضے سے نہ ان عبادت گاہوں کی تاریخ مٹ گئی اور نہ ان کا تقدس۔"

قاسم صاحب کے نام میرے خط کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ ہو :

"میں پورے خلوص اور صدق دل کے ساتھ آپ کو اور آپ کے دوسرے ساتھیوں کو دعوت دیتا ہوں کہ فروعی اختلافات، ذاتی ترجیحات، ماضی کی تلخیوں اور فرضی اندیشوں کو بھول کر آپ بھی نیشنل کانفرنس میں شامل ہو کر اپنی اس عظیم میراث کے وارث بن جائیے کہ جو ہم سب کے لئے باعث افتخار اور قابل اعتبار سرمایہ ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ آپ اس وقت تک ایسی سیاسی تنظیم سے وابستہ ہیں جو اپنی شاندار روایات کے اعتبار سے ملک کی سیاسی تاریخ میں اہم حیثیت کی مالک ہے۔ لیکن اگر اس کے باوجود میں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو نیشنل کانفرنس میں شمولیت کی دعوت دے رہا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کانگریس اور نیشنل کانفرنس کے تعلقات میں ہمیشہ رقابت کی بجائے رفاقت کا جذبہ کارفرما رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہاراجہ کی مطلق العنان حکومت کے خلاف نیشنل کانفرنس کو ہمیشہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے سپہ سالاروں کی حمایت اور تعاون حاصل رہا۔ اسی طرح کانگریس اور نیشنل کانفرنس کے درمیان باہمی اعتماد، تعاون اور اشتراک عمل کی ایسی فضا قائم تھی کہ اس بات کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ دونوں جماعتوں کو مدغم کیا جائے ۔۔۔۔ ۱۹۵۳ء کے بعد نیشنل کانفرنس کے رول اور ۱۹۵۶ء میں کانفرنس کو کانگریس میں مدغم کرنے کے فیصلے کے باری میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ ان میں سیاسی تقاضوں کا نہیں بلکہ وقتی مصلحتوں کا دخل تھا۔ اب جب کہ خوش قسمتی سے فضا بدل گئی ہے اور آپ کے اور ہمارے سامنے وہ مجبوریاں نہیں رہیں ہمیں اپنی محبوب تنظیم نیشنل کانفرنس کو ازسرنو احیا کر کے ان قدروں کو پھر سے زندہ کرنے میں مزید تاخیر نہیں کرنی چاہئے کہ جن سے ہماری تاریخ اور ہماری آنے والی نسلوں کی تقدیر وابستہ ہے۔"

محاذ کے کارکن تو خیر میری آواز پر لبیک کہہ کر نیشنل کانفرنس میں شامل ہو گئے۔ لیکن پردیش کانگرس کے منصب دار بھلا کیوں اپنے مفادات سے دست بردار ہو کر چاندی کی اس بہتی

www.taemeernews.com

ہوئی گنگا سے کنارہ کش ہو جاتے جو پردیش کانگرس کے نام پر مرکزی سرچشمے سے پھوٹتی تھی اور ان کے گھروں کو سیراب و شاداب کرتی تھی۔ دوسرے وہ میرے اقتدار سنبھالنے کو ایک عارضی دور سمجھتے تھے اور ان کے ایک گھر کے بھیدی کے مطابق جس نے اشرفیوں کی بندر بانٹ پر استعفیٰ دے کر ان کے خلاف متوازی تنظیم کھڑی کر لی وہ دہلی کے کسی ڈاکٹر کی رپورٹ پر آس لگائے بیٹھے تھے کہ میری صحت مجھے چند ماہ سے زیادہ زندہ رہنے کی اجازت نہ دے گی اور اس کے بعد وہ پھر اپنی کھوئی ہوئی جنت حاصل کر پائیں گے۔ انہوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ڈھانے پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔ لیکن نیشنل کانفرنس اپنے قیام کے فوراً بعد ریاست بھر میں مقبول ترین عوامی تنظیم بن گئی انہی دنوں مسز اندرا گاندھی سرینگر آ گئیں تو انہوں نے ایمپوریم باغ میں کانگریسیوں کے ایک جلسے میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر میں کانگریس کو توڑا نہیں جا سکتا اور اگر یہاں صرف ایک ممبر اس کے ساتھ رہے تو پھر بھی یہ جماعت یہاں قائم رہے گی۔ کانگریسی حکومتوں کے خلاف یہاں بد دیانتی اور بد عنوانی کے شدید الزامات تھے۔ مسز گاندھی نے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے زبان کی ایک ہی جنبش سے اپنے لاڈلوں کو یہ کہہ کر بری کر دیا کہ "گندگی کہاں نہیں ہوتی۔" کسی عالیشان قالین کا کونہ اٹھا کر دیکھئے۔ اس کے نیچے گرد کی موٹی تہ جمی نظر آئے گی۔" مسز گاندھی کی اس تقریر نے میرا سارا اناڑل دور کر دیا اور اس کے چند ہی روز بعد لال چوک میں نیشنل کانفرنس کا ایک عظیم جلسہ منعقد ہوا، جہاں میں نے برسر عام نیشنل کانفرنس کی ابتدائی رکنیت کا فارم بھر کر اس میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ میں نے جلسے میں کہا،

"جہاں مسز اندرا گاندھی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی جماعت کے وجود اور اس کی تشکیل کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں وہاں اس فیصلہ کو حتمی طور پر قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار صرف یہاں کے لوگوں کو ہے اور کوئی بڑی سے بڑی طاقت ان پر اپنا فیصلہ نہیں تھوپ سکتی۔ نیشنل کانفرنس کے ساتھ ہماری تحریک اور تاریخ کے سنہرے لمحے وابستہ ہیں اور ہم اپنا راستہ اختیار کر کے اسی تنظیم کو مضبوط بنانے کا عہد کرتے ہیں، یہی مسز اندرا گاندھی کے چیلنج کا میری طرف سے جواب ہے۔"

میں نے اسی جلسے میں نیشنل کانفرنس کی ابتدائی رکنیت کا فارم حاصل کیا۔ نیشنل کانفرنس کی تنظیم میں اس وقت اور استحکام پیدا ہو گیا جب ۱۹۷۶ء میں جموں کے سالانہ اجلاس میں مجھے اس کا پھر سے صدر چن لیا گیا میرا نام اس صدارت کے لئے سبکدوش ہونے والے صدر بیگ صاحب نے تجویز کیا تھا۔ حالاں کہ میں اس وقت انتظامیہ کے کام کاج کے ساتھ تنظیم کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا خاصا مشکل خیال کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کا اظہار اپنے خطبۂ صدارت

www.taemeernews.com

میں ان الفاظ میں کیا :

" آپ اپنی محبت اور عقیدت کے جوش میں میری عمر، میری صحت اور میری غیر معمولی مصروفیات کو بھی نظر انداز کر گئے۔ آپ شاید بھول گئے کہ میری عمر کو پہنچ کر انسان کا جسم اور اس کے کاندھے بہت زیادہ بوجھ اٹھانے کے اہل نہیں رہتے۔ آپ نے ان ذمہ داریوں کو بھی ملحوظ خاطر نہیں رکھا جو ریاستی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے مجھ پر عائد ہوتی ہیں۔"

www.taemeernews.com

کانگریس نے ۱۹۷۵ میں شیخ محمد عبداللہ کو اقتدار سونپ کر ایک نیا جنم لیا تھا۔ اس کا وقار بحال ہوا تھا۔ نالی کا کیڑا راتوں رات ایک معزز شہری بن گیا تھا۔ لوگوں میں کانگریس کے بارے میں شکوک و شبہات کسی حد تک دور ہو گئے تھے اور ان میں یہ احساس پیدا ہو رہا تھا کہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کو حتمی قرار دینے کے لئے اقتدار کا طوق گلے میں لٹکانا ضروری نہیں ہے، اقتدار سے علاحدہ رہ کر بھی سیاسی جماعتیں اپنے اصولوں پر قائم رہ سکتی ہیں لیکن مرکز میں کانگریس سرکار گر جانے کے بعد مقامی کانگریسیوں نے شیخ محمد عبداللہ کی حمایت واپس لے کر سیاسی خود کشی کی، کشمیریوں کو اپنے موقف میں تبدیلی لانے پر مجبور کر دیا اور وہ یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوئے کہ کانگریسی اقتدار کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اگر شیخ محمد عبداللہ کی حمایت واپس نہ لی جاتی تو آج ریاست کا سیاسی ماحول مختلف ہوتا۔ شیخ محمد عبداللہ اور ان کی سرکار نکمی ثابت ہو رہی تھی۔ کرپشن تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اور شیخ محمد عبداللہ کا خاندان سرمایہ کاری کی دوڑ میں تیز بھاگ رہا تھا۔ محاذ رائے شماری جس کو نیشنل کانفرنس کا لباس پہنا دیا گیا تھا اس کے کارکن اور لیڈر بھی بے رحمی کے ساتھ دولت لوٹنے میں سرگرم تھے۔ ۲۔ ہی برس میں شیخ محمد عبداللہ کی قد آور شخصیت داغدار ہو گئی تھی اور اگر کانگریس صبر و تحمل سے کام لیتی تو ریاستی عوام خود ہی شیخ محمد عبداللہ کے خلاف فیصلہ صادر کر دیتے۔ اس لئے نہیں کہ کانگریسی ایماندار تھے یا ان کے زمانے میں لوٹ کھسوٹ اور کرپشن نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ کانگریسی دور میں عوامی مسائل کی طرف بھی توجہ دی جاتی تھی اور عوامی خواہشات کا بھی احترام ہوتا تھا۔ کانگریس نے حمایت واپس لیکر شیخ محمد عبداللہ کی سیاسی عمر دراز کر دی۔

www.taemeernews.com

باب ۱۶ نیا دور

شیخ محمد عبداللہ کو اقتدار سونپ دینے کا کانگرس نے ایک جرات مندانہ فیصلہ تو کیا لیکن کانگرس کارکنوں اور لیڈروں میں یہ احساس تیزی کے ساتھ ابھرنے لگا کہ حکومت ہندوستان نے ان کے ساتھ وشواش گھات کیا ہے۔ گو اخبارات اور محفلوں میں وہ یہ تاثر ضرور دے رہے تھے کہ کانگریس نے عظیم قربانی دے کر ٹکراؤ کے ماحول کو ختم کرایا ہے لیکن اندر اندر کانگرسی مایوس ہو رہے تھے۔ صدر کانگریس محمد ایوب خان جب کانگرس کی سرکار تھی سرمایہ کاری کے باوجود کانگریس تنظیم کو مضبوط نہیں بنا سکے تھے۔ نئے دور میں تو وہ مکمل طور سے تنظیم اور کارکنوں سے کٹ گئے۔ اکثر کانگریسیوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کس طرح کی سیاسی تبدیلی آئی ہے اور اب ان کا رول کیا ہے۔ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کو کانگریسیوں کے یہ سسکتے احساس اور کچلی جارہی خواہشات کے بارے میں اطلاعات ملتی رہتی تھی اسی لئے انھوں نے پہلے جموں اور بعد میں سرینگر میں کانگرسیوں کی ہمت بڑھائی۔ جموں میں ڈاکٹر کرن سنگھ کے محل میں صاف طور سے کہا کہ " کانگرسیوں کو بد دل نہیں ہونا چاہیے۔ ہم نے شیخ صاحب کو اقتدار سونپ کر CALCULATED RISK لیا ہے گھبرانے کی کوئی بات نہیں میں ہوں نا۔ اس میٹنگ میں پریس موجود نہیں تھا۔ اس روز اس میٹنگ کے بارے میں جو پریس نوٹ شائع ہوا اس میں اخبارات کو یہ اطلاع دی گئی کہ مسز گاندھی نے کانگرسی کارکنوں پر یہ زور دیا کہ وہ شیخ صاحب کے ساتھ ایکارڈ کو مضبوط کریں اور شیخ صاحب کی مکمل حمایت کریں۔

اسی روز شام کو جموں کے پریڈ گراؤنڈ میں کانگرس اور نیشنل کانفرنس کا مشترکہ جلسہ منعقد ہوا۔ پہلی بار کانگریس اور نیشنل کانفرنس کے جھنڈے ایک ساتھ لہرانے لگے۔ یہ جلسہ اس وجہ سے اہم ہے کہ اقتدار سنبھالے رکھنے کے لیے شیخ محمد عبداللہ مسز گاندھی کے قدموں پر اس بے غیرتی کے ساتھ جھک گئے کہ ہم جیسے لوگ مجروح احساسات سے چیخ پڑے۔ شیخ صاحب نے کہا "مسز گاندھی ہماری تاج ہے۔ ہم سب ان کے پیروکار ہیں۔ وہ ایک دن کے لئے آتی ہیں ہمیں تسلی نہیں ہوتی" تقریر ختم ہونے کے بعد انہوں نے خود اسٹیج سے نعرے لگائے اندرا گاندھی زندہ باد اور لوگوں پر زور دیا کہ وہ اس کا جواب اتنی اونچی آواز میں دیں کہ نئی دہلی کے ایوانوں میں بھی

www.taemeernews.com

سنا جائے کہ جموں و کشمیر میں اندرا گاندھی زندہ باد کے نعرے کس طرح گونج رہے ہیں۔

شیخ صاحب کے اس نئے رخ نے نیشنل کانفرنسیوں کو تو مایوس کر دیا مگر کانگریسی ان کی اس چاپلوسی پر خوشی سے ناچنے لگے البتہ سید میر قاسم مایوس تھے۔ ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ شیخ محمد عبداللہ جیسے بے پناہ عوامی حمایت حاصل ہے وہ محض اقتدار کے لئے اس طرح کی چاپلوسی کر سکتے ہیں۔

کانگرس کے زمانے میں نہ تو مرحوم غلام محمد صادق نے اور نہ ہی سید میر قاسم نے کبھی کسی کے زندہ باد کے نعرے لگائے۔ نعرے بازی کے لئے تجربے کار نعرے باز مقرر تھے۔ مسز اندرا گاندھی کی آمد سے کانگریسیوں میں نئی امید پیدا ہوئی کہ ہائی کمانڈ ان کی روزی روٹی کا بندوبست جاری رکھے گا۔ شیخ محمد عبداللہ بھی کانگرسیوں کی بدحواسی سمجھ رہے تھے اور وہ بھی راستے کے کانٹوں کو ہٹانے پر غور کر رہے تھے۔ خود شیخ صاحب نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے" کانگریسی اقتدار سے الگ ہو کر ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے اور کئی بار مرکز نے ان کی اس بڑھتی ہوئی بے چینی کی طرف میری توجہ مبذول کرائی۔ اس لئے کابینہ میں توسیع کے وقت میں نے کانگریسیوں میں سے پنڈت منگت رام، سردار رنگیل سنگھ، چھجو رام، چودھری محمد اسلم، کاچو محمد علی اور بیگم زینب کو وزیر مملکت مقرر کیا۔ کانگرسی لیڈر وزیر بنتے ہی شیخ محمد عبداللہ کی جھولی میں گر پڑے اور وہ یہ بھول گئے کہ وہ کانگرس کے نمائندے ہیں انہوں نے نیشنل کانفرنس کے وزیروں سے شہ پا کر کانگریسیوں کے ساتھ سوتیلا برتاؤ شروع کیا اور کانگرس تنظیم سے تعلقات قریب قریب توڑ لیے۔

سید میر قاسم نئے حالات میں کانگرس صدر ایسے کسی لیڈر کو بنانا چاہتے تھے جو نظریاتی طور سے اس بات کو قبول کر چکے تھے کہ نئی سیاسی تبدیلی ملک، ریاست اور کانگرس کے مفاد میں ہے اور ان کی نظر میں مفتی محمد سعید ایسے نوجوان لیڈر تھے جو ان حالات میں کانگرس کو نئی سمت دے سکتے تھے لیکن روایتی لیڈر شپ اس کے خلاف تھی۔ ایک طرف عبدالغنی لون صدر بننے کے امیدوار تھے تو دوسری طرف خواجہ شمس الدین کے ساتھ ساتھ صادق گروپ کی طرف سے محمد ایوب خان بھی میدان میں تھے۔ سید میر قاسم کانگریس سیاست میں بے وزن لیڈر تو تھے نہیں اکثریت ان کے ساتھ اب بھی تھی حالانکہ سینئر لیڈر غلام رسول کار خود صدر بننے کے خواہاں تھے لیکن کھل کر سامنے نہیں آ رہے تھے۔ اسی دوران آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے صادر دیو کانت بروا کشمیر آئے گو وہ کشمیر میں کانگریس کے تنظیمی معاملات کا جائزہ لینے کے لیے آئے تھے لیکن ان کا زیادہ تر وقت شیخ محمد عبداللہ کے دربار میں ہی گزر رہا تھا۔ سرینگر کے گیسٹ ہاؤس میں بروا صاحب کا دربار منعقد ہوا اور کانگریسیوں سے انٹرویو کا سلسلہ شروع ہوا۔ مفتی

www.taemeernews.com

محمد سعید کو اگر کسی سے خطرہ تھا تو وہ عبدالغنی لون سے تھا اور اس خطرہ کو کم کرنے کے لئے شیعہ لیڈر مولوی افتخار حسین انصاری میدان میں آ گئے اور دیو کانت بروا کے سامنے انھوں نے دلائل سے ثابت کر دیا کہ "عبدالغنی لون کانگریس میں دراندازہے وہ تو سی آئی اے کا ایجنٹ ہے ۔" خدا گواہ ہے کہ مولوی افتخار جانتے تھے کہ وہ خود بھی کانگریسی نہیں ہیں۔ انہیں کانگریس کی سیاست پر بھی کوئی اعتقاد نہیں تھا لیکن تھے دور اندیش۔ وہ جانتے تھے کہ مفتی محمد سعید مستقبل میں خاص رول کرنے والے ہیں اس لئے انہوں نے مفتی محمد سعید کے حق میں اور عبدالغنی لون کی مخالفت میں ایسے دلائل پیش کئے کہ اگر آج بھی وہ اپنے ضمیر پر وزنی ہتھوڑے سے ضرب لگا دیں گے تو انہیں محسوس ہو گا کہ وہ ضمیر کشی کے مجرم ہیں۔ اس دربار میں نوجوانوں کے ایک گروپ کو بروا صاحب کے درشن کرنے کا موقع رات کے دو بجے ملا ان کے ساتھ جب صدارت کے مختلف ناموں کا ذکر ہوا تو انہوں نے نفرت کے ساتھ کہا کہ "سب کا نام لو لیکن اسٹاپ فروش شمس الدین کا نام مت لو۔ سید میر قاسم بھی ملاقات کے لیے آئے لیکن بروا صاحب نے ایسا برتاؤ کیا کہ جیسے آقا اپنے ملازم سے کرتا ہے۔ اس بے عزتی کو سبھوں نے محسوس کیا لیکن کر بھی کیا سکتے تھے۔ کانگریسی بیچارے تو ویسے ہی مرکز کے غلام تھے۔ کٹھ پتلی کی طرح ناچنا ہی انہوں نے عمر بھر سیکھا تھا۔ بروا صاحب کا دربار ختم ہوا اور چند ہفتوں کے بعد مفتی محمد سعید کو مرکزی کانگرس نے پردیش کمیٹی کا صدر نامزد کر دیا۔ مفتی محمد سعید کے صدر بنتے ہی تنظیم میں ایک نئی جان آ گئی۔ حالاں کہ غلام رسول کار نے مجھ سے کہا" میر قاسم ملا نے میری پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔ لیکن میں بھی معاف نہیں کروں گا بعد میں مفتی محمد سعید کو دیکھ لوں گا۔"

مفتی محمد سعید جو کل تک سید میر قاسم کی انگلی پکڑ کر مرکزی لیڈرشپ سے رابطہ قائم کیا کرتے تھے صدر بن کر براہ راست مرکز خاص کر مسز اندرا گاندھی کے ساتھ پائپ لائن جوڑنے کی کوشش کرتے رہے۔ مسز گاندھی بھی سید میر قاسم کے مقابلہ پر کسی اور لیڈر کو شیخ محمد عبداللہ کا قد گھٹانے کے لئے تیار کرنا چاہتی تھی اور مفتی محمد سعید یہ رول ادا کر سکتے تھے۔ مفتی محمد سعید بھی شیخ محمد عبداللہ اور کانگرسی وزیروں کی کارکردگی سے خوش نہیں تھے اور پھر کانگرس کے اندر ایکارڈ کے خلاف جارحانہ انداز سے آوازیں بھی اٹھ رہی تھیں۔ کرپشن تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا اور چغل خور اعلا سرکاری افسروں نے چڑھتے سورج کی پرستش شروع کر کے کانگریسیوں کے خلاف محاذ آرائی شروع کی تھی کانگرس کے جلسوں میں شیخ وزارت پر جو تابڑ توڑ حملے ہو رہے تھے، گو مفتی محمد سعید خود خاموش تھے لیکن کانگریس تنظیم ایک منصوبے کے تحت اپوزیشن پارٹی کا رول نبھا رہی تھی۔ خود شیخ صاحب نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ "نیشنل کانفرنس کی تنظیم نو سے کانگرسی حلقوں کی گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ میں کچھ شدت پیدا ہو گئی

www.taemeernews.com

انہوں نے حکومت اور نیشنل کانفرنس کے خلاف مہم تیز کر دی، وہ اس قول و قرار سے ضمیر کی کسی خلش کے بغیر منحرف ہونے لگے جو انہوں نے مجھے اقتدار کی ذمہ داریاں سونپتے وقت اور کابینہ میں اپنے نمائندے بھیجتے وقت کیا تھا" انہوں نے بڑی ڈھٹائی سے ان راشی افسروں کی حمایت بھی شروع کی جنہیں ہم نے انتظامیہ کی تطہیر کے مقصد سے چلتا کر دیا تھا۔ اسی دوران انہوں نے اپنی پارلیمانی پارٹی کا ایک علاحدہ لیڈر بھی چن لیا تھا (سید میر قاسم کے راجیہ سبھا ممبر بننے کے بعد گردواری لال ڈوگرہ کو اسمبلی پارٹی کا لیڈر بنایا گیا تھا) کانگریس مخالفت کے جوش میں اس حد تک گئی کہ انہوں نے اناج کی خود خرید مہم کو ناکام بنانے کے لیے ہاتھ پیر مارنے شروع کر دیئے۔ صورت حال کو بگاڑنے میں آل انڈیا ریڈیو کے دہلی، سرینگر جموں اسٹیشنوں نے بھی ان کی خوب حوصلہ افزائی کی۔

شیخ محمد عبداللہ کو سیاسی طور پر کمزور کرنے کے لیے پریس انفارمیشن بیورو نے دہلی ایکارڈ کی کاپیاں ہزاروں کی تعداد میں شائع کر دیں اور ان کاپیوں کو پردیش کانگریس کے ذریعہ تقسیم کر دیا گیا۔ دہلی ایکارڈ میں صاف طور سے وزیر اعظم اندرا گاندھی نے شیخ صاحب پر واضح کیا تھا کہ ۹۔ اگست ۱۹۵۳ سے قبل کی پوزیشن بحال نہیں کی جا سکتی۔ مقامی سرکردہ اخبارات کے مدیر اور صحافی جو سیاسی تبدیلی کے بعد بھی کانگریس سے ماہانہ وظیفے حاصل کر رہے تھے وہ کانگرس کی حکمت عملی کی بھرپور عکاسی کرتے تھے اور پھر کانگرس کی اپنی پروپیگنڈہ مشینری بھی چاق چوبند تھی۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ساتھ ساتھ قومی اخباروں کے نمائندوں کو کب اور کس طرح فیڈ FEED کرنا ہے اس میں یہ مشینری تربیت یافتہ تھی۔ اور پھر کانگرس میں پرانے کٹر قسم کے محاذی بھی اپنی ہندوستان نوازی ثابت کرنے کے لیے شیخ صاحب پر تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے اور ان میں عبدالرشید کابلی سر فہرست تھے جن کو مفتی محمد سعید نے ضلع کانگریس کمیٹی کا تنخواہ دار صدر بنایا تھا۔ ان کا شیخ عبداللہ کے خلاف ایک نکاتی الزام یہ تھا کہ وہ غیر پیداواری ذرائع پر رقومات خرچ کر رہے ہیں۔ یہ غیر پیداواری اصطلاح کا استعمال انہوں نے کب سیکھا یہ معلوم نہیں لیکن یہ معلوم ہے کہ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ تار تو مرکز سے ہل رہا تھا۔ اور ناچ رہے تھے کشمیر کے کانگریسی۔ بقول شیخ صاحب کے ------ آخر کار تصادم اور ٹکراؤ کی آوازیں دہلی کے ایوانوں میں گونجنے لگیں۔ کانگریس ہائی کمان کی نگاہ میں اس تصادم کو روکنے کا طریقہ یہ تھا کہ کچھ کانگرسی لیڈروں کو کابینہ کے درجے کا وزیر بنایا جائے میں نے اس شرط پر ایسا کرنے کی حامی بھر لی کہ نیشنل کانفرنس کے کچھ ساتھیوں کو بھی کابینہ کے درجے کا وزیر مقرر کیا جائے گا اس کے علاوہ میں اپنی ٹیم کے لیے کانگریسیوں کا انتخاب کرتے وقت اپنی پسند سے کام لوں گا۔ یہ جمہوری روایات کے عین مطابق تھا۔ لیکن دہلی کی حکمرانوں کو کشمیر میں اپنی من

www.taemeernews.com

مانیاں کرنے کا چسکا پڑ گیا تھا اس لیے یہ ان کے حسب دل خواہ نہیں تھا۔

www.taemeernews.com

چناؤ نتائج کا تجزیہ اس طرح کیا جانے لگا کہ کانگرس ایک ہندو جماعت ہے جس کا سیاسی اثر ورسوخ صرف جموں کے ہندو علاقے تک ہی محدود ہے حالانکہ اگر ڈالے گئے ووٹوں کی شرح کا تجزیہ کیا جائے تو وادی میں بھی کانگرس کے حق میں کافی ووٹ پڑے تھے کشمیر میں چناؤ مہم کے دوران متضاد رجحانات ابھر کر سامنے آئے تھے جہاں شیخ محمد عبداللہ کی جماعت نیشنل کانفرنس الحاق کو چیلنج کیے بغیر فرقہ وارانہ علاحدگی پسند لائنوں پر لوگوں کو اپنے حق میں منظم کر رہی تھی وہیں کانگرس ایک نیشنلسٹ پارٹی کی حیثیت سے چناؤ لڑ رہی تھی۔ ایک طرف سبز رومال میں پاکستانی نمک کی ڈلی نیشنل کانفرنس کی چناؤ مہم کی علامت بن گئی تھی تو دوسری طرف کانگرس کا ترنگا جھنڈا الحاق حامی اور سیکولر نظریات کی نشانی بن گیا تھا۔ نظریات کے اس ٹکراؤ میں بھی کانگرسی امیدواروں کا چناؤ میں ڈٹ کر مقابلہ کرنا جرأت کا کام تھا۔ کشمیر میں اپوزیشن امیدواروں میں دو امیدوار عبدالغنی لون اور عبدالرشید کابلی کامیاب ہوئے اور اس میں جنتا لہر کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ عبدالغنی لون اپنے حلقۂ انتخاب میں کافی مقبول تھے اور انہوں نے وہاں نیشنل کانفرنس کو RIGGING نہیں کرنے دی۔ عبدالرشید کابلی کی اپنی کوئی سیاسی ساکھ نہیں تھی وہ میر واعظ مولوی فاروق کے امیدوار تھے اور ان کی کامیابی ایک دوسرے ماڈل کے سبز رومال کا کرشمہ تھا۔ کانگرس کے امیدواروں کی شکست کا یہ لازمی نتیجہ نکلا کہ جموں کانگرس کو بالادستی حاصل ہو گئی اور ریاست کی تاریخ میں پہلی بار کشمیر کی قوم پرست قوتوں کو جموں کی بیساکھی کا استعمال کرنا پڑا۔ چناؤ کے بعد شیخ محمد عبداللہ میں یہ احساس شدت سے پیدا ہوا کہ نیشنل کانفرنس شیخ محمد عبداللہ ہے اور ان کی ذات ہی نیشنل کانفرنس کو زندہ رکھ سکتی ہے اس لیے انہوں نے اپنے خاندان کو نیشنل کانفرنس پر حاوی ہونے کا موقع دیا۔ اور اس میں انہوں نے اپنے قریبی ساتھی مرزا محمد افضل بیگ کو بھی نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ بیگ صاحب بھی اپنے خاندان کے لیے سیاسی زمین کی تلاش میں چل پڑے لیکن شیخ صاحب نے ایسا داؤ کھیلا کہ بیگ صاحب تلاش کرتے کرتے راستہ ہی بھول کر کھو گئے۔ کسی نے تلاش گمشدہ کا اشتہار بھی نہیں دیا۔

www.taemeernews.com

چاپلوسی قدم بوسی باب ۱۷

سیکرٹیریٹ کے دروازے کانگریسیوں کے لئے بند تھے۔ سفارشی دلالوں کی روزی روٹی چھن چکی تھی۔ درخواستوں پر سفارشیں لکھنے والے بناسپتی لیڈروں کی تجارت بند ہو گئی تھی اور کانگریس مرکزی قیادت پر دباؤ ڈال رہی تھی کہ وزارت میں کانگریسیوں کی شرکت کے بغیر حالات پھر سے بگڑ جائیں گے۔ مسئلہ نہ اصولوں کا تھا اور نہ ہی کسی کو حالات بگڑنے کی فکر تھی۔ سوال صرف پیٹ کا تھا اور شیخ محمد عبداللہ اپنے ۲۲ برسوں کے ساتھیوں کے خالی پیٹ بھرنے میں ہی مصروف تھے۔ کانگریسیوں کے پیٹ بھرنے کے اس اہم سوال کو حل کرنے کے لیے شیخ محمد عبداللہ اور دیو کانت بروا کے درمیان مذاکرات ہوئے اور چند کانگریسیوں کو کابینہ میں لینے کا فیصلہ کیا گیا۔ ناموں پر اتفاق رائے بھی ہوا۔ آگے کی داستاں شروع کرنے سے قبل یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ کانگریس کے اندر کسی طرح کی صف بندی ہو رہی تھی۔ کانگریس کی صدارت حاصل کرنے میں ناکامی کے بعد عبدالغنی لون نے شیخ محمد عبداللہ کی غیر مشروط حمایت پر زور دینا شروع کیا۔ محمد شفیع اوڑی اور محمد اشرف خان بھی عبدالغنی لون کی حمایت میں پیش پیش تھے۔ غلام رسول کار جو عبدالغنی لون کو اپنے لئے خطرہ محسوس کرتے تھے وہ کھل کر تو نہیں البتہ مفتی محمد سعید اور مولوی افتخار حسین انصاری کو استعمال کر کے عبدالغنی لون کو کانگریس کی بنیادی ممبر شپ سے معطل کرنے کے منصوبہ پر کام کر رہے تھے۔ یہ سمجھوتہ کامیاب ہوا اور عبدالغنی لون کو کانگریس سے خارج کر دیا گیا۔ محمد شیخ اوڑی اور محمد اشرف خان نے استعفا دے کر عبدالغنی لون کے ساتھ نیشنل کانفرنس میں شمولیت کی اور شیخ محمد عبداللہ نے ان کا استقبال کیا چونکہ مسز اندرا گاندھی کیلئے یہ سب سے بڑا چیلنج تھا۔ اپنی سوانح حیات آتش چنار میں شیخ محمد عبداللہ لکھتے ہیں کہ، کانگریس ہائی کمان کی نگاہ میں حکومت اور پردیش کانگرس کے درمیان تصادم روکنے کا ایک ہی طریقہ یہ تھا کہ کچھ کانگریسیوں کو کابینہ کے درجہ کا وزیر بنایا جائے، میں نے اس شرط پر ایسا کرنے کی حامی بھر لی کہ پھر نیشنل کانفرنس کے کچھ ساتھیوں کو بھی کابینہ کے درجے کا وزیر مقرر کیا جائے گا اس کے علاوہ اپنی ٹیم کے لئے کانگرسیوں کا انتخاب کرتے وقت اپنی پسند سے کام لوں گا۔ میں نے کانگرس کے علی محمد نائک اور عبدالغنی گونی کی تقرری پر اپنی

www.taemeernews.com

رضامندی کا اظہار کیا۔ پردیش کانگرس کے کچھ اہم ممبران اسمبلی عبدالغنی لون، محمد شفیع اوڈی اور محمد اشرف خاں نیشنل کانفرنس میں شامل ہو گئے تھے میں ان نوجوانوں کی صلاحیتوں کو بھی مبینہ طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا لیکن کانگریس ان کو انتظامیہ میں کوئی ذمہ داری سونپنے کے خلاف تھی۔

نئی دہلی میں کابینہ میں رد وبدل کا فیصلہ کر کے سرینگر میں شیخ محمد عبداللہ نے کانگریس اور نیشنل کانفرنس امیدواروں کو اطلاع دی کہ ان کو کابینہ میں لیا جائے گا۔ کانگریس کے ناموں کے ظاہر ہوتے ہی پردیش کانگریس کمیٹی میں مخالفانہ سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ وزیر بننے والوں نے نئے سوٹ سلوا لئے۔ اور جو مایوس تھے وہ دیو کانت بروا کو کانگریس دشمن قرار دیتے رہے۔ نئی دہلی میں محمد شفیع قریشی، ڈاکٹر کرن سنگھ اور اوم مہتا بھی شیخ مخالف کیمپ میں شامل ہو گئے اور انھوں نے مسز گاندھی کو اس بات پر قائل کر دیا کہ شیخ محمد عبداللہ کی اس کاروائی سے کانگریس کا جنازہ نکل جائے گا۔ شیخ محمد عبداللہ ان نئی سازشوں سے بے خبر تھے اور انھوں نے حلف برداری کی تاریخ اور وقت کا اعلان کر دیا۔ ۲۵۔۱ اکتوبر ۱۹۷۶ء کی صبح کو راج بھون میں حلف برداری کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ تیاریاں اتنی مکمل تھیں کہ علی محمد نائک اپنے حلقہ انتخاب تراں سے سیکڑوں کارکنوں کو بسوں میں بھر کر سرینگر لے آئے تا کہ حلف برداری کے بعد ان کا شاندار استقبال ہو سکے۔ لیکن ۲۴ اکتوبر کی نصف شب کو مسز گاندھی کی صدارت میں ایک میٹنگ ہوئی جس میں سید میر قاسم، محمد شفیع قریشی، ڈاکٹر کرن سنگھ اور اوم مہتا موجود تھے۔ میر قاسم چاہتے تو شاید مسز گاندھی بھی اپنے رویہ میں تبدیلی کرتیں لیکن حسب عادت میر قاسم نے ہاں میں ہاں ملادی اور فیصلہ کیا گیا کہ کانگریسی حلف برداری کے وقت راج بھون نہیں جائیں گے۔ مشکل یہ تھی کہ شیخ محمد عبداللہ کو اس فیصلے کی اطلاع کون دے گا۔ میٹنگ میں چاروں وزراء نے انکار کر دیا تو مسز گاندھی نے حقارت سے کہا کہ "کھادی والے یعنی دیو کانت بروا کے سپرد یہ کام کیا جائے

۲۵ اکتوبر کو شیخ محمد عبداللہ راج بھون پہنچ گئے۔ کانگریسی اور نیشنل کانفرنسی امیدوار نئے کپڑوں میں ملبوس حلف برداری کی تیاری میں مصروف شبھ گھڑی کا بے صبری سے انتظار کرنے لگے لیکن نئی دہلی نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور شیخ صاحب کو اطلاع دی گئی کہ حلف برداری کی تقریب ملتوی کی جائے۔ شیخ صاحب لکھتے ہیں۔ "دہلی سے اطلاع آئی کہ کانگریسی امیدواروں کو حلف نہ لینے کا حکم دیا گیا ہے اس کے علاوہ یہ بھی ظاہر کیا گیا کہ اگر نیشنل کانفرنس کے وزیروں نے حلف لیا تو صورت حال بگڑ جائے گی۔ اس معاملے کی ہدایت کاری مسز اندرا گاندھی نفس نفیس انجام دے رہی تھیں اور ایسا کرتے ہوئے وہ اس واضح بیان کو فراموش کر رہی ہیں جس کے تحت انہوں نے مجھے یہ کہہ کر کانگرس پارٹی کی قیادت پر آمادہ کیا تھا کہ مجھے ٹیم چننے کا مکمل اختیار ہو گا۔ یہ صرف وشواس گھات تھا۔ لیکن حالات کی نزاکت اور

www.taemeernews.com

کانگریسیوں کے ارادہ کا اندازہ کرکے میں نے اشتعال انگیزی کو نظر انداز کرنا مناسب خیال کیا۔"
گو شیخ صاحب نے حالات کی نزاکت اور کانگریسیوں کے ارادوں کی وضاحت نہیں کی ہے لیکن صاف ظاہر ہے کہ شیخ صاحب خوفزدہ تھے کہ اگر انہوں نے ٹکراؤ کا راستہ اختیار کیا تو کانگریسی انہیں ایوان اسمبلی کی قیادت سے محروم کر دیں گے۔ حالات کی نزاکت یہ تھی کہ انہوں نے محاذ رائے شماری کو توڑ کر ہندوستان کے ساتھ الحاق کو تسلیم کر لیا تھا اور اب ان کے پاس کوئی ایسا ہتھیار نہیں تھا جس کو استعمال کرکے وہ ہندوستان کو مجروح کر سکتے۔ چنانچہ ۲۵-اکتوبر ۱۹۷۶ کو راج بھون میں منعقدہ تقریب پر انہوں نے کہا" مجھے امید تھی کہ آج کی تقریب وزارتی کونسل میں کانگریس پارٹی کی بھرپور شرکت سے مسرت انگیز بنے گی اور میں نے اس مقصد کے لئے کانگریس کے چار ارکان کو کابینہ کی سطح پر ہاتھ بٹانے کی دعوت دی تھی لیکن موجودہ غلط فہمی سے فضا مکدر ہوگئی ہے اور میں نے محسوس کیا کہ آج کی تقریب سے اشتراک و مفاہمت کے اس مقصد کے حصول میں رکاوٹیں پیدا ہوں گی اس لئے میں نے گورنر سے تقریب ملتوی کرنے کی استدعا کی"
شیخ محمد عبداللہ چاہتے تو اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لئے وزیر اعلا کے عہدے سے استعفا دے دیتے اور گورنر سے اسمبلی توڑ دینے کی سفارش کرتے۔ جموں و کشمیر کے آئین کے مطابق وزیر اعلا کو اسمبلی توڑ دینے کی سفارش کرنے کا اختیار ہے اور گورنر وزیر اعلا کی سفارش کا پابند ہے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا کیوں کہ وہ مسز اندرا گاندھی سے ڈرتے تھے اور کسی بھی قیمت پر انہیں ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے مسز گاندھی سے ٹکر لی جب وہ وزیر اعظم نہیں تھیں اور اس وقت انہوں نے کانگریس مخالف جنتا پارٹی سے پائپ لائن جوڑنے کی کوشش کی۔ کابینہ کی توسیع کو سبوتاژ کرنے کے بعد پردیش کانگریس کی لیڈر شپ یعنی اس کے صدر مفتی محمد سعید ہیرو بن گئے اور کانگریسی کارکنوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ شیخ محمد عبداللہ سے ٹکر لینے والا لیڈر پیدا ہو گیا ہے مفتی محمد سعید کم گو ہیں۔ اپنی سوچ اور اپنے خیالات دوسروں پر ظاہر کرنے میں کنجوس ثابت ہوئے ہیں لیکن اپنے مفادات کا تحفظ کرنے میں ان کی صلاحیتوں کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایکارڈ نے سید میر قاسم کی پوزیشن سیاسی طور سے بہت کمزور کر دی تھی مسز گاندھی جو خود ایکارڈ کرنا چاہتی تھی اس کو ناکام ہوتے دیکھ میر قاسم کو ہی صورت حال کے لئے ذمہ دار ٹھہرا رہی تھیں۔ گو ابھی مفتی محمد سعید نے کھل کر میر قاسم کے خلاف محاذ آرائی شروع نہیں کی تھی لیکن ان کے قریبی ساتھی کانگریس کے دفتروں میں بیٹھ کر میر قاسم کی کردار کشی کرتے رہتے تھے اور حالات اتنی تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے کہ محسوس ہوتا تھا کہ میر قاسم کا کشمیر کی کانگریسی سیاست میں کوئی وجود نہیں۔ شاید مسز گاندھی بھی یہی چاہتی تھیں اور پھر سنجے گاندھی کا دور شروع ہو رہا تھا اور میر قاسم خود بھی کانگریس کے اندر گھٹن محسوس کر

www.taemeernews.com

رہے تھے لیکن انہوں نے جرات مندی سے کام لے کر حالات کا مقابلہ نہیں کیا۔ اسی زمانے میں کشمیر میں کانگریسیوں نے وسیع پیمانے پر جلسوں کا انتظام کیا اور سید میر قاسم بھی شیخ مخالف رو میں بہنے لگے حالاں کہ ذہنی طور پر وہ اس کے لئے تیار نہیں تھے۔

۱۲۔ جون ۱۹۷۵ کو جب الہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس موہن سنہا نے مسز اندرا گاندھی کے خلاف انتخابی غداری کا تاریخی فیصلہ سنایا تو ہندوستان میں زبردست سیاسی بھونچال آ گیا لیکن مسز گاندھی جو قانونی لڑائی ہار گئی تھیں وہ سیاسی لڑائی میں شکست تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوئیں اور انہوں نے ایمرجنسی نافذ کر دی۔ گو شیخ محمد عبداللہ ایمرجنسی سے خوفزدہ تھے لیکن انہوں نے ریاست میں ایمرجنسی قوانین کو نافذ کرنے میں عجلت سے کام نہیں لیا۔ ریاست میں اخبارات پر سنسر شپ برائے نام تھی۔ شیخ محمد عبداللہ شاید واحد سیاست داں تھے جنہوں نے اس زمانے میں جبکہ بیوی سے بات کرتے وقت بھی یہ خوف طاری رہتا تھا کہ کہیں یہ بھی پولیس کی مخبر تو نہیں ہے جرات مندی سے کام لیا اور عام جلسوں میں کھل کر کہا کہ جے پرکاش نارائن اور مرارجی ڈیسائی جیسے لیڈروں کی حب الوطنی پر شک نہیں کیا جاسکتا۔ پردیش کانگرس کمیٹی ایمرجنسی کی حمایت تو کر رہی تھی لیکن سنجے گاندھی پر ایمان لانے سے انکار کر رہی تھی۔ مفتی محمد سعید نے نہ تو سنجے گاندھی کی قدم بوسی کی اور نہ ہی ریاست میں کانگریسیوں کو نئے حالات میں رہبری کرنے کی دعوت دی۔ سید میر قاسم بھی سنجے گاندھی سے کوسوں دور رہے لیکن اس کے برعکس جموں کے کئی کانگریسیوں نے سنجے گاندھی کے ساتھ رشتہ جوڑا اور سنجے گاندھی کے نام پر مختلف تنظیمیں کھڑی کر دیں۔ ان میں ٹھاکر رندھیر سنگھ پیش پیش تھے۔ ٹھاکر رندھیر سنگھ کو سنجے گاندھی کی شخصیت، ریاست میں ابھارنے کے لئے دہلی سے بھاری رقومات حاصل ہوئیں لیکن اس کے باوجود وہ ریاست میں سنجے گاندھی کی شخصیت کو ابھارنے میں ناکام رہے۔ جموں کے نوجوانوں میں غلام نبی آزاد ابھر رہے تھے اور وہ سنجے گاندھی کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھے اور یہی وجہ ہے کہ جونیر سیاسی کارکن ہونے کے باوجود کئی سینئر لیڈروں کو پچھاڑ کر ہندوستان کی سیاسی زندگی پر جلوہ گر ہوئے۔ ایمرجنسی نے مرکزی سطح پر کانگریس کی جڑیں کھوکھلی کر دیں اور جب حالات بے قابو ہونے لگے تو مسز گاندھی نے پارلیمنٹ توڑ کر نئے چناؤ کرائے۔ اس موقع پر شیخ محمد عبداللہ نے پھر مسز گاندھی کے ساتھ پارلیمنٹ کی ۶ نشستوں کے لئے سمجھوتا کیا۔ ہندو اکثریتی صوبہ یعنی جموں کی ۳ نشستیں کانگرس کو الاٹ ہوئیں اور ۳ کشمیر کی نیشنل کانفرنس کو۔

تمیم احمد تمیم کو جو شیخ محمد عبداللہ کی مہربانی سے پارلیمنٹ کے ممبر بن گئے تھے دوبارہ ٹکٹ نہیں دیا گیا کیوں کہ بقول شیخ صاحب نیشنل کانفرنس میں تمیم احمد تمیم کی شدید مخالفت

www.taemeernews.com

تھی اور نیشنل کانفرنس مادر مہربان یعنی شیخ صاحب کی بیگم کو ممبر پارلیمنٹ بنانا چاہتی تھی حالاں کہ سید میر قاسم سے لے کر دہلی کی کئی شخصیتوں نے شمیم احمد شمیم کی سفارش کی لیکن شیخ صاحب نے جمہوری روایات کا احترام کرتے ہوئے اپنی پارٹی کے فیصلے کو بدلنے سے انکار کر دیا۔ مولوی افتخار حسین انصاری کو کانگریس نے بیگم عبداللہ کے خلاف حلقہ انتخاب سرینگر سے لڑنے کے لئے تیار کیا ایک لاکھ روپے بھی ان کو دئے گئے۔ کانگریس نے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اس کا مولوی افتخار حسین سے کوئی تعلق نہیں ہے ان کے خلاف تادیبی کاروائی کی۔ بیگم عبداللہ کو کامیاب بنانے کے لئے پوسٹر بھی شائع کئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولوی افتخار حسین انصاری کانگریس کے ہی امیدوار تھے اور بیگم عبداللہ کو شکست دینے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا گیا۔ اس میں سید میر قاسم بھی ملوث تھے کیوں کہ وہ بھی شیخ محمد عبداللہ کی بے رخی اور کم ظرفی سے بد دل ہو گئے تھے۔

کانگریس چناؤ ہار گئی اور آزادی کے بعد پہلی بار کانگرس مرکز میں اقتدار سے محروم ہو گئی۔ پردیش کانگریس لیڈرشپ کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ مرکز میں جنتا پارٹی کے اقتدار میں آتے ہی شیخ محمد عبداللہ اور کوئی رخ اختیار کر لیں گے اور اس طرح کانگریس کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ شیخ محمد عبداللہ دہلی چلے گئے نئے حکمرانوں کے ساتھ معاملات طے کرنے کے لئے اور جموں میں کانگریسیوں نے ان کے خلاف عدم اعتماد کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مفتی محمد سعید بھی دہلی چلے گئے اور وہاں مسز گاندھی کو انہوں نے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ شیخ محمد عبداللہ کو ہٹانا کتنا لازمی ہے۔ میر قاسم کا کہنا ہے کہ انہوں نے اس کی مخالفت کی لیکن ان کی دو فصلی باتوں سے یہ اخذ کرنا مشکل ہے کہ انہوں نے عدم اعتماد کی مخالفت کی ہو گی۔ مفتی محمد سعید جموں واپس آئے اور کانگریس پارلیمانی پارٹی کی میٹنگ بلائے بغیر یہ اعلان کیا گیا کہ مفتی محمد سعید کو پارلیمانی پارٹی کا لیڈر منتخب کیا گیا ہے اور گردواری لال ڈوگرہ کو نائب لیڈر۔ جبکہ گردواری لال ڈوگرہ پارٹی کے لیڈر تھے اور جموں میں موجود نہیں تھے۔ گورنر کو مراسلہ بھیجا گیا کہ کانگریس نے شیخ محمد عبداللہ سے اعتماد واپس لے لیا ہے اور مفتی محمد سعید کو لیڈر منتخب کیا ہے اور انھیں وزارت سازی کی دعوت دی جائے۔ عبدالغنی لون کا تعلق کانگرس سے نہیں تھا اور وہ نیشنل کانفرنس میں بھی الگ تھلگ تھے۔ انھوں نے پھر بھی ایک بیان جاری کر کے مفتی محمد سعید کی حمایت کی۔ وزارت میں جو کانگریسی شامل تھے ان میں سردار نگیل سنگھ اور بیگم زینب اعتماد کے خلاف تھیں۔ علی محمد ناٹک نے بھی ڈٹ کر مخالفت کی۔ کانگریسی وزارت سازی کے لئے تیاریاں کر رہے تھے کہ شیخ محمد عبداللہ نے آئینی اختیارات کا سہارا لے کر گورنر سے اسمبلی توڑ دینے کی سفارش کی اور گورنر نے وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی کی ہدایت پر اس سفارش پر عمل

www.taemeernews.com

کرتے ہوئے اسمبلی توڑ دی اور نئے چناؤ کرانے کا اعلان کر دیا۔

www.taemeernews.com

باب ۱۸ عدم استحکام

گورنر راج پہلی بار ریاست پر نافذ کیا گیااور سر کار گورنر کے مشیروں کو سونپ دی گئی مرکز میں جنتا پارٹی نے اقتدار سنبھال لیا تھا اور کانگریس کو جو ذلت آمیز شکست ہوئی تھی اس سے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ کانگریس پھر کبھی اقتدار میں نہیں آئے گی اور جب جہاز ڈوب رہا ہو تو ظاہر ہے چوہے بھاگیں گے ہی۔ کشمیر میں یہی ہوا۔ عبدالرشید کابلی کانگریس سے بھاگ کر جنتا پارٹی کی گود میں گر پڑے۔ مولوی افتخار حسین انصاری بھی جنتا پارٹی کے در پر حاضر ہو گئے۔ عبدالغنی لون بھی جنتا پارٹی کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ شیخ محمد عبداللہ جو وقت اور موسم کے مطابق بار بار لباس بدلنے کا گر سیکھ گئے تھے۔ انہوں نے دہلی میں جنتا پارٹی کے ساتھ مفاہمت کی کوششیں شروع کر دیں۔ خود شیخ محمد عبداللہ نے اس بات کا اعتراف اپنی سوانح حیات آتش چنار میں کیا ہے کہ " میں نے مرکزی رہنماؤں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ریاست میں نیشنل کانفرنس کے ساتھ انتخابی اشتراک کریں۔ انہوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ پنجاب میں اکالیوں سے ایسا اشتراک کر سکتے ہیں تو نیشنل کانفرنس کے ساتھ ایسا کرنے میں کیا۔ مضائقہ ہے تو آئیں بائیں شائیں کر کے ٹال گئے۔ انہوں نے صرف یہ کہا کہ نیشنل کانفرنس کو توڑ دیا جائے لیکن میں نے اس تجویز کو سختی کے ساتھ مسترد کر دیا۔" مصدقہ اطلاع یہ ہے کہ شیخ صاحب نیشنل کانفرنس کو توڑنے پر آمادہ تھے۔ لیکن وہ جنتا پارٹی میں اپنے شرائط پر شامل ہونے پر زور دے رہے تھے وہ اس کی قیادت خود سنبھالنے پر بضد تھے اور وزیر اعظم مرار جی ڈیسائی اس کے لئے تیار نہیں تھے۔ جنتا پارٹی بنی تو ہر طرح کے روڑے اور کنکر لڑھکتے لڑھکتے اس کی طرف جانے لگے۔ مولانا مسعودی جو شیخ محمد عبداللہ کے قریبی ساتھی رہے تھے وہ جنتا پارٹی کے صدر بن گئے محی الدین قرہ جنہوں نے ایک زمانے میں فطری رجحان کا نعرہ بلند کر کے اور پاکستان کے ساتھ الحاق کی صدا لگا کر برسوں تک پاکستان کا نمک چاٹا تھا وہ بھی خواب خرگوش سے ہڑبڑا کر جاگ اٹھے اور جنتا پارٹی میں شامل ہو گئے۔ برسوں سے نئی دہلی میں رہ رہے پریم ناتھ بزاز جو اپنی پاکستان نوازی کی وجہ سے اور پاکستان کے حق میں درجنوں کتابیں لکھ کر غربت کی لکشمن ریکھا پار کر گئے تھے وہ بھی میدان میں اتر گئے عوامی مجلس عمل کے سربراہ مولانا فاروق بہتی گنگا میں ڈبکی لگانے

www.taemeernews.com

سے کیسے باز رہتے۔ وہ بھی جنتائی بن گئے۔ بھان متی کا ایک کنبہ وجود میں آ گیا۔ شمیم احمد شمیم جو اینٹی شیخ کیمپ میں تھے۔ جنتا پارٹی کے نظریاتی گرو بن گئے۔ جنتا پارٹی کی پروپگینڈہ مہم اتنی کارگر ثابت ہوئی کہ کشمیر میں جنتا لہر طوفان کی طرح چھانے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جنتا پارٹی سرکار سنبھالنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ لیکن جنتا پارٹی نے کشمیریوں کی نفسیات، شیخ محمد عبداللہ کی کشمیریوں کو رام کرنے کی صلاحیت اور مرزا محمد افضل بیگ کی "سبز رومال" والی حکمت عملی کو نظر انداز کر دیا۔ مرکزی جنتا پارٹی کے لیڈروں نے دفعہ ۳۷۰ ہٹانے کا نعرہ بلند کیا اور کشمیریوں کے لئے دفعہ ۳۷۰ ایک ایسا نشہ ہے جس سے وہ کسی بھی حالت میں چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ نیشنل کانفرنس نے دفعہ ۳۷۰ کو کشمیریوں کی عزت و آبرو قرار دیا۔ اور اس زمانے میں نیشنل کانفرنس کے ایک پنڈت لیڈر پیارے لال ہنڈو کا یہ نعرہ "زونی ہند عزت ۳۷۰ کشمیری ہند عزت ۳۷۰" یعنی کشمیری عورت کی عزت ۳۷۰ ہے اور پھر شیخ محمد عبداللہ کی قیادت نے ۳۷۰ کو واقعی ایسے چابک میں بدل دیا کہ جنتا پارٹی کے توانا گھوڑے بھی مار کھا کھا کر لہولہان ہو گئے۔

اسی دوران وادی میں یہ خبریں گشت کرنے لگیں کہ شیخ محمد عبداللہ پر دل کا دورہ پڑ گیا ہے اور اس بیماری کے لئے جنتا پارٹی کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ یہ بیماری بھی نیشنل کانفرنس کے لئے جنتا پارٹی کو دفن کرنے کا ایک موثر ہتھیار بن گئی۔ وادی بھر میں شیخ صاحب کی صحت کے لئے مسجدوں، درگاہوں اور خانقاہوں میں دعائیہ مجلسیں منعقد ہونے لگیں۔ کشمیر کے تاج کو بچانے کے لئے بھیڑ بکریوں کی قربانیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور دل کی بیماری ایک مضبوط جنتا مخالف تحریک میں بدل گئی۔ راتوں رات وادی میں ہر طرف نیشنل کانفرنس کے لال جھنڈے لہرانے لگے۔ نیشنل کانفرنس یعنی محاذ کے کارکن جو ابتدا میں جنتا پارٹی کے لہر سے مرعوب ہو گئے تھے، منظم ہو کر چناؤ مہم کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے میدان میں کود پڑے۔ سرخ لہر نے جنتا پارٹی کے لیڈروں کو خوفزدہ کر دیا اور وہ مرکزی لیڈر شپ پر چناؤ کو ملتوی کرنے کا دباؤ ڈالتے رہے لیکن وزیر اعظم مرار جی ڈیسائی نے چناؤ ملتوی کرنے کی تجویز مسترد کر دی۔ گورنر کے مشیر اعلا ستارا والا سے جنتا پارٹی کو یہ امید تھی کہ وہ چناؤ میں گڑبڑ کرا کے جنتا پارٹی کے امیدواروں کو کامیاب کرائیں گے محی الدین قرہ سے لے کر مولوی افتخار حسین انصاری تک ہر کوئی اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ مرار جی بھائی آخری وقت پر ستارا والا کے ذریعے چناؤ میں گڑبڑ کرائیں گے۔ لیکن وزیر اعظم نے سخت احکامات دیے کہ چناؤ غیر جانب دارانہ ہونا چاہئے۔

www.taemeernews.com

اسمبلی چناؤ

ہندوستان کے اکثر دانشور اور صحافی ایک طویل مدت سے یہ پروپگنڈہ کر رہے ہیں کہ جموں کشمیر میں صرف ۱۹۷۷ میں غیر جانب دارانہ اور آزادنہ چناؤ کرائے گئے لیکن یہ ایک بے بنیاد اور لغو پروپگنڈہ ہے اس سے انکار نہیں کہ پولس اور گورنر انتظامیہ غیر جانب دار رہا اور اس نے چناؤ میں کوئی گو بڑ نہیں کی۔اس بار تو Rigging کا کردار ہی بدل گیا اس اسمبلی چناؤ میں Rigging عوامی سطح پر ہوئی۔ نیشنل کانفرنس مخالف ووٹروں کو شیخ صاحب کے والنیٹروں نے جنہیں اس زمانے میں Rice Brigade کے نام سے جانا جاتا تھا، چناؤ بوتھوں تک پہنچتے ہی نہیں دیا۔ ہر چناؤ بوتھ میں صرف نیشنل کانفرنس کے چناؤ ایجنٹ موجود تھے مخالفوں کے ایجنٹوں کو یا تو بھگا دیا گیا یا پھر بوتھ کے اندر ہی چند سکوں کے عوض خرید لیا گیا میں بھی جب ووٹ ڈالنے گیا تو میرے ہی ہمسائے نیشنل کانفرنس کے چناؤ ایجنٹ نے کہا" چراغی صاحب آج تو بہت مصروف ہونگے، رپورٹنگ کرنی ہو گی۔ آپ نے تکلیف کیوں کی۔ آپ کا ووٹ ڈال دیا گیا ہے۔ بحث کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اپنی مصروفیات کو دیکھ کر واپس چلا آیا۔ ایک اعلا پولیس افسر جو ایک زمانے میں انگریزی کے پروفیسر رہ چکے تھے جب ووٹ ڈالنے گئے تو نیشنل کانفرنس ایجنٹ نے ووٹر لسٹ چیک کر کے کہا کہ" آپ کو شرم نہیں آتی کہ دوسری بار ووٹ ڈالنے آگئے، جب پولس افسر نے انکار کیا تو انہیں ثبوت پیش کیا گیا۔ انکا ووٹ کسی اور نے انگوٹھا لگا کر ڈال دیا تھا۔ پریزائڈنگ افسر بھی خاموش۔ وہ کیسے ایک ووٹر کو دوبارہ ووٹ ڈالنے کی اجازت دیتا۔ یہ قصہ صرف ایک بوتھ کا نہیں۔وادی کے ہر بوتھ میں یہی ڈراما کھیلا گیا۔اس چناؤ اور کانگریس دور کے انتخابوں میں بس ایک ہی فرق تھا کہ کانگریس دور میں ایڈ منسٹریشن کانگرس کا ساتھ دیتی تھی اور اس چناؤ میں خود کشمیریوں نے شیخ صاحب کے عشق میں مبتلا ہو کر Rigging کی اور پھر مرزا محمد بیگ کی سبز رومال میں رکھے گئے پاکستانی نمک کی ڈلی کے سحر نے لوگوں کو ایسا منظم کیا کہ شیخ صاحب کے خلاف کوئی مریل سی آواز بھی برداشت نہیں کی جاتی تھی۔ چناؤ مکمل ہوئے۔ نتائج سامنے آئے تو نیشنل کانفرنس کو ۷۵ میں سے ۵۰ نشستوں پر کامیابی حاصل ہوئی۔ صوبہ جموں میں مسلم اکثریتی علاقوں میں نیشنل کانفرنس کے امیدوار کامیاب ہوئے کانگریس کے امیدوار صرف جموں میں کامیاب ہوئے۔ کشمیر میں تو ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔ جنتا پارٹی چناؤ نتائج بعد ہی ہوا میں تحلیل ہو گئی۔البتہ عبدالغنی لون اور عبدالرشید کابلی کامیاب ہوئے۔

چناؤ نتائج کے بعد ہی وادی میں اور خاص کر سرینگر میں نیشنل کانفرنس نے خوشی کا جشن منایا اور کئی روز تک شہر میں جشن کے نام پر غنڈہ گردی اور شرمناک حرکتیں۔ جنتا پارٹی

www.taemeernews.com

کے لیڈروں اور کارکنوں کے گھروں پر حملے اور کردار کشی کی ایسی گھناؤنی حرکتیں کی گئیں، کہ شرفاء کا گھروں سے باہر نکلنا مشکل ہو گیا۔ ایک ایسے جلوس میں تو خود شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ ٹرک پر براجمان تھے Rice Brigade نے کئی روز تک سرینگر کی سڑکوں پر ایسا ننگا ناچ کیا کہ کشمیر کی تہذیب داغدار ہو گئی۔ ان حالات میں خود ساختہ دانشور اور صحافی بار بار ۱۹۷۷ کے چناؤ کا فخر سے ذکر کرتے ہیں، وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ سرکاری سطح پر واقعی چناؤ غیر جانبدار اور آزادانہ تھے لیکن عوامی سطح پر یہ جمہوریت کے ساتھ بھونڈا مذاق تھا۔ اگر نیشنل کانفرنس Rigging نہ بھی کرتی تب بھی نیشنل کانفرنس ہی اکثریت حاصل کرتی لیکن Rigging کر کے شیخ محمد عبداللہ اور ان کی جماعت نے ۱۹۴۸ کے بعد کے انتخابات کی روایات برقرار رکھی اور یہ Rigging شیخ محمد عبداللہ کی ڈکٹیٹرانہ ذہنیت کا نتیجہ تھی۔ وہ اختلاف رائے نہ پہلے برداشت کرتے تھے اور نہ اب کر رہے تھے۔ وہ اختلاف رائے کو اسی صورت میں برداشت کرتے۔ اگر اختلاف رائے اقتدار کو سنبھالے رکھنے کی راہ میں حائل نہ ہوتا۔ اگر ۱۹۷۷ کے چناؤ میں سرکار نے مداخلت نہیں کی تو اس کا کریڈٹ وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی کو ملنا چاہئے جنہوں نے مرکزی لیڈروں، کانگریس کے چند مرکزی اور ریاستی جنتا پارٹی کے لیڈروں کی دھونس اور دباؤ کے سامنے جھکنے سے صاف انکار کر دیا۔ اگر مرکزی سرکار چاہتی تو دنیا کی کوئی طاقت جنتا پارٹی کو اقتدار میں آنے سے نہیں روک سکتی تھی۔ حالانکہ کشمیر کے جنتا لیڈروں نے چناؤ شروع ہوتے ہی کابینہ بھی بنالی تھی اور قلم دان بھی تقسیم کئے تھے۔ چناؤ کے آخری دن تک وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ مرکزی سرکار جادو کی چھڑی گھما کر اقتدار ان کی جھولی میں ڈال دے گی۔ کشمیری سیاست دانوں کی اس نفسیات کا اس بات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خواجہ غلام محمد صادق وزیر اعلا تھے اور اسمبلی چناؤ ہو رہے تھے۔ بخشی غلام محمد کے خلاف ایک بے وزن بے زمین شخص منشی محی الدین صلاتی کو منڈیٹ دیا گیا۔ چناؤ شروع ہوتے ہی صلاتی صاحب نے دعوا کیا کہ بخشی غلام محمد کی ضمانت ضبط ہو گی۔ ووٹنگ ختم ہوئی تو صلاتی صاحب وزیر اعلا سے ملنے آئے۔ صادق صاحب نے پوچھا کہ " کیا حال ہے چناؤ کا کتنے فیصد ووٹ پڑے " تو صلاتی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا" صادق صاحب آپ بھی مذاق کرتے ہیں۔ بھلا مجھے کیا ضرورت ہے۔ بیلٹ پیپر اکاؤنٹ رکھنے کی" صادق صاحب نے پھر پوچھا بھئی جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔ تو صلاتی صاحب نے ڈھٹائی سے کہا "وہ کام تو ٹریجری میں خود کروائیں گے ویسے میں کامیاب ہوں آپ کے حکم کا انتظار ہے۔"

چناؤ جیتنے کی خوشی میں پولو گراؤنڈ میں ایک جلسہ منعقد ہوا اور شیخ صاحب کو ایک بس کی چھت پر ایک صوفے پر دراز کر کے جلسہ گاہ تک پہنچایا گیا۔ بقول شیخ صاحب عوام کا ایک ٹھاٹھیں

www.taemeernews.com

مارتا ہوا سمندر جوش و خروش میں موجزن تھا۔ میں تقریر کرنے کے قابل نہیں تھا لیکن میں نے قرآن مجید کی کچھ آیات کی تلاوت کرنے کے بعد علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھا

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

اس کے بعد انہیں پھر نیشنل کانفرنس کی پارلیمانی پارٹی کا لیڈر چن لیا گیا۔ اور جب راج بھون میں انہوں نے حلف لیا تو شیخ صاحب کو علامہ اقبال کا یہ شعر یاد آیا۔

سفر زندگی کے لئے برگ و ساز
سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز۔

www.taemeernews.com

شیخ محمد عبداللہ کے اقتدار سنبھالتے ہی سر کاری انتظامیہ میں بھونچال آ گیا۔ ہوائی گھوڑوں پر سوار اعلا افسروں کو زمین پر اترنا پڑا۔ سرکاری افسروں سے لے کر نچلی سطح تک کے ملازموں میں یہ احساس تیزی کے ساتھ ابھرنے لگا کہ حرام خوری، تن آسانی اور رشوت خوری کا زمانہ دفن ہو چکا ہے اور ہر ملازم کو اب جواب دہ ہونا پڑے گا۔ نئی سر کار نے حکومت سنبھالتے ہی کئی مگر مچھ برانڈ کے افسروں کو ملازمت سے علاحدہ کر دیا حالاں کہ ان میں کئی افسروں نے کٹر ہندوستانی ہونے کا سر ٹیفکیٹ حاصل کر کے مرکزی سرکار سے نوکریاں حاصل کیں۔ حکومت کے اس اقدام سے عام کشمیریوں میں یہ امید پیدا ہوئی کہ کرپشن ختم ہو جائے گی اور ان کے مسائل کی طرف سنجیدہ توجہ دی جائے گی۔ اور وہ زور زور سے نعرے بلند کرنے لگے لانگ لیو عبداللہ ۔۔۔۔ لیکن ایک قلیل مدت کے بعد ہی لوگوں کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ کرپشن اوپر کی سطح سے ہی شروع ہو کر نیچے کی طرف لڑھک رہی ہے۔ سیاسی سطح پر نئی طرز کی محاذ آرائی شروع ہوئی۔ محاذ رائے شماری کے کارکن اور لیڈر ۲۲ برس تک حکومت کے ساتھ لڑتے لڑتے مفلس ہو گئے تھے۔ ان کے گھر خالی ہو گئے تھے نیشنل کانفرنس میں آتے ہی جب حکومت پر ان کا قبضہ ہو گیا تو انہوں نے بھی ۲۲ برس کی مفلسی کا انتقام لینے کے لئے بے انصافی کے ساتھ قومی دولت کو لوٹنا شروع کیا اور حکومت بھی آنکھیں بند کر کے سابق محاذی کار کنوں اور لیڈروں کی مالی پوزیشن بہتر بنانے پر زور دیتی رہی۔

www.taemeernews.com

شیخ محمد عبداللہ کا پُنر جنم باب ۱۹

شیخ محمد عبداللہ سیاسی قلابازی کے ماہر تھے ان میں ٹوسٹ کے دونوں طرف مکھن لگانے کی صلاحیت تھی وہ زمانہ ساز بھی تھے۔ اقتدار کو سیسہ پلایا ہوا قلعہ بنانے کے لیے وہ کسی سے بھی سمجھوتا کر سکتے تھے لیکن ان کے دل میں نہرو خاندان کے لیے نرم گوشہ تھا ویسے بھی کشمیری مسلمانوں میں نہرو خاندان سے پیار تھا اور وہ محسوس کرتے تھے کہ نہرو خاندان بھی کشمیر اور کشمیریوں سے بے پناہ پیار کرتا ہے۔ مسز اندرا گاندھی اقتدار سے ہٹ گئیں تو کشمیری مسلمانوں کو مایوسی ہوئی۔ حالانکہ اس کا اظہار انہوں نے کھل کر نہیں کیا کیوں کہ شیخ محمد عبداللہ بھی کھل کر مایوسی کا اظہار کر کے جنتا پارٹی سرکار کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میں اس دور میں نیشنل ہیرالڈ کا رپورٹر بن چکا تھا اور صحافی زندگی میں میں نے پہلا انٹرویو جموں میں شیخ صاحب سے لیا۔ ۴ گھنٹے کے اس انٹرویو کے دوران شیخ صاحب نے بچپن سے اپنی زندگی، مہاراجہ ہری سنگھ کے ظلم ستم اور ۹۔اگست ۱۹۵۳ کے وشواس گھات کا جائزہ لیا۔ انٹرویو کے بعد جب میں نے نیشنل ہیرالڈ کے مالی بحران کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ "جواہر لال نہرو کی یہ نشانی زندہ رہنی چاہیئے۔ میرا نیشنل ہیرالڈ کے ساتھ گہرا رشتہ رہا ہے۔ مجھ سے جو بھی ممکن ہوگا نیشنل ہیرالڈ کی مدد کروں گا۔" اور وہ اپنے اس وعدے پر ڈٹے رہے۔ اس کے بعد کئی بار ان سے اخبار کے سلسلہ میں ملتا رہا اور وہ ہر بار اخبار کی مدد کرتے رہے۔ یہ ان کی شخصیت کا ایک رخ تھا اور دوسرا رخ یہ تھا کہ وہ ریاست کے کانگریسیوں کو نالی کا کیڑا قرار دیتے رہے اور ان کی کردار کشی کرتے رہے۔ وہ کانگرس کو کرپشن اور کنبہ پروری کا علامت قرار دیتے رہے حالانکہ اقتدار پھر سے سنبھالنے کے بعد شیخ محمد عبداللہ نے بھی کرپشن اور کنبہ پروری کے تمام سابق ریکارڈ توڑ دیئے۔

چناؤ کے بعد دوبار مسز اندرا گاندھی ریاست کے دورہ پر آئیں۔ پہلا دورہ جموں کے سرحدی علاقوں کا کیا اور شیخ محمد عبداللہ کی سرکار نے ان کی حفاظت کا مکمل انتظام کیا۔ ۵ روزہ اس دورہ میں پنڈت گردھاری لال ڈوگرہ، مس محمودہ بیگم اور میں بھی شامل تھا۔ پونچھ راجوری کے سرحدی علاقوں میں لوگوں نے ان کا پرجوش اور والہانہ استقبال کیا، ان کا احترام اور عزت کی۔ اس دورہ کے دوران فوجی افسروں اور فوجی جوانوں میں مسز اندرا گاندھی کے لیے بے حد احترام کا بھی

www.taemeernews.com

مظاہرہ دیکھا گیا ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ چناؤ ہاری نہیں تھیں بلکہ بدستور وزیر اعظم تھی۔ دورے سے واپسی پر شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ ان کی ملاقات ہوئی۔

چناؤ ہار جانے کے بعد کانگریسوں میں یہ احساس شدت سے ابھرنے لگا کہ اگر مفتی محمد سعید بدستور کانگرس کے صدر رہے تو کانگرس کا وجود ختم ہو جائے گا۔ حالانکہ چناؤ کے بعد ہی انہوں نے صدارت سے مستعفی ہونے کی پیشکش کی تھی۔ مفتی محمد سعید کو ہٹانے کی مہم میں کانگریسوں کی اکثریت شامل نہیں تھی البتہ سید میر قاسم اس حق میں نہیں تھے کہ مفتی محمد سعید بدستور صدر کے عہدے پر فائز رہیں وہ ایک کمزور لیڈر ایوب خاں کو صدر بنانا چاہتے تھے لیکن مسز گاندھی جن کے ذہن میں سید میر قاسم کے وفادار نہ ہونے کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو گئے تھے وہ مفتی محمد سعید کو ہی GROOM کر رہی تھیں۔ مسز اندرا گاندھی سرینگر آئیں اور فیصلہ ہوا کہ الیکٹورل کالج بنایا جائے جو صدر کا چناؤ کرے گا۔ صدارت کے لیے ڈاکٹر کرن سنگھ، محمد ایوب خاں اور پیر غیاث الدین بھی امیدوار تھے اور جموں کے اسپوٹنک کنور بھیم سنگھ بھی کافی سرگرم تھے۔ میر قاسم در پردہ اپنے ساتھیوں کو ایوب خاں کے حق میں ووٹ ڈالنے پر آمادہ کر رہے تھے لیکن اکثریت اس کے خلاف تھی۔ خفیہ ووٹنگ ہوئی اور مفتی محمد سعید ایک بار پھر صدر منتخب کیے گئے اور یہاں سے ہی سید میر قاسم اور مفتی محمد سعید کے درمیان ٹکراؤ شروع ہوا۔ پردیش کانگرس کا دفتر سید میر قاسم کے خلاف سازشوں کا اڈہ بن گیا۔

نیشنل کانفرنس میں بھی جانشینی کی جنگ شروع ہو گئی تھی سینیارٹی، تجربہ اور قربانی کا تقاضہ تھا کہ مرزا محمد افضل بیگ کو شیخ محمد عبداللہ اپنا جانشین بناتے لیکن شیخ صاحب اپنے بیٹے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو اپنا جانشین بنانا چاہتے تھے حالانکہ ان کے داماد غلام محمد شاہ بھی امیدوار تھے۔ غلام محمد شاہ زبان سے کڑوے۔ بدتمیزی کی حد تک بدزبان، مغرور اور گھمنڈی تھے اور نیشنل کانفرنس کے عام کارکنوں پر ان کا اثر نہیں تھا البتہ غلام محمد شاہ ایک قابل ایڈمنسٹریٹر تھے اور انتظامیہ میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ شیخ صاحب اور بیگ صاحب کے درمیان اختلافات کی خبریں زوروں سے گشت کر رہی تھیں لیکن ان پر یقین نہیں کیا جا رہا تھا کیوں کہ بیگ صاحب نہ صرف شیخ محمد عبداللہ کے ایک قریبی ساتھی بلکہ ان کے دکھ درد کے ساتھی بھی تھے۔ قربانیاں دونوں نے دی تھیں۔ دونوں برسوں جیل کی سلاخوں کے پیچھے قید رہے تھے لیکن جب جانشینی کی جنگ شروع ہوتی ہے تو اندھا مڑ مڑ کر ریوڑیاں اپنوں میں ہی تقسیم کرنے لگتا ہے اسی دوران قانون ساز کونسل کی چند نشستوں کیلئے چناؤ ہوئے۔ نیشنل کانفرنس نے مرزا محمد افضل بیگ کے ایک قریبی رشتہ دار محمد یعقوب بیگ کو بھی ٹکٹ دیا لیکن بیگ صاحب کو پورا یقین تھا کہ یعقوب بیگ کو شکست دینے کے لئے سازش کی جائے گی۔ انہوں نے ایسا کھیل کھیلا کہ یعقوب بیگ کو جتنے

www.taemeernews.com

ووٹ حاصل ہوئے وہ ان ووٹوں سے .بہت زیادہ تھے جو پارٹی نے انہیں الاٹ کیے تھے۔ اس شیخ محمد عبداللہ کو پورا یقین ہو گیا کہ مرزا محمد افضل بیگ انہیں ہٹانے کی کوشش کر رہے ہیں اور معمول کے مطابق ان کے حلقہ نے یہ خبریں اڑا دیں کہ مرکزی سرکار سے گٹھ جوڑ کر کے مرزا محمد افضل بیگ خود وزیر اعلا بننے کی سازش کر رہے ہیں اور اتفاق کی بات ہے کہ نئی دہلی میں کوئی سرکاری کانفرنس تھی جس میں مرزا محمد افضل بیگ نے بھی حصہ لیا۔

مرزا محمد افضل بیگ سرینگر کے ایر پورٹ سے سیدھے سرینگر کے سول سکرٹیریٹ گئے اور شیخ صاحب کے ساتھ طویل ملاقات کی۔ ملاقات کے بعد مجھ سمیت چند صحافیوں نے پوچھا کہ کیا آپ اور شیخ صاحب کے درمیان اختلافات اتنے بڑھ گئے ہیں کہ آپ کو کابینہ سے نکالا جارہا ہے تو بیگ صاحب نے خود اعتمادی سے ساتھ کہا کہ " اختلافات کی خبریں مفاد خصوصی رکھنے والے عناصر اڑا رہے ہیں۔ میں کابینہ کا ممبر ہوں اور رہوں گا۔" بیگ صاحب سول سکرٹیریٹ سے اپنی رہائش گاہ پر پہنچے ہی تھے کہ شیخ محمد عبداللہ نے انہیں کابینہ سے ڈسمس کرنے کا حکم جاری کیا اور ساتھ ہی انہیں نیشنل کانفرنس کی بنیادی ممبر شپ سے بھی ہٹایا گیا۔ اس وشواس گھات نے مرزا محمد افضل بیگ کو توڑ دیا انہوں نے ایک پریس کانفرنس میں ایک بیان جاری کر کے اپنی بے گناہی پیش کی اور شیخ محمد عبداللہ کے وشواس گھات پر افسوس کا اظہار کیا RICE BRIGADE تیار تھا حرکت میں آیا اور مرزا محمد افضل بیگ کے خلاف مظاہرے شروع ہوئے۔ نعرے تراشنے میں خاص کر کسی کو ذلیل کرنے کے لئے کشمیری ذہن زرخیز ہے۔ نعرے تراشے گئے" گلہ شاہ بادشاہ بیگ چھا ہیر چھا" یعنی غلام محمد شاہ بادشاہ ہے بیگ کس کھیت کی مولی ہے" بیگ صاحب اس خوش فہمی میں مارے گئے کہ سبز رومال میں پاکستانی نمک کی ڈلی نے جن ہزاروں کارکنوں کو ان کا شیدائی بنایا تھا وہ شیخ محمد عبداللہ کے خلاف میدان میں اتر جائیں گے اور اسی خوش فہمی میں بیگ صاحب نے سرینگر کے گاندھی میدان میں جلسہ عام کا اعلان کیا، اسٹیج بنایا گیا۔ شامیانے لگائے گئے۔ لاؤڈ اسپیکر فٹ کیے گئے۔ اور ہزاروں لوگ تقریر سننے کے لئے بھی میدان میں آئے۔ ابھی بیگ صاحب نے تقریر شروع ہی کی تھی کہ زبردست پتھراؤ شروع ہوا۔ شامیانے کی رسیاں کاٹی گئیں۔ لاؤڈ اسپیکر توڑ دیئے گئے۔ لاٹھیاں برسنی شروع ہوئیں۔ افراتفری برپا ہوئی اور اسٹیج پر ایسا خطرناک حملہ کیا گیا کہ مرزا محمد افضل بیگ اسی روز جاں بحق ہو جاتے اور کوشش بھی یہی تھی کہ انہیں اسٹیج پر ہی ہلاک کر دیا جائے لیکن ایک فرض شناس پولیس نے ان کی جان بچائی اور انہیں حفاظت کے ساتھ وہاں سے نکال کر لے گئے۔

اس دھلائی کے بعد مرزا محمد افضل بیگ جن کی صحت .بہت پہلے سے گر رہی تھی مکمل طور سے ٹوٹ گئے اور ان سے ملاقات کے وقت ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ذہنی طور سے بھی وہ بوڑھے ہو

www.taemeernews.com

چلے ہیں۔ گاندھی پارک میں قاتلانہ حملہ کے بعد وہ چند برسوں تک زندہ رہے لیکن محض ایک زندہ لاش۔ آخری دنوں میں ان کے قریبی عزیزوں نے بھی دغادی صرف ایک نوکر تھا جو آخری دم تک ان کی خدمت کرتا رہا۔ جانشینی کی جنگ میں شیخ محمد عبداللہ نے راستے کا بڑا پتھر ہٹادیا۔ اب سوال تھا غلام محمد شاہ کا۔ غلام محمد شاہ پست قد تھے اور پارٹی کے اندر بھی وہ پست قد ہی رہے۔ اس لیے شیخ محمد عبداللہ نے اپنے بڑے بیٹے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو جو پاکستانی مقبوضہ کشمیر سمیت ہر گھاٹ کا پانی پی کر واپس کشمیر آئے تھے اپنا سیاسی جانشین نامزد کیا اور باضابطہ طور پر ۲۔ اگست ۱۹۸۱ کو اقبال پارک سرینگر میں شیخ صاحب نے اپنے بیٹے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو اپنا جانشین نامزد کیا اپنی تقریر میں حسب عادت اور روایات انہوں نے تحریک حریت کی داستان سناتے سناتے کہا" میں آپ سے باتیں کر رہا ہوں اور میرے کانوں میں اس دم توڑتے شہید کی آواز گونج رہی ہے جس نے ۱۳۔ جولائی ۱۹۳۱ کو جامع مسجد کے صحن مین پاک میں اپنی لڑکھڑاتی زبان میں کہا تھا شیخ صاحب ہم اپنا فرض ادا کر چکے ہیں اب آگے آپ کی ذمہ داری ہے اور مطلب سخن یہ ہے کہ آج پچاس برس کے بعد وہ تاریخی گھڑی آگئی ہے جب میں اس بارامانت کو جو اس شہید کی وصیت کے مطابق مجھے سونپا گیا تھا اپنی نوجوان نسل کے حوالے کروں۔ میں نے اپنے اور مقدور کے مطابق مادر کشمیر نے جو قرضہ میرے ذمہ رکھا تھا ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں برتی۔ طوفان سے کشتی نکال کر میں اس کا پتوار آپ کے جوان اور جری ہاتھوں میں دے رہا ہوں پنڈت موتی لال نہرو نے ۱۹۳۰ میں انڈین نیشنل کانگرس کی صدارت نئی نسل کے ترجمان جواہر لال نہرو جو حسن اخلاق سے ان کے فرزند تھے کو سونپی تھی تو کہا تھا" اگر پدر نہ تواند۔ کپسر تمام کند اور بعد مین دنیا نے دیکھا کہ اس دانش مند برہمن کی پیش گوئی کس طرح پوری ہوئی۔ تاریخ کی عجیب و غریب منطق نے مجھے آج ایسے ہی نازک مقام پر کھڑا کر دیا ہے۔ میں آج نئی نسل کے ترجمان کی حیثیت سے ڈاکٹر فاروق کے ہاتھ نیشنل کانفرنس کی صدارت و قیادت کی مشعل سونپ رہا ہوں یہ ایک بڑا اعزاز اور ایک بڑا امتحان ہے۔

شیخ محمد عبداللہ نے موروثی حکومت کے بیج تو بو دیے اور اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ شیخ صاحب کشمیر میں کانگرس سمیت کسی سیاسی قومی سیاسی پارٹی کو اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ وہ کشمیری مسلمانوں کو باہر کی ہوا سے محفوظ رکھ رہے تھے لیکن پردیش کانگرس نے اس طرح کے نظریہ کے خطرناک نتائج محسوس کرتے ہوئے ایک الحاق ایوزیشن جماعت کا رول شروع کیا۔ مفتی محمد سعید نے ایوزیشن رول خود اپنے لئے وضع کیا یا اس مین محترمہ مسز گاندھی کی مرضی شامل تھی اس سے قطع نظر مفتی محمد سعید نے وادی میں تمام کانگرس کمیٹیوں اور یونٹوں کو ازسرنو منظم کیا سیاسی کنونشن اور جلوس منعقد کرائے۔ سرکار کی

www.taemeernews.com

غلط پالیسیوں کے خلاف آواز بلند کی۔ اور پہلی بار شیخ محمد عبداللہ کو بھی احساس پیدا ہوا کہ نہ تو نیشنل کانفرنس سیسہ پلایا ہوا قلعہ ہے اور نہ ہی وہ ناقابل تسخیر ہیں۔ کشمیر میں ایک بار پھر ہندوستان نواز اپوزیشن جماعت عوامی مسائل کے لیے جدو جہد میں جت گئی۔ پردیش کانگرس کے دفتروں میں عام شہری اپنے مسائل اور شکایات کا ازالہ کرانے کے لیے آتے رہے خاص کر دیہی علاقوں میں کانگرس عوامی جدوجہد کی علامت کے طور پر ابھرنے لگی اس کے برعکس جموں کے اکثر کانگرسی جو حسب عادت راج بھگت کا رول کرنا چاہتے تھے کر رہے تھے۔ کشمیر کے کانگرسیوں نے نہایت سنگین ترین مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے شیخ محمد عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کی ڈکٹیٹرانہ پالیسیوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا لیکن مفتی محمد سعید معصومیت میں دھوکا کھا گئے جو نئے دانشور اور وکلا کانگرس میں شامل ہو رہے تھے وہ کانگرس کے اصولوں سے یکانگت کی وجہ سے نہیں آرہے تھے بلکہ یہ سب لوگ شیخ محمد عبداللہ کے نظریاتی دشمن تھے اور ذہنی طور سے محاذ رائے شماری کی سیاست میں یقین رکھتے تھے۔ موقع پرستوں کا ایک گروہ تھا جو کانگرس پلیٹ فارم کو شیخ محمد عبداللہ کی سیاسی شخصیت مسخ کرنے کے لیے استعمال کر رہا تھا۔

www.taemeernews.com

مرکز میں ایک بار پھر کانگریس اقتدار میں آئی تھی جس سے پردیش کانگریس کمیٹی کو شیخ محمد عبداللہ اور ان کی سرکار کے خلاف تحریک میں شدت لانے کا حوصلہ مل گیا تھا حالاں کہ پردیش کانگریس صدر مفتی محمد سعید بخوبی جانتے تھے کہ کشمیر میں کبھی بھی ہندوستانی حامی اپوزیشن جماعت کو زیادہ مدت تک زندہ رہنے کا حق نہیں دیا جاتا۔ ہندوستان کی اپوزیشن جماعتوں میں پردیش کانگریس کمیٹی کے اپوزیشن رول کے بارے میں غلط فہمیاں پائی جاتی تھیں اور ان کا یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ شیخ محمد عبداللہ کی سرکار کو گرانے کے لیے کانگریس سازشیں کر رہی ہے۔ خاص کر بائیں بازو کو شیخ محمد عبداللہ کے بارے میں زیادہ ہی خوش فہمی تھی حالانکہ بائیں بازو نے ہی ۱۹۵۳ میں سامراجی سازش کا ہوا کھڑا کر کے شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری کے لیے ماحول ساز گار بنایا تھا۔ ویسے میں خود بھی Anti establishment ہوں لیکن اس بار میری تمام تر ہمدردیاں شیخ محمد عبداللہ اور ان کی سرکار سے تھیں۔ یہ ممکن ہے کہ میری سوچ پر مفتی محمد سعید کے ساتھ ذاتی نوعیت کے اختلافات حاوی رہے ہوں یا پھر ان کے اردگرد بیشمار چرب زبان موقع پرستوں کے خلاف شدید نفرت کا جذبہ کارفرما ہو۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ پردیش کانگرس میں جو نئے نوجوان وکلاء اور دانشور شامل ہو رہے ہیں ان کا کانگریس کی پالیسیوں اور نظریات سے کوئی لگاؤ نہیں ہے بلکہ وہ شیخ محمد عبداللہ کے نظریاتی دشمن ہیں جو کانگریس کے پلیٹ فارم کو استعمال کر رہے ہیں۔ ٹکراؤ اور تصادم نے شدت اختیار کر لی تھی اور شیخ محمد عبداللہ پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے جا رہے تھے۔ شاید سید میر قاسم اس صورت حال میں کوئی تعمیری رول ادا کر سکتے تھے لیکن ان کے پر کاٹ دیئے گئے تھے اور کانگریس میں ہوتے ہوئے بھی وہ کانگرس سیاست سے الگ تھلگ ہو گئے تھے۔ کانگریس نے شیخ محمد عبداللہ کی مخالفت تک ہی سرگرمیاں محدود رکھی تھیں جبکہ گراؤنڈ لیول پر جماعت اسلامی اور پاکستانی ایجنٹ ایک نئے طوفان کے لیے تنکے جمع کر رہے تھے۔

www.taemeernews.com

سازش

باب ۲۰

کئی برس تک وادی کی سیاسی زندگی میں آوارہ گردی نے مجھے مکمل طور سے توڑ دیا تھا۔ زندگی کی معمول معمولی ضرورتوں سے محروم ۔ یہ آدھا انسان مکمل طور سے مایوس ہو چکا تھا۔ اپنی انکھوں کے سامنے فرش پر رینگنے والوں کو عرش پر پرواز کرتے دیکھ کر محسوس ہو رہا تھا کہ یا تو اناڑی ہوں یا پھر اتنا بیوقوف کہ جہاں برسوں سے کھڑا تھا وہاں سے ایک قدم آگے بڑھنے کی جرات بھی نہیں کر پا رہا تھا ایک مدت کے بعد مجھے یہ احساس دلایا جا رہا تھا کہ جب تک نام موہن چراغی رہے گا سیاسی جماعتوں کے لیے عرایض نویس کا کام ہی کرنا پڑے گا۔ اور اس کے آگے تمام دروازے بند رہیں گے ۔ اور پھر مجھے اپنا نام بدلنے کی ضرورت بھی نہیں تھی کرتا بھی تو نو مسلم ہوتا اور نو مسلم کو وفاداری ثابت کرنے کے لیے معلوم نہیں کتنے اور کب تک پاپڑ بیلتے پڑتے ہیں۔ دہلی بھاگ گیا اور دہلی میں مرحوم یشپال کپور نے نہ جانے کیوں اپنی سرپرستی میں لے لیا اور قومی آواز نئی دہلی کا اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر کیا۔ بخدا نہ تو میرے پاس اس زبان کی کوئی ڈگری تھی، نہ میں نے کسی پرانے شاعر پر تحقیق کی تھی اور نہ ہی میں شاعر تھا۔ ہاں البتہ اردو زبان سے پیار تھا۔ لیکن اس زبان کو بولنے اور لکھنے کی مہارت نہیں تھی۔ لیکن قومی آواز کے چیف ایڈیٹر عشرت علی صدیقی ایک ایسے ڈرل ماسٹر ہیں کہ گدھے کو بھی انسان بنا سکتے ہیں اور پھر میں انسان تھا۔ عشرت صاحب کی تربیت نے کند ہتھیار کی دھار تیز کر دی اور مجھ میں ایسی خود اعتمادی پیدا ہو گئی کہ چار ماہ کے بعد ہی میں قومی آواز کا انچارج بن گیا لیکن قومی آواز میں شامل ہو کر بھی کشمیر سے میں اپنا دامن چھڑانے میں کامیاب نہیں ہوا۔

اس سے قبل کہ آگے کی داستان شروع کروں اس کہانی کا ذکر ضروری ہے کہ کیسے سید میر قاسم کو کانگرس سے علاحدہ ہونے پر مجبور کیا گیا۔ وادی کشمیر کے ضلع اننت ناگ کے مٹن علاقے کے ایک وکیل مکھن لال فوطیدار اپنی پراسرار خاموشی کی وجہ سے محترمہ اندرا گاندھی کے دربار میں مشیر خاص مقرر ہوئے تھے ۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مہاتما گاندھی کے اس بندر کا دوسرا روپ ہیں جس نے کانوں میں انگلیاں دے رکھی ہیں، آنکھوں پر پٹی اور زبان پر تالے چڑھا دیے ہیں اس لیے ان سے ملتے وقت محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ان کے اندر کا انسان کیا

www.taemeernews.com

کہہ رہا ہے۔ میر قاسم نے سنجے گاندھی کے آستاں پر ناک رگڑنے سے نہ صرف صاف انکار کر دیا تھا بلکہ یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ وہ سنجے گاندھی کو لیڈر تسلیم نہیں کرتے۔ کانگرس پارلیمانی بورڈ میں بھی میر قاسم نے سنجے گاندھی کو لوک سبھا کا ٹکٹ دینے کی مخالفت کی تھی۔ میر قاسم کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ جو بات سنجیدگی کے ساتھ سنجیدہ لوگوں سے کرنی چاہئے وہ بات اپنے نوکر سے بھی کرتے ہیں اور نوکر ہمیشہ پیٹ کا ہلکا ہوتا ہے، کسی نہ کسی دوسرے مالک تک بات ضرور پہنچا دیتا ہے اور اسی نے میر قاسم اور مسز اندرا گاندھی کے درمیان غلط فہمیوں کی ایک اونچی دیوار کھڑی کر دی۔ اور اس دیوار کی تعمیر میں ماکھن لال فوطیدار، غلام رسول کار، مفتی محمد سعید اور تیرتھ رام نے خوب محنت کی۔ جنتا پارٹی سرکار کے گر جانے کے بعد جب چناؤ ہوئے تو میر قاسم کھلے عام یہ دعوا کر رہے تھے کہ مسز گاندھی کو اکثریت حاصل نہیں ہوگی اور سرکار بنانے کے لیے انہیں دوسروں کی مدد حاصل کرنی ہوگی۔ اور صرف میر قاسم ہی اس میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ میرے ذہن میں وہ واقعات اب بھی زندہ ہیں کہ کس طرح حقیر مفادات کے لیے دوست اپنے دوست اور محسن کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیتا ہے۔ الیکشن مہم کے سلسلے میں میر قاسم جموں آئے تھے اور ایک ٹرانسپورٹر کے یہاں ایک شاندار محفل میں سید میر قاسم، کرشن دیو سیٹھی، مفتی محمد سعید، گردھاری لال ڈوگرہ، غلام رسول اور میں موجود تھے، محفل شباب پر تھی اور میر قاسم کی سوچ نے ایک لمبی انگڑائی لے کر اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ "اندرا گاندھی اور میر قاسم کے لڑائی کے درمیان تم لوگ کس کا ساتھ دوگے۔" گرما گرمی ہوئی۔ مفتی محمد سعید جیسا خاموش طبیعت کا انسان بھی بپھر اٹھا۔ ہر نے ایک دوسرے کے لباس کو تار تار کر دیا۔ میر قاسم بہکتے رہے اور اندرا گاندھی اور سنجے گاندھی کے خلاف دبی ہوئی نفرت باہر آ گئی۔ میر قاسم کو مشتعل کر کے غلام رسول کار اور مفتی محمد سعید کا منشا پورا ہو گیا تھا۔ حالاں کہ دوسری صبح میں اور کرشن دیو سیٹھی نے میر قاسم اور مفتی محمد سعید کے درمیان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوششیں کیں لیکن دلی تک تار ہل گئے تھے۔

چناؤ نتائج سامنے آئے اور مسز گاندھی کی پارٹی کو بھاری اکثریت حاصل ہوئی ایک سازش کے تحت چند انگریزی اخباروں میں یہ خبر لیک کی گئی کہ نئی کابینہ میں میر قاسم وزیر خارجہ ہوں گے حالانکہ اس خبر میں کوئی صداقت نہیں تھی۔ یہ صرف میر قاسم کو تباہ کرنے کا ایک منصوبہ تھا۔ کامیابی کا جشن منانے کے لیے سندر نگر دلی میں لالہ تیرتھ رام کے مکان پر محفل سجائی گئی۔ میں نے لالہ تیرتھ رام کا تعارف ابھی تک نہیں کرایا۔ لالہ تیرتھ رام کی تاریخ اور جغرافیہ یہ ہے کہ وہ محکمۂ جنگلات میں ایک کلرک تھے۔ اور ان کی شادی اسی محکمہ کے سربراہ کی بیٹی کے ساتھ طے ہوئی۔ شادی نے انہیں ٹھیکیدار بنا دیا اور پھر انہوں نے ترقی کے زینے طے کرنے کے لیے کبھی

www.taemeernews.com

مرزا محمد افضل بیگ کو، کبھی غلام محمد صادق کو اور کبھی درگا پرشاد در کو اپنی بیساکھی بنایا۔ سیاسی شخصیتوں کے ساتھ یارانہ بڑھتا گیا۔ اور لالہ جی کی تجوریوں کے منہ بھی دراز ہوتے گئے۔خرید و فروخت کا کاروبار تیز ہوا۔ لالہ جی کافی دور اندیش بھی ہیں اور زمانہ ساز بھی۔ کس موسم میں کس طرح کی چڑیا کو کس طرح کا دانا ڈالنا چاہئے اس فن سے وہ بخوبی واقف ہیں، صادق صاحب وزیر اعلا بنے تو انہوں نے لالہ تیر تھ رام کو راجیہ سبھا کا ممبر بنا دیا۔ اور تب سے کتنے ہی طوفان کشمیر اور دہلی میں آئے، لالہ جی آگے ہی بڑھتے گئے۔ حکومتیں بنتی گئیں اور گرتی گئیں لیکن لالہ جی راجیہ سبھا کی رکنیت سے محروم نہیں ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ لالہ جی کو سیاست سے کوئی پیار نہیں ہے البتہ ان کی الگ الگ تجوریوں میں ہر سیاسی پارٹی کے نام کی پرچی موجود رہتی ہے۔ سیاسی نظریات اور سیاسی فلسفے سے انہیں بدہضمی ہو جاتی ہے، اسی لئے بوقت ضرورت تجوری سے وہی پرچی نکال لیتے ہیں جس کی مانگ ہوتی ہے۔ وہ مرحوم راجیو گاندھی کے کافی قریب تھے۔ آج کل معلوم نہیں کس بیساکھی کی تلاش میں ہیں۔

بات ہو رہی تھی لالہ تیر تھ رام کے گھر پر جشن کی۔اس جشن میں جموں کشمیر قانون سازیہ کے اکثر ممبران موجود تھے۔ میر قاسم بھی تھے اور مجھ جیسا شطرنج کا پیادہ بھی۔ سیاست موضوع بحث نہیں تھی۔ شعر شاعری ہو رہی تھی۔ پرانے زخموں کو کرید کر ہر کوئی ان پر مرہم لگانے کی بات کر رہا تھا کہ مکھن لال فوطیدار جلوہ گر ہوتے ہی سیدھے میر قاسم سے مخاطب ہوئے "بنجے گاندھی کے بارے میں آپکا کیا خیال ہے؟ محفل پر سناٹا چھا گیا ہر کسی نے محسوس کیا کہ مکھن لال فوطیدار نے شرارت کی ہے اور میر قاسم اس میں پھنس گئے ہیں۔ میر قاسم اس بیہودہ سوال پر مشتعل ہوئے۔ " مکھن لال فوطیدار مسز اندرا گاندھی سے کہو کہ میں کبھی بنجے گاندھی پر ایمان نہیں لاؤں گا۔ وہ کون ہے، اس کی حیثیت کیا ہے اور پھر مسز گاندھی کیوں یہ بات بھول جاتی ہیں کہ میں نے ان کے والد کے ساتھ کام کیا ہے "فوطیدار صاحب کا مشن پورا ہو گیا اور محفل پر ویرانی چھا گئی حالاں کہ بعد میں میر قاسم کو احساس ہوا کہ وہ فوطیدار کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گئے۔ میر قاسم محسوس کر رہے تھے کہ مسز گاندھی کے اقتدار میں واپس آنے کے بعد ریاست میں شیخ محمد عبداللہ کی سر کار کے خلاف تحریک نیا رخ اختیار کرے گی۔ وہ بار بار مسز گاندھی کی توجہ اس طرف دلا رہے تھے اور مسز گاندھی ان پر الزام لگا رہی تھیں کہ انہوں نے شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ ایکارڈ کر کے ملکی عوام کو دھوکے میں رکھا ہے۔ اس دوران شیخ محمد عبداللہ پر دل کا دورہ پڑا اور وہ ۸۔ ستمبر ۱۹۸۲ کو فوت ہو گئے۔

جس شیخ محمد عبداللہ کے مقبرے کو توڑنے کے لیے آج کل کشمیر میں آئے دن کوششیں ہوتی رہتی ہیں۔ اس میں شیخ محمد عبداللہ کو لٹانے کے لیے لاکھوں کشمیری مسلمانوں

www.taemeernews.com

نے ایسا ماتم کیا کہ محسوس ہو رہا تھا کہ قدرت بھی سینہ کوبی کر رہی ہے، لاکھوں بچے، بوڑھے، عورتیں اور مرد سڑکوں پر روتے رہے اور ماتم کرتے رہے۔ چند میل کا سفر ۱۲ گھنٹے میں طے ہوا اور لوگوں کا اتنا ہجوم کہ مشکل سے ہی شیخ صاحب کی تدفین مشکل ہو سکی۔ ان کی تدفین کے بعد کئی روز تک کشمیر میں ماتم جاری رہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ "احتجاج کی زبان خاموش ہو گئی ہے" وزیر اعظم اندرا گاندھی نے راتوں رات فیصلہ کر کے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو وزیر اعلا کا حلف دلایا حالانکہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ فاروق اعلا وزیر اعلا بنیں لیکن وادی کے مسلمانوں کے موڈ کو دیکھتے ہوئے وہ کوئی دوسرا فیصلہ لے بھی نہیں سکتی تھیں۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے اقتدار سنبھالتے ہی اپنی پہلی تقریر میں کرپشن اور کنبہ پروری کے خلاف آواز بلند کی اور اس میں انہوں نے اپنے والد اور ان کے رفقاء کو بھی معاف نہیں کیا لیکن بد قسمتی سے نہ فاروق عبداللہ سیاسی لحاظ سے پختہ تھے اور نہ ہی انہیں ایڈمنسٹریشن کا کوئی تجربہ تھا۔ ایک نوجوان جس کی تربیت مسجد سے باہر ہوئی تھی بھلا وہ کیسے اپنے آپ کو ایک تنگ دائرے میں قید رکھتا۔ انہوں نے کانگریس کے ساتھ روایتی تعلقات توڑ کر ہندوستان کی سیکولر اپوزیشن جماعتوں کے ساتھ تعلقات استوار کیے۔ شاید میر قاسم اس میں ان کے مشیر تھے۔ میر قاسم کے کانگرس کے ساتھ تعلقات قریب قریب ٹوٹ چکے تھے اور انہوں نے اپنے دوستوں اور بہی خواہوں کے دباؤ کے باوجود کانگرس سے استعفا دے دیا۔ اس میں ہیم وتی نندن بہوگنا مارکسٹ، کمیونسٹ پارٹی کے ہری کشن سنگھ سرجیت اور دوسرے لوگوں کا مشورہ کارفرما تھا۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے اپوزیشن لیڈروں کو کشمیر آنے کی دعوت دی اور سرینگر میں وزیر اعلا کی سرکار قیام گاہ پر اپوزیشن لیڈروں کا conclave منعقد ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جب ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے اپوزیشن کے لیے کشمیر کے دروازے کھول دیے اور اگر ڈاکٹر فاروق نے دیانت داری اور خلوص کے ساتھ اس نئے سیاسی ماحول کو زندہ رکھنے کی کوشش کی ہوتی تو شاید آج کشمیر کی سیاسی صورت حال مختلف ہوتی۔ میر قاسم نے اس کانفرنس میں جیوتی باسو، ہیم وتی نندن بہوگنا اور این ٹی راما راؤ کے سامنے فاروق عبداللہ کو وارننگ دی کہ "وہ اپنے کابینہ کے ساتھیوں پر نظر رکھیں اور دیکھیں کہ کس طرح کا ماحول ابھر رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک دن تم وزیر اعلی کی حیثیت سے سو جاؤ تو دوسری صبح اس کرسی پر کوئی اور بیٹھا ہو" اور سید میر قاسم کی یہ وارننگ درست ثابت ہوئی۔

شیخ محمد عبداللہ کے داماد خواجہ غلام محمد شاہ سیناریٹی اور قربانی کے لحاظ سے یہ سوچنے میں حق بجانب تھے کہ شیخ محمد عبداللہ نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو اپنا سیاسی جانشین بنا کر ان کے ساتھ انصافی کی ہے اور پھر مرزا محمد افضل بیگ کو جانشینی کے راستے سے ہٹانے میں بھی غلام محمد شاہ

www.taemeernews.com

کو استعمال کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ نیشنل کانفرنس کے دوسرے لیڈر خاص کر ڈی ڈی ٹھاکر بھی اپنی بے عزتی کا انتقام لینے کے لئے دہلی کے لیڈروں کے ساتھ پائپ لائن جوڑ رہے تھے۔ جنوری ۱۹۸۴ میں یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ غلام محمد شاہ اور ان کے حمایتی ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ اس سلسلے میں کنگن کے ایک ایم ایل اے شیخ عبدالجبار نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ پر پہلا پتھر پھینکا اور فاروق عبداللہ کی ہمشیرہ مسز خالدہ شاہ اور غلام محمد شاہ نے کھل کر شیخ جبار کی حمایت کی۔ ۲۳۔ مئی کو خالدہ شاہ نے نیشنل کانفرنس کا ایک کنونشن منعقد کیا، جس میں غلام محمد شاہ، ڈی ڈی ٹھاکر، غلام نبی کوچک، موہن کشن ٹکو اور اے آر شاہین نے شرکت کی۔ کنونشن میں فاروق عبداللہ کو نیشنل کانفرنس کی صدارت سے ہٹا دیا گیا اور خالد شاہ کو ان کی جگہ نامزد کیا گیا۔ اس کنونشن میں نیشنل کانفرنس کے لیڈروں اور کارکنوں کے علاوہ اور بھی کئی ایسے نوجوان سرگرم تھے جو ایسے ہی ماحول میں زندہ رہا کرتے ہیں۔ ان نوجوانوں کی تو ڈاکٹر فاروق عبداللہ سے نہ کوئی دشمنی تھی اور نہ ہی غلام محمد شاہ سے کوئی دوستی۔ معاملہ صرف لین دین کا تھا۔ پبلک نیلامی تھی جس نے اونچی بولی دی اس نے خرید لیا اور ایسے معاملے میں تجوریوں کے منہ ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ ان نوجوانوں نے بھی راتوں رات غلام محمد شاہ اور خالدہ شاہ کے ارد گرد ایسا گھیرا ڈالا کہ محسوس ہو رہا تھا کہ یہ نوجوان آنے والے وقت کے سکندر بن جائیں گے ان نوجوانوں کو جموں کے اخبار نویس وید بھسین کی سرپرستی حاصل تھی۔ وید بھسین جنہوں نے کانگرس کا لباس زیب تن کیا تھا وہ بھی فاروق عبداللہ کی سرکار کو گرانے میں پیش پیش تھے۔

پردیش کانگرس فاروق سرکار کو گرا کر شیخ محمد عبداللہ کے خاندان میں ہی پھوٹ ڈال کر اس خاندان کے کسی فرد کو وزیر اعلا بنانے کے منصوبے پر کام کر رہی تھی اور اس میں لالہ تیرتھ رام اور ایک تاجر محمد اقبال کی خدمات حاصل کی گئیں ممبران اسمبلی کی خرید و فروخت اور دل بدلی پر اکسانے کا کام لالہ تیرتھ رام اور محمد اقبال کے سپرد تھا۔ محمد اقبال کو کئی برسوں کے بعد جنتا دل سرکار کے وزیر داخلہ مفتی محمد سعید کی لڑکی کو اغوا کرنے کی سازش میں گرفتار کر لیا گیا۔ یکم جولائی کو رات کے ساڑھے ۱۰ بجے غلام محمد شاہ اور ڈی ڈی ٹھاکر کی قیادت میں ممبران اسمبلی کا ایک گروپ راج بھون گیا اور گورنر جگموہن سے ملاقات کرنے کی درخوست کی لیکن گورنر نے انہیں دوسرے روز صبح آنے کی ہدایت دی۔ گورنر جگموہن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ "وزیر اعظم مسز گاندھی کے ساتھ ایک حالیہ ملاقات میں مجھے بتایا گیا تھا کہ فاروق عبداللہ کے ساتھ تعلقات میں بہتری آ رہی ہے اور انہیں ہٹانے کی ابھی کوئی مجبوری نہیں ہے۔ لیکن غلام محمد شاہ نے مجھے اطلاع دی کہ کانگرس پارلیمانی پارٹی نے بھی ان کی حمایت کا اعلان کیا ہے۔ دوسرے روز صبح غلام محمد شاہ ۱۲ ممبران اسمبلی منشی حبیب اللہ، محمد دلاور میر، حسام الدین بانڈے، شیخ عبدالجبار،

www.taemeernews.com

طالب حسین، ڈاکٹر محبوب بیگ، حکیم محمد یاسین، محمد خلیل جوہر، گور بچن کماری رانا، غلام حسن میر، کھیم لتا و کھلو اور ثناءاللہ ڈار کے ہمراہ گورنر جگموہن سے ملے۔ کانگرس پارلیمانی کے لیڈر مولوی افتخار حسین انصاری بھی اس موقع پر موجود تھے۔ ۱۲ ممبران اسمبلی کے دستخطوں سے گورنر کو ایک رنڈم دیا گیا جس میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ پر عدم اعتماد اور غلام محمد شاہ کو لیڈر بنانے کی تفصیل درج تھی۔ آزاد ممبر علی محمد ناٹک نے بھی حمایت کا اعلان کیا۔

گورنر جگموہن نے اپنی کتاب Frozen Turbulance in Kashmir میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ جو ڈرامہ کھیلا جارہا تھا اس سے وہ بالکل بے خبر تھے اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو ہٹانے میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ جگموہن کو ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے ہی گورنر بنایا گیا تھا اور وہ اس سازش کے ایک اہم کردار تھے۔

www.taemeernews.com

جماعت اسلامی کا سیاہ کردار باب ۲۱

حقیقت یہ ہے کہ کشمیر میں مسلح دہشت گردی اور کشمیر کے سیکولر کردار کو ختم کرنے کی تحریک اگست ۱۹۸۹ء میں شروع ہوئی لیکن اس کے لئے راہ ایک طویل مدت سے ہموار کی جارہی تھی۔ سیکولرزم اور کشمیریت کے خلاف سازش نے کشمیری پنڈت ایجی ٹیشن کے فوراً بعد ہی اونچے ایوانوں میں جنم لیا تھا اور اس سازش میں کانگریس سمیت دوسری سیاسی جماعتیں اور مقامی اخبارات بھی شریک تھے۔ کشمیری پنڈت ایجی ٹیشن نے تمام سیاسی رہنماؤں، اعلاسر کار افسروں اور دوسرے بااثر لوگوں کے چہروں پر پڑے سیکولرزم کے پردوں کو تار تار کر دیا تھا۔ کشمیری کی سیاسی زندگی سے کشمیری پنڈتوں کو الگ تھلگ کرنے کے لئے منصوبہ کے ساتھ عمل ہو رہا تھا۔ اس میں مرحوم غلام محمد صادق۔ شیخ نور محمد۔ بیگم زینب۔ مس محمود وغیرہ شامل تھے۔ اس سازش کا پہلا نشانہ مرحوم درگا پرشاد در کو بنایا گیا اور ان سے پوچھے بغیر ان سے وزارت داخلہ کا قلمدان چھین لیا گیا۔ خواجہ غلام محمد صادق نے اس وقت کی وزیر اعظم مرحومہ اندرا گاندھی پر ایسا دباؤ ڈال دیا کہ درگا پرشاد در کو ریاست بدر کرنے کا نفرت آمیز فیصلہ کیا گیا اور ساتھ ہی مرحوم درگا پرشاد در کے دوستوں خاص کر سید میر قاسم کے پر کاٹ لینے کے لئے ایسا پلان تیار کیا گیا کہ کافی مدت تک وہ سیاسی فضا پر اڑان کرنے میں ناکام رہے۔ اس دوران جماعت اسلامی جو پنڈت ایجی ٹیشن کے دوران حکمراں گروہ کے کافی نزدیک آ گئی تھی اسے وادی مین اسکولوں کا جال بچھانے کا موقعہ دیا گیا اور یہ اسکول کچے ذہنوں کو نفرت اور تعصب کے سانچوں میں قید کرنے کے قید خانے بن گئے۔ کشمیری پنڈتوں کے خلاف مہم شروع کی گئی کہ مختصر سی اقلیت ہو کر بھی یہ سرکاری نوکریوں اور مرکزی محکموں پر قابض ہو گئے ہیں۔ پروپگنڈہ کیا گیا کہ کشمیری مسلمان کے لئے بانہال یار کے تمام دروازے بند ہیں جبکہ کشمیری پنڈت کے لئے ہر دروازے کھلے ہیں۔ شاید یہ کشمیری پنڈت لیڈر اس پروپیگنڈہ کی کاٹ کرتے لیکن وہ اس خوف سے خاموش رہے کہ ان پر فرقہ پرست ہونے کا الزام لگے گا۔ البتہ چند موقعہ پرست اور چاپلوس برانڈ کے کشمیری پنڈت محض اپنے ذاتی مفادات کے لئے سازشی عناصر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس طرح کے منفی پروپگنڈا کی حمایت کرتے رہے۔

www.taemeernews.com

۱۹۸۹ء میں جب دھماکوں کا سیزن شروع ہوااور زلزلوں نے کشمیر کی تہذیبی اور مذہبی روایات کی مضبوط بنیادوں کو منہدم کرنا شروع کیا تو کشمیری پنڈتوں کو اس نئی تبدیلی سے حیرانی ہوئی شاید وہ اس طرح کے حالات کے لئے تیار نہیں تھے حالاں کہ انہیں کئی موقعوں پر اشاروں اور کنایوں سے سمجھایا گیا تھا کہ کشمیر میں ان کے لئے زمین تنگ پڑتی جارہی ہے۔ عام کشمیری پنڈت سمجھ رہا تھا کہ جس کشمیری مسلمان نے ۱۹۴۷ء کے طوفان سے اسے محفوظ رکھا اسے پناہ دی۔ اس کی عزت آبرو کا تحفظ کیا وہ آج بھی اس طوفان کا رخ کو موڑ دے گا۔ اسے کشمیری مسلمان پر اتنا بھروسہ تھا کہ ایسی خوش فہمی مین مبتلا رہا کہ جب تک اسے بھگایا نہیں گیا تب تک وہ یہی سمجھتا رہا کہ اسے کوئی بھاگنے نہیں دے گا ہندو مسلمان کی دوستی اتنی گہری تھی کہ ہندو سینہ تان کر ہر ایک کو چیلینج کرتا تھا کہ جب تک کشمیری مسلمانوں کا تحفظ اسے حاصل ہے دنیا کی کوئی طاقت اسے کشمیری کلچر سے جدا نہیں کر سکتی۔ لیکن اسے خوش فہمی نے گمراہ کیا۔ ہر کشمیری مسلمان کو ذہنی طور سے اس بات کے لئے تیار کیا گیا تھا کہ ہندوستان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کشمیری پنڈتوں کی نسلی صفائی لازمی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ۱۹۸۹ء میں دہشت گردی کی ابتدا کشمیری پنڈتوں کے سرکردہ لوگوں کو قتل کرنے اور کشمیر میں نظام مصطفے قائم کرنے کے نعرہ سے شروع ہوئی۔ کشمیری پنڈت نوجوان کٹتے گئے لیکن کسی نے خاموش احتجاج بھی نہیں کیا۔ کشمیری پنڈت خوفزدہ ہوا لیکن کسی نے اسے جھوٹی تسلی بھی نہیں۔ تب تو بندوق کے خوف نے نہ ذہنوں کو ماؤف کیا تھااور نہ ہی کسی کی زبان کو گنگ کر دیا تھا۔ اپنے آپ کو سیکولرزم کا ٹھیکیدار سمجھنے والے بھی قتل غارت ماحول میں گم ہو گئے تھے خاموشی اور اس گمشدگی کے ماحول میں کشمیری پنڈت کو ہجرت کرنی پڑی۔ الزام جگموہن پر لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے کشمیری پنڈتوں کو ہجرت کرنے کی تحریک دی، یہ الزام محض ایک دھوکا ہے ایک فراڈ ہے کشمیی پنڈتوں کی نسلی صفائی پر پردہ ڈالنے کی ایک بھونڈی کوشش ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ جگموہن نے لاکھوں کشمیری پنڈتوں کو گود میں بٹھا کر بانہال پار پھینک دیا۔ تو پوچھا جاسکتا ہے کہ کشمیری پنڈتوں کے مکانوں کو کس نے آگ لگادی، کس نے خالی مکانوں کے تالوں کو توڑ کر کشمیری پنڈتوں کا سامان لوٹ لیا۔ وہ کون لوگ تھے جو لال چوک کے سنڈے مارکیٹ میں کشمیری پنڈت کے سامان کو سستے داموں پر فروخت کرتے رہے۔ یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ چرار شریف میں درگاہ کو آگ لگادینے کے فوراً بعد کیوں کشمیری پنڈتوں کے مکانوں کو آگ لگا کر تباہ کر دیا گیا۔ کیوں تاریخی مندروں کو مسمار کیا گیا۔ کیوں قیمتی اور نایاب مورتیوں کو توڑ کر چکنا چور کیا گیا۔ یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ کشمیری پنڈتوں کے مکانات، باغات اور زرعی زمینوں کو کسی نے جعلی دستاویزوں

www.taemeernews.com

کی بنیاد پر فروخت کیا۔ کس کے اشاروں پر کشمیری پنڈتوں کے خالی مکانوں پر قبضے کئے گئے۔ اسکے لئے بھی کیا جگموہن کو ملزم ٹھہرایا جاسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کشمیری پنڈتوں کی نسلی صفائی ایک منصوبے کے تحت کی گئی۔ اگر واقعی کشمیری مسلمان حکومت ہند سے ناراض تھا تو وہ حکومت ہند کے ساتھ لڑائی لڑ سکتا تھا۔ اس نے تو ۱۹۵۲ کے بعد ۱۹۷۷ تک حکومت ہندوستان کے خلاف رائے شماری کیلئے زبردست لڑائی لڑی تھی۔ لیکن تب کشمیری پنڈتوں کو نہ تو بھگایا گیا اور نہ ہی کسی کشمیری پنڈت کو قتل کیا گیا۔ ۱۹۸۹ میں ہی کیوں یہ نیا طوفان کھڑا کیا گیا۔ شاید کشمیر کے بارے بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ اگست ۱۹۸۹ میں جماعت اسلامی کے ممبران اسمبلی نے اچانک اسمبلی کی رکنیت سے استعفا دے دیا۔ وزیر اعلاڈاکٹر فاروق عبداللہ ملک سے باہر تھے اور اس وقت کے وزیر مال پیارے لال ہنڈو اور دو دیگر ساتھیوں ممبروں محی الدین شاہ اور محمد شفیع اوڑی نے جماعت اسلامی کے ممبران اسمبلی کی اچانک اس تبدیلی کو کسی گہری سازش کی کڑی قرار دے کر اس پر گہرائی سے تجزیہ کرنے کا مشورہ دیا، ایک اعلا سطح کی کمیٹی بھی بنائی گئی لیکن اس کمیٹی نے کیا رپورٹ دی کسی کو معلوم نہیں۔ جماعت اسلامی کے ممبران کی اس اچانک تبدیلی ایک سوچی سمجھی سازش کی کڑی تھی اور کشمیری پنڈتوں کو بھگانے کا عمل اس کی ایک اہم کڑی تھی۔

www.taemeernews.com

ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی سرکار گرانے میں مرکزی سرکار نے جلد بازی کیوں کی؟
جب کہ کانگریس کی مرکزی لیڈرشپ بخوبی جانتی تھی کہ اس طرح کی سنگین غلطی کے کتنے بھیانک نتائج ماضی میں نکلے ہیں۔ ۹۔اگست ۱۹۵۳ء کو شیخ محمد عبداللہ کی سرکار گرانے کے لیے ۲۲ برس بعد مرکز کو اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کے لئے شیخ محمد عبداللہ کو دوبارہ اقتدار میں لانا پڑا۔ ۱۹۷۷ء میں پھر شیخ محمد عبداللہ کی سرکار کو گرا کر جو خود کشی کی گئی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسمبلی چناؤ میں کانگرس کا وادی میں صفایا ہو گیا۔ ۱۹۸۳ء کے چناؤ میں بھی جب مرکزی سرکار نے پرانے آزمائے ہوئے ہتھکنڈے استعمال کئے تو کانگرس پھر وادی میں پٹ گئی۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ نیشنل کانفرنس کافی مقبول تھی یا پھر کانگرس کے خلاف شدید نفرت تھی۔ جب جب مرکز نے وادی کی سیاسی زندگی میں مداخلت کی نیشنل کانفرنس کو کشمیری مسلمانوں میں ہندوستان کے خلاف نفرت پیدا کرنے کا موقع ملا اور کانگریس ہمیشہ نیشنل کانفرنس کے بچھائے ہوئے اس جال میں پھنستی رہی۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ ۱۹۸۳ء کے اسمبلی چناؤ میں عوامی منڈیٹ حاصل کر کے اقتدار میں آئے تھے۔ اس سے انکار نہیں کہ اقتدار میں آ کر فاروق عبداللہ عوامی مسائل حل کرنے میں بری طرح ناکام ہو گئے تھے اور عوامی مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ شاید کشمیری عوام خود ہی ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی سرکار کو گرانے میں پہل کرتے اگر پردیش کانگریس ایک منصوبہ بند سازش کے تحت فاروق سرکار کو گرا نہیں دیتی اور پھر کانگریس نے سرکار کو گرانے کے لئے ایسے مہروں کا انتخاب کیا، جن کے بارے میں عام تاثر یہ تھا کہ مرکزی سرکار کے زرخرید ایجنٹ ہیں اور جب جب کشمیری مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ مرکزی سرکار کے ایجنٹ حکومت گرانے میں آلہ کار بنے ہیں تب تب کشمیری مسلمانوں میں ہندوستان کے خلاف نفرت پیدا ہوئی اور ان میں یہ احساس پیدا ہوا کہ مرکزی سرکار کبھی بھی کشمیر میں کسی عوامی سرکار پر بھروسہ نہیں کرے گی اور یہی بنیادی وجہ ہے کشمیر میں علاحدگی پسندی کی تحریک کے جارحانہ انداز سے ابھرنے کی۔

www.taemeernews.com

دل بدلی　　باب ۲۲

گورنر جگموہن کے سامنے نیشنل کانفرنس کے جن ممبران اسمبلی کو پیش کیا گیا ان میں طالب حسین، ثناء اللہ ڈار اور کرگل کے منشی حبیب اللہ بھی شامل تھے۔ ان تینوں کی سیاسی زندگی کانگرس سیاست سے شروع ہوئی تھی اور مرکز میں کانگرس کی شکست کے بعد ان تینوں نے نیشنل کانفرنس میں شمولیت اختیار کرلی تھی۔ تینوں بدترین قسم کے موقع پرست ثابت ہوئے تھے اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے تینوں کی بیساکھی بن کر انھیں قانون ساز اسمبلی تک پہنچادیا تھا۔ نیشنل کانفرنس کے ایک اور ممبر اسمبلی محبوب بیگ اس دل بدلو گروپ میں شامل تھے۔ محبوب بیگ مرحوم مرزا محمد افضل بیگ کے بیٹے ہیں اور محبوب بیگ کو بخوبی معلوم تھا کہ جس غلام محمد شاہ کا ہاتھ وہ تھام رہے تھے اسی غلام محمد شاہ نے مرزا محمد افضل بیگ کو شیخ صاحب کے زمانے میں ایک سازش کے تحت نیشنل کانفرنس سے خارج کرایا تھا اور گاندھی پارک میں ان پر قاتلانہ حملہ کرایا تھا۔ ڈی ڈی ٹھاکر ایک اور دل بدلو لیڈر تھے۔ ایک اچھے وکیل ہیں اور جانتے ہیں کہ کس موکل کی جیب کاٹنے سے اپنی جیب بھری جاسکتی ہے۔ شیخ محمد عبداللہ نے ۱۹۷۵ء میں بغیر جانے پہچانے انھیں عدالت سے اٹھا کر کابینہ درجہ کا وزیر بنادیا تھا۔ جب تک شیخ صاحب حیات تھے تو وہ ان کے وفادار تھے حالاں کہ غلام محمد شاہ نے اس زمانے میں بھی کئی بار ڈی ڈی ٹھاکر کو کنارے لگانے کی کوشش کی تھی۔ فاروق نے کابینہ سے چھٹی کر دی تو ڈی ڈی ٹھاکر مرکزی کانگرس کا دامن تھام کر غلام محمد شاہ کا گریبان پکڑ کر جھول گئے۔ غلام محمد شاہ کی حمایت کرنے والوں میں ایک آزاد ممبر اسمبلی علی محمد نائک بھی تھے، محاذ رائے شماری سے سیدھے کانگرس کی جھولی میں گر پڑے۔ یہاں سے چھلانگ لگا کر آزاد ممبر بن گئے اور آزادی سے تنگ آ کر غلام محمد شاہ پر عاشق ہو گئے۔ کانگرس پارلیمانی پارٹی کے لیڈر مولوی افتخار حسین انصاری محاذ رائے شماری سے کانگریس میں، کانگریس سے جنتا پارٹی میں اور جنتا پارٹی سے واپس کانگرس میں آ کر گھاٹے میں نہیں رہے تھے۔ مرحوم بخشی گاندھی کے زمانے میں جب ماروتی کی ایجنسیاں تقسیم ہو رہی تھیں تو مرحوم غلام محمد صادق کے بیٹے رفیق صادق کو یہ ایجنسی الاٹ کی گئی تھی۔ زرحصص بھی انہوں نے جمع کیا تھا لیکن پردیش کانگریس صدر مفتی محمد سعید کے ساتھ اختلافات نے رفیق صادق کو پیچھے دھکیل

www.taemeernews.com

دیااور ماروتی ایجنسی مولوی افتخار حسین انصاری کو مل گئی اور جس زمین پر انہوں نے کارخانہ اور شو روم کھولا وہ زمین کشمیری پنڈتوں کے درگا ناگ ٹرسٹ کی ملکیت ہے۔ ایک حصے پر تو ناجائز قبضہ کیا اور دوسرا حصہ ایک ایسے کشمیری پنڈت سے خرید لیا جس کو یہ زمین ٹرسٹ نے کرائے پر دی تھی۔ ماروتی ایجنسی نے مولوی افتخار حسین انصاری کو اتنا سیکولر بنا دیا کہ انھیں فاروق عبداللہ اینٹی نیشنل نظر آنے لگے اور انہوں نے بھی گورنر جگموہن کو یہ یقین دلایا کہ اگر غلام محمد شاہ کو وزیر اعلا بنایا جائے گا تو کانگریس پارٹی پارلیمانی پارٹی ان کی باہر سے حمایت کرے گی۔ گورنر جگموہن نے اپنی کتاب میں یہ تاثر دیا ہے کہ وہ غلام محمد شاہ کو حلف دلانے کے لئے تیار نہیں تھے بلکہ گورنر راج نافذ کرنا چاہتے تھے لیکن مرکز نے دباؤ ڈال کر انھیں غلام محمد شاہ کو وزیر اعلا بنانے پر مجبور کیا حالاں کہ یہ سفید جھوٹ ہے۔ گورنر جگموہن کو بخوبی معلوم تھا کہ انھیں گورنر اسی مقصد کے لئے بنایا گیا تھا اور جو ۱۲۔ اسمبلی ممبران کے سامنے کھڑے تھے انھیں رات کے اندھیرے میں خریدا گیا ہے۔ عام افواہ یہ تھی کہ ہر دل بدلو ممبر اسمبلی کو ۲۰ لاکھ روپے میں خریدا گیا لیکن سودا ۱۲۔ لاکھ روپے میں طے ہوا تھا۔

گورنر جگموہن نے اپنی کتاب میں اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی سرکار کو گرانے کے لئے اتنے ہی ذمہ دار تھے جتنے کہ ۱۲ دل بدلو ممبران اسمبلی اور پردیش کانگریس کے لیڈر۔ خواجہ غلام محمد شاہ کو وزیر اعلا کا حلف دلایا گیا اور جتنے بکاؤ ممبران اسمبلی نے ان کی حمایت کی تھی ان سب کو وزیر بنایا گیا۔ مرکزی سرکار نے کشمیر مین فاروق سرکار کو گرا کر اور غلام محمد شاہ کو وزیر اعلا مقرر کر کے سیاسی خودکشی کی اور وادی میں تمام ہند مخالف عناصر کے متحد ہونے کے لئے راستہ ہموار کیا۔ قومی آواز نئی دہلی نے اس روز کے اداریے میں اس طرف واضح اشارہ کیا تھا اور ان خطرات کی نشان دہی کی تھی جو غلام محمد شاہ کے وزیر اعلا بننے سے ابھر سکتے تھے۔ پردیش کانگریس کے لیڈروں نے زبردست سینہ کوبی کی۔ نئی دہلی تک تار ہلادئے لیکن قومی آواز کے چیئرمین قابل تعریف ہیں کہ انہوں نے اخبار کے ایڈیٹر کی آزادی پر کسی کو حملہ آور نہیں ہونے دیا۔

غلام محمد شاہ اینٹی باز سیاست داں ہیں۔ بات کرتے وقت انکھیں ملانے سے کتراتے ہیں۔ چہرا سپاٹ اور ایسا پاٹ لگتا ہے کہ پتھر کے بت کا سامنا ہے۔ شاید ہی کسی نے ان کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی ہو۔ مزاج بلغمی اسی لئے ہر وقت گالی اگلتے رہتے ہیں۔ اپنے حریف کے لئے گندی سے گندی اور غلیظ سے غلیظ گالی دینے میں ماہر۔ اپنے مفاد کے لئے گدھے کو بھی سرکہہ سکتے ہیں۔ کانگریس کے نظریاتی دشمن مگر پھر بھی ہوس اقتدار کے لئے کانگریس کے چپراسی سے بھی بغلگیر ہو سکتے ہیں۔ کانگریس کی حمایت حاصل کر کے وہ اکثر یہ گانا سناتے تھے۔

www.taemeernews.com

"سو سال پہلے مجھے تم سے پیار تھا
آج بھی ہے اور کل بھی رہے گا۔"

غلام محمد شاہ کی سرکار بنتے ہی وادی میں مظاہروں اور احتجاجوں کا ایک نیا طوفان شروع ہوا۔ ہڑتالیں، بند اور تشدد زندگی کا معمول بن گیا اور شاہ سرکار کو بار بار کرفیو نافذ کرنا پڑا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ غلام محمد شاہ کا کشمیریوں نے نام رکھا، گل کرفیو۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ غصے سے بپھر اٹھے۔ مرکز اور کانگرس کے خلاف شدید نفرت ابل پڑی۔ لیکن اقتدار چھین جانے کے بعد ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے نہ تو ہندوستان کے ساتھ الحاق کو چیلینج کیا اور نہ ہی اینٹی انڈیا رویہ اختیار کیا۔ حالاں کہ کشمیری لیڈروں کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ اقتدار کھو کر وہ الحاق پر شکوک و شبہات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ فاروق نے ایک سلجھے محب وطن کی طرح اس کو مرکز مخالف تحریک کا رخ دیا اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ فاروق ہندوستان کی سیکولر پارٹیوں کے کافی نزدیک تھے مغربی بنگال کے وزیر اعلا جیوتی باسو کا اس میں خاص رول رہا ہے۔ اقتدار چھن جانے کے بعد میں نے کئی بار ڈاکٹر فاروق سے انٹرویو لیئے لیکن ہر بار انہوں نے جمہوری نظام کو مضبوط کرنے، کشمیری عوام کے جمہوریت پر ایمان کی آبیاری کرنے اور جماعت اسلامی کے خلاف منظم جنگ لڑنے کی باتیں کیں۔ ایک بار بھی انہوں نے ہندوستان کے خلاف نفرت یا دشمنی کا اظہار نہیں کیا، بار بار وہ کہتے رہے "شیخ محمد عبداللہ کا بیٹا ہندوستان سے غداری نہیں کر سکتا۔"

اسی دوران ریاستی اسمبلی میں ایک اور ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا۔ اسمبلی کے اسپیکر ولی محمد یتو بدستور ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے وفادار تھے اور انہوں نے نیشنل کانفرنس کی شکایت پر ۱۲۔ ممبران اسمبلی کی دل بدلی کا معاملہ دل بدلی قانون کے تحت ہائی کورٹ کو سماعت کے لئے بھیج دیا۔ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے ۳۰ جولائی ۸۴ء کو اپنے فیصلے میں کہا کہ" بارہ اسمبلی ممبروں کو دل بدلی قانون کے تحت اسمبلی کے رکنیت سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔" اسپیکر نے ہائی کورٹ کے فیصلہ کی پروا کئے بغیر ان ۱۲ ممبروں کو ایوان کی رکنیت سے خارج کر کے اعلان کیا کہ ۱۲۔ نشستیں خالی ہیں۔ ہائی کورٹ کا فیصلہ دل بدلی قانون کی صحیح تشریح پر مبنی تھا یا نہیں، اسپیکر کا ۱۲۔ ممبران اسمبلی کی رکنیت ختم کرنا قانون کے دائرے میں تھا یا نہیں یہ بحث طلب سوال ہے لیکن جہاں تک عام شہری دل بدلی قانون کو سمجھتا ہے اس کے مطابق ان ۱۲۔ ممبروں نے دل بدلی کی تھی اور دل بدلی ایکٹ کے تحت وہ رکنیت کے اہل نہیں تھے۔ ۳۱۔ جولائی کو قانون ساز اسمبلی کا خصوصی اجلاس اسپیکر کے خلاف عدم اعتماد اور غلام محمد شاہ سرکار میں اعتماد کی تحریک پر غور کرنے کے لئے بلایا گیا۔ اسمبلی ایوان میں ایک نیا مہابھارت کھیلا گیا۔ ایوان کے لیڈر محمد علی نا[illegible] سے درخواست کی کہ اسپیکر کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کو فوری طور سے زیر غور لایا جائے

www.taemeernews.com

لیکن اسپیکر نے اس درخواست کو رد کر دیا۔ غلام محمد شاہ جلال میں آ گئے اور تمام جمہوری آداب و روایات کی دھجیاں اڑا کر PHYSICALLY اسپیکر ولی محمد یتو کو کرسی سے ہٹا دیا اور کانگریس کے نگیل سنگھ کو اسپیکر کی کرسی پر بٹھا دیا گیا اس ایوان میں اسپیکر کو زور زبردستی سے ہٹانے کا یہ دوسرا واقعہ تھا۔ پہلا واقعہ شیخ محمد عبداللہ کے زمانے میں ہوا جب مرزا محمد افضل بیگ کو نیشنل کانفرنس سے ہٹایا گیا۔ اس وقت کے اسپیکر ملک محی الدین بھی مرزا محمد افضل بیگ کے وفادار تھے۔ ان کو ہٹانے کے لئے غنڈہ گردی کی گئی۔ انھیں کرسی سے زبردستی ہٹایا گیا اور جموں کے بابو پرمانند کو اسپیکر بنایا گیا۔ تاریخ پھر دہرائی گئی اور اس بار بھی غلام محمد شاہ نے آزمائے ہوئے ہتھکنڈے استعمال کر کے ولی محمد یتو کو اسپیکر کے عہدے سے ہٹا دیا۔ گورنر جگموہن نے اپنی کتاب میں اس غنڈہ گردی اور غیر جمہوری طور طریقوں کا سرا سر ذکر ہی نہیں کیا ہے بلکہ یہ سرٹیفکیٹ دیا ہے کہ ولی محمد یتو کو جمہوری ڈھنگ سے ہٹایا گیا۔ بعد میں اسمبلی نے باضابطہ طور پر کانگرس کے پنڈت منگت رام شرما کو اسپیکر منتخب کیا اور انہوں نے گرائے گئے اسپیکر کے ۱۲۔ ممبروں کو اسمبلی کی رکنیت سے خارج کرنے کے فیصلے کو رد کرنے کا آرڈر جاری کیا۔ غلام محمد شاہ کی سرکار میں اعتماد کی تحریک بھی منظور ہوئی اور اس طرح ایک غیر جمہوری عمل پر جمہوریت کی مہر چسپاں کی گئی۔

غلام محمد شاہ وزیر اعلا تو بن گئے لیکن عام تاثر یہ تھا کہ وہ زیادہ مدت تک اقتدار سنبھالے رکھنے میں کامیاب نہیں ہوں گے اس لئے ہر ایک نے چاہے وہ ممبر اسمبلی تھا یا غلام محمد شاہ کی انگلی پکڑے کوئی موقع شناس نوجوان، دونوں ہاتھوں سے دولت لوٹنے کے دھندے میں ملوث ہو گیا۔ انجنیروں کے تبادلے، سرکاری افسروں کو منافع بخش عہدوں پر تعینات کرانے اور ٹھیکے دلانے کے لئے دلالوں نے خوب پیسہ کمایا۔ حکومت ہند نے تجوریوں کے منہ کھول دئے تھے اور ہر کوئی بہتی گنگا میں غسل کر رہا تھا۔ غلام محمد شاہ کے وزیر اعلا بنتے ہی وادی میں چند ایسے بے ضمیر اور جاہل لوگوں نے اقتدار کے گھوڑے پر سواری شروع کی جن کا نہ تو سیاست سے کوئی تعلق تھا اور نہ ہی غلام محمد شاہ سے کوئی رشتے داری محض ذاتی مفاد سامنے تھا جس نے ان لوگوں کے اصلی چہروں کو مسخ کر دیا۔

غلام محمد شاہ پر مرکزی سرکار نے اعتماد کر کے ریاست میں مسلم اور ہندو فرقہ پرستی کے رجحانات کو تقویت پہنچانے میں مدد دی اور غلام محمد شاہ ایک شاطر سیاست داں کی طرح وادی میں مسلم کٹر پسندی کی آبیاری کرتے رہے۔ جموں سکرٹیریٹ میں انہوں نے شوسینا کے کہنے پر مندر بنانے کی اجازت دے دی اور خود پوجا میں شریک ہو گئے جب کہ مسجد کی تعمیر کے لئے بھی سکریٹریٹ میں منصوبہ بن گیا۔ ٹکراؤ ہوا اور جموں میں کئی روز تک ہنگامہ برپا رہا۔ کشمیر میں بھی

www.taemeernews.com

وہ منصوبہ بند طریقے سے .جماعت اسلامی اور کٹر محاذی کارکنوں کے ذریعے فرقہ پرستی اور کٹر پسندی کے سیل قائم کرانے کی کوشش کرتے رہے۔ اس دوران پارلیمنٹ کے چناؤ ہوئے اور غلام محمد شاہ کے ارد گرد کے چاپلوسوں نے ان کو یہ یقین دلایا کہ ان کا بیٹا مظفر شاہ عوامی سطح پر ا
ہے کہ وہ سرینگر سے پارلیمانی حلقہ سے لوک سبھا کے لئے چناؤ آسانی سے جیت سکتا ہے۔ مظفر شاہ جیسا کہ کشمیری سیاست کی روایت ہے ایک کامیاب تاجر اور ساتھ ہی اپنے والد کا مشیر بھی تھا۔ اپنے ماموں ڈاکٹر فاروق عبداللہ کا زبردست دشمن اور چاپلوسوں کے گھیرے میں قید ایک ابھرتا ستارہ۔ غلام محمد شاہ کو بھی یقین تھا کہ ان کا بیٹا ممبر پارلیمنٹ بن سکتا ہے۔ لیکن وہ یہ حقیقت نظر انداز کر گئے کہ انہوں نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو سازش کے تحت گرا کر شیخ محمد عبداللہ کے خاندان سے غداری کی ہے اور کشمیری مسلمان اس غداری کو کبھی معاف کرنے پر تیار نہیں تھے۔ طاقت کے نشے میں بدمست غلام محمد شاہ نے اپنے بیٹے کو کامیاب کرانے کے لئے سرکاری مشینری کو استعمال کرنے کا ننگا مظاہرہ کیا۔ عوامی مجلس عمل کے سربراہ مولوی محمد فاروق جو ایسے حالات میں ہمیشہ کاروباری سیاست داں بنا کرتے تھے ان کی حمایت بھی حاصل ہو گئی اور غلام محمد شاہ کے ایک بیان کے مطابق انہوں نے مولوی فاروق کو اس کام کے لئے ایک لاکھ روپے دئے۔ غلام محمد شاہ اور ان کی بیگم خالدہ شاہ نے محکمہ مال، محکمہ پولس اور اعلا سرکاری افسروں کو چناؤ میں گڑ بڑ کرانے کے لئے خاص طور سے حکم دیا لیکن عوامی خوف سے سرکاری مشینری نے گڑ بڑ کرنے سے انکار کر دیا۔ دونوں کی گنتی کے روز بھی خالدہ شاہ نے ووٹ شماری کے ہال میں گڑبڑ کرانے کے احکامات دئے لیکن سینٹرل ریزرو پولس اس میں رکاوٹ بن گئی۔ خالدہ شاہ کے ایک زرخرید کارکن نے سی آر پی کو خوش کرنے کے لئے ووٹ شماری کے ہال میں .بھارت ماتا زندہ باد اور پاکستان مردہ باد کے نعرے بھی بلند کئے لیکن سی آر پی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اور مظفر شاہ بری طرح چناؤ ہار گئے۔

چناؤ ہارنے کے ساتھ ہی غلام محمد شاہ اور پردیش کانگریس کے درمیان تعلقات بگڑنے شروع ہو گئے اور غلام محمد شاہ کی کانگرس دشمنی کی رگ پھر پھڑک اٹھی لیکن اس بار غلام محمد شاہ نے ننگے ہو کر فرقہ پرستی کا ناچ شروع کیا۔ جموں میں شو سینا نے مسلمانوں کے خلاف اور کشمیر میں غلام محمد شاہ کے اشارے پر کشمیری پنڈتوں کے خلاف منظم تحریک شروع ہوئی۔ کشمیر کے ضلع اننت ناگ میں کئی تاریخی مندروں کو توڑا گیا۔ غلام محمد شاہ کے اس تانڈو ناچ کا میں چشم دید گواہ ہوں۔ انہوں نے ان سنگین حالات پر قابو پانے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ان کی حکومت چند دنوں کی مہمان ہے اور وہ اقتدار چھن جانے کا انتقام لینے کے لئے جموں اور کشمیر کو فرقہ وارانہ بنیادوں پر مکمل طور سے تقسیم کرنے کی ہر

www.taemeernews.com

ممکن کوشش کر رہے تھے۔ پردیش کانگرس کے وہ لیڈر جنھوں نے غلام محمد شاہ کو اقتدار میں لا کر مرکز سے سیاسی خودکشی کرائی تھی مکمل طور سے خاموش تھے حالاں کہ وہ اس نئی صورت حال کے خطرناک نتائج سے بخوبی واقف تھے۔ جہاز جب ڈوبنے لگتا ہے تو چوہے سب سے پہلے بھاگ جاتے ہیں۔ یہی حشر غلام محمد شاہ کا بھی ہوا۔ جن نوجوانوں نے جموں کے صحافی وید بھسین کی قیادت میں غلام محمد شاہ کو ہیرو بنایا تھا وہ ایک ایک کر کے ان سے علاحدہ ہو گئے۔ اور سول سکرٹیریٹ میں وزیر اعلا غلام محمد شاہ اور بھسین کے درمیان کابینہ کے دوسرے ممبروں کے موجودگی میں جو گالم گلوچ ہوئی وہ اس زمانے کی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ مجھے خود وزیر اعلا غلام محمد شاہ نے کہا کہ۔ I told Ved Bhasin, you are a bastard and he in return abused me in front of my cabinet colleagues. What else I could do. I had to throw him out of my room. یہ میری پہلی اور آخری ملاقات کشمیر کے وزیر اعلا غلام محمد شاہ کے ساتھ تھی۔ کشمیر میں فرقہ پرستی اور کٹرپنتھی کے بیج غلام محمد شاہ نے ایک منصوبے کے تحت بوئے اور آج اسی کٹرپنتھی کی فصل دہشت گرد کاٹ رہے ہیں۔ غلام محمد شاہ نہ تو ہندوستان نواز تھا اور نہ ہی اسے سیکولر سیاست سے کوئی نظریاتی وابستگی تھی۔ وہ کٹر پنتھی اور فرقہ پرستی کا ایک ایسا زہریلا ناگ تھا جو صرف دودھ پینے کے لئے کانگریس پر سو برس پہلے سے عاشق ہونے کا کھوکھلا دعوا کر رہا تھا۔

www.taemeernews.com

-

www.taemeernews.com

ریاست جموں و کشمیر کا الحاق ہندوستان کے ساتھ طے ہوا ہے نہ کہ حکومت ہند کے ساتھ۔ الحاق کی دستاویز پر مہاراجہ ہری سنگھ اور حکومت ہند کے دستخط ہیں۔ لیکن یہ تو محض قانونی بندش تھی۔ سیاسی الحاق تو ہندوستان کے ساتھ ہوا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ کشمیری سیاست دانوں نے لوگوں کو اس دھوکے میں رکھا کہ الحاق حکومت ہند کے ساتھ ہوا ہے اس لئے مرکزی سرکار کی ہر غلطی کے لئے ہندوستان کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ یہ سوچ آج بھی جاری ہے۔ حکومت ہند نے بھی ہمیشہ اپنی غیر دانشمندانہ پالیسیوں سے یہ تاثر دیا ہے کہ ہندوستان کا دوسرا روپ حکومت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جب کشمیری سیاست دانوں نے اپنی اغراض کے لئے عوام کو گمراہ کرنا چاہا انہوں نے ہندوستان کا نام لے کر گمراہ کیا۔ غلطیاں حکومت نے کیں اور خمیازہ پورے ملک کو بھگتنا پڑا۔ حالاں کہ ہندوستانی عوام نے کسی بھی مرحلے پر ریاستی مسلمانوں کے تشخص اور انفرادیت پر حملہ نہیں کیا۔ شیخ محمد عبداللہ ۱۹۵۳ء میں گرفتار ہوئے تو ہندوستان نے احتجاج کیا۔ جے پرکاش نارائن سے مرد لاسا رابائی تک ہر ایک نے شیخ صاحب کی رہائی کے لئے تحریک چلائی۔ ۱۹۷۷ء میں شیخ محمد عبداللہ کو پھر ہٹایا گیا تو ہندوستان کی تمام سیکولر اپوزیشن پارٹیوں نے احتجاج کیا۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی سرکار کو گرا کر غلام محمد شاہ کو وزیر اعلا بنایا گیا تو کانگرس کے اندر باضمیر لوگوں کے ساتھ دوسری سیکولر اپوزیشن پارٹیوں نے طوفان برپا کیا۔ ۱۹۴۷ء میں الحاق کے بعد سے آج تک کوئی مثال نہیں ملتی کہ جس سے یہ ثابت ہو کہ ہندوستانی عوام نے کشمیری عوام کے خلاف تحریک چلائی ہو۔ لیکن نیشنل کانفرنس کے لیڈروں نے حکومت ہند کو نشانہ بنانے کے بجائے ہمیشہ ہندوستان کو ہی اپنی نفرت کا نشانہ بنایا۔ کانگرس بھی اس الزام سے بری نہیں ہے کہ اس نے بھی ہمیشہ مرکزی سرکار کے ایجنٹ کے طور پر کام کیا۔ اگر کسی نے مرکزی سرکار کی پالیسیوں پر تنقید کی تو کانگریس نے اس تنقید کو اینٹی نیشنل قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ نیشنل کانفرنس ہر اسمبلی چناؤ میں مسلمانوں کی نمائندہ جماعت کے طور پر ابھری اور کانگرس ایک ہندو جماعت کے طور پر ہندوؤں کی نمائندگی کرتی رہی۔ ۱۹۸۳ء کے اسمبلی چناؤ میں جب نیشنل کانفرنس مسلم علاقوں میں طوفان کی طرح چھا گئی تو جموں کے علاقوں میں کانگریس نے ہندو مفاد کا لبادہ اوڑھ کر ہندو اکثریت کو اپنا ہمنوا بنالیا اور بی جے پی کو کنارے لگا دیا۔ غلام محمد شاہ نے اپنے دور اقتدار میں اس صورت حال کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان ٹکراؤ کا ماحول پیدا کیا۔

www.taemeernews.com

شاہ دور کا زوال　　باب ۲۳

غلام محمد شاہ کو وزیر اعلا بنا کر کانگریس جو مقصد حاصل کرنا چاہتی تھی اس میں اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ کانگریس نے شیخ خاندان میں پھوٹ ڈال کر اور ان کی بیٹی بیگم خالدہ کو سامنے لا کر اس خاندان کے اثر و رسوخ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ غلام محمد شاہ کی سیاسی لاش کو کندھے پر اٹھا کر کانگریس نے اپنے لئے زمین تلاش کرنے کا پلان بنایا تھا لیکن ان دونوں محاذوں پر کانگریس نہ صرف بری طرح ناکام ہوگئی بلکہ غلام محمد شاہ نے نہایت چالاکی کے ساتھ کانگریس کی سیاسی جڑیں کھوکھلی کر دیں اور فرقہ وارانہ منافرت پھیلا کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دیوار کھڑی کر دی۔ غلام محمد شاہ کی انتشار برپا کرنے والی پالیسیوں کا ہی نتیجہ تھا کہ کشمیر کے ضلع اننت ناگ میں فرقہ وارانہ فساد برپا ہوا اور کشمیری پنڈتوں کی جائیدادوں کو تباہ کر دیا گیا۔ جموں میں بھی شو سینا نے مسلمان مخالف سرگرمیاں کیں ۔ جماعت اسلامی جو شیخ محمد عبداللہ کے زمانے میں واقعی کمزور ہوگئی تھی غلام محمد شاہ کے زمانے میں ایک بار پھر تقویت حاصل کرنے لگی اور سرحد پار سے سرگرم مداخلت اسی زمانے میں شروع ہوئی۔ پولس، محکمہ مالی اور محکمہ تعلیم میں اسی زمانے میں غلام محمد شاہ کے سرگرم تعاون سے جماعت اسلامی کو دراندازی کرنے کا موقع ملا۔ مرکزی سرکار اس صورت حال سے کافی خوفزدہ ہو رہی تھی اور اس نے ایک بار پھر ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے ساتھ معاشقہ شروع کیا۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ بھی اقتدار سے محروم ہو کر آوارہ گردی سے تنگ آچکے تھے اور اقتدار میں واپس آنے کے لئے بے چین تھے۔ حالاں کہ انہیں کشمیری عوام کی بھرپور حمایت حاصل تھی اور وہ اسمبلی چناؤ میں بغیر کسی بیرونی بیساکھی کے اکثریت حاصل کر سکتے تھے۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ اگر وہ اپنے بل پر اقتدار میں آئے تو مرکزی سرکار ان کی سرکار کو پھر گرا دے گی۔ وہ اسی لئے کانگریس کی حمایت اور اس کے اشتراک سے اقتدار میں آنے کی تگ و دو کر رہے تھے۔ حالاں کہ وہ جانتے تھے کہ کشمیری مسلمانوں میں کانگریس کے خلاف شدید نفرت پائی جاتی ہے کیونکہ ان کے والد کے زمانے سے ہی کانگریس کو مسلمان دشمن کے طور پر کشمیری مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جارہا تھا۔

ریاست کا نظم و نسق مکمل طور سے ٹوٹ چکا تھا۔ غلام محمد شاہ نے ہندوستان نوازی کا لباس

www.taemeernews.com

اتارکر براہ راست پاکستان نوازی کا لبادہ اوڑھ لیا تھا اور وہ کھلم کھلا فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہندوستان کے خلاف زہریلا پروپگنڈہ کر رہے تھے۔ غلام محمد شاہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ مرکزی سرکار ان کو ہٹانے کی جرائت نہیں کرے گی اس لئے وہ خود اعتمادی کے ساتھ ہر ایک کو چیلینج کر رہے تھے۔ جس رات گورنر نے شاہ سرکار کو ڈسمس کیا اسی شام کو ایک ہوٹل میں غلام محمد شاہ کے مشیر خاص اور ان کے بیٹے مظفر شاہ سے میں نے کہا" شاہ سرکار کو ڈسمس کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔" لیکن انہوں نے خود اعتمادی کے ساتھ دعوا کیا کہ" مرکزی سرکار شاہ صاحب کو ڈسمس کرنے کا خطرہ مول نہیں لے گی۔" شاہ صاحب واقعی اس رات بحیثیت وزیر اعلا خواب گاہ گئے اور دوسری صبح جب اٹھے تو تخت سے نیچے گر چکے تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ بابو جگ جیون رام کانگریس کے کارگذار صدر تھے ان میں بھی زبردست خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ کمیونسٹوں کے ساتھ کانگریس کے بڑھتے تعلقات پر ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے انہوں نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ

I AM NOT A SLEEPING PRESIDENT

اور واقعی دوسرے روز جب وہ نیند سے بیدار ہوئے تو صدر کے عہدے سے ہٹائے جا چکے تھے۔ یہی حال غلام محمد شاہ کا بھی تھا۔ انھیں اس بات کی جانکاری نہیں تھی کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ ایک بار پھر مرکزی کانگریس کے قریب آ چکے ہیں اور مرکزی لیڈرشپ نے مقامی لیڈرشپ کو فاروق کے کہنے پر نظر انداز کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

اس صبح جموں سے سرینگر کے لئے جب میں ہوائی جہاز کے ذریعے روانہ ہوا تو اس جہاز میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ بھی سفر کر رہے تھے۔ ڈھیر ساری باتیں ہوئیں اور انہوں نے اعتماد میں لے کر یہ انکشاف کیا کہ" نیشنل کانفرنس اور کانگرس کے درمیان نئے تعلقات میں جو بھی حائل ہوگا ہٹایا جائے گا اور انہوں نے خصوصی طور سے مفتی محمد سعید کو ریاستی سیاست سے ہٹائے جانے کے فیصلے کا ذکر کیا۔ فاروق عبداللہ کے سرینگر پہنچتے ہی غلام محمد شاہ نے ایک اور داؤ کھیلا۔ انہوں نے اپنے ممبران اسمبلی کی حمایت کا ڈاکٹر فاروق کو یقین دلایا اور ان پر دباؤ ڈالا کہ وہ حکومت سنبھالنے کے لئے میدان میں آجائیں۔ ڈاکٹر فاروق کے ساتھ ثالثوں نے ملاقاتیں بھی کیں غلام محمد شاہ کی موقع پرستی کو مکمل طور سے بے نقاب کرنے کے بعد ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے غلام محمد شاہ کی پیش کش کو ٹھکرا دیا اور عوامی منڈیٹ سے اقتدار حاصل کرنے کا اعلان کیا۔ کانگریسی لیڈر اب بھی اس کوشش میں تھے کہ وہ پھسل جائیں اور غلام محمد شاہ کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس جائیں لیکن فاروق عبداللہ نے اشتعال انگیزی کے باوجود مثبت رول کیا۔ شاہ سرکار کے ڈسمس کئے جانے پر وادی میں کسی مریل سے خارش زدہ کتے نے بھی احتجاج نہیں کیا۔ ان کے اپنے ممبر اسمبلی بھی خاموش رہے۔ جن عناصر نے فاروق عبداللہ کے ممبران اسمبلی کو دل بدل

www.taemeernews.com

کرنے پر آمادہ کیا تھا وہ بھی سیاسی میدان سے ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ ٹھاکر دیوی داس جنہوں نے مرکز کے ساتھ پہلے ہی پائپ لائن جوڑ رکھی تھی وہ دبلی بھاگ گئے اور اس طرح غلام محمد شاہ جو مسلسل کرفیو اور بندوقوں کی چھاؤں میں وزیر اعلا بنے تھے کانگریس کی بیساکھیوں کے کھسکنے سے دھڑام سے گر پڑے۔

ڈاکٹر فاروق کا کانگریس کے ساتھ نیا نیا عشق تھا اور وہ اس عشق میں دیوانوں کی طرح مبتلا ہو کر کسی بھی طرح سے کانگریس کے ساتھ مفاہمت کرنے کے لئے بے تاب نظر آرہے تھے۔ مفتی محمد سعید کو مرکز میں وزیر سیاحت مقرر کیا گیا اور اس طرح فاروق کے راستے کا ایک بڑا پتھر ہٹ گیا لیکن فاروق عبداللہ یہ بات نظر انداز کر گئے کہ کانگریس کے ساتھ مفاہمت کو عوام خاص کر مسلمانوں کی حمایت حاصل نہیں ہوگی۔ خود ان کی پارٹی کے لیڈر اور کارکن بھی اس مفاہمت کے لئے تیار نہیں تھے۔ میں جو کانگریس کے ساتھ اس کا ممبر بنے بغیر وابستہ تھا محسوس کر رہا تھا کہ کانگریس کے ساتھ مفاہمت کر کے فاروق عبداللہ نہ صرف خود سیاسی خودکشی کریں گے بلکہ وہ مسلمانوں سے مکمل طور سے کٹ بھی جائیں گے جو کہ ملکی مفاد کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے کئی بار ڈاکٹر فاروق سے ملاقات کی اور ان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس موقع پر کانگرس کے ساتھ چناؤ مفاہمت بد ترین موقع پرستی ہوگی اور کشمیری مسلمان کسی بھی صورت میں اس کی حمایت نہیں کریں گے۔ میں نے سمجھایا کہ "اگر کانگریس کی حمایت ہی حاصل کرنی ہے تو مفاہمت ضروری نہیں۔ کانگریس کے لئے چند حلقے خالی چھوڑ دو۔ ان حلقوں میں نیشنل کانفرنس کے امیدوار مت کھڑے کرو۔ کانگریس کو اکیلے ہی چناؤ لڑنے کا موقع دو۔ اور وہ اگر جیت جاتے ہیں تو چناؤ کے بعد کانگریس سے مفاہمت کی جا سکتی ہے۔ لیکن فاروق عبداللہ کسی بھی صورت میں اقتدار حاصل کرنے کے لئے بے چین تھے اور وہ مرحوم راجیو گاندھی کے ساتھ کئے گئے وعدوں کو توڑنا نہیں چاہتے تھے۔ میں نے کانگرس کے لیڈروں سے بھی بات کی اور ان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس مفاہمت سے نیشنل کانفرنس ختم ہو جائے گی اور سیاسی خلاء پیدا ہوگا جس کو پاکستان نواز اور کٹر پنتھی عناصر پُر کریں گے۔ نیشنل کانفرنس کشمیری مسلمانوں اور ہندوستان کے درمیان واحد لنک ہے، مفاہمت سے یہ لنک ٹوٹ جائے گا اور پھر ہندوستان کا نام لیوا کوئی بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ خود سید میر قاسم نے بھی یہی کہا تھا کہ FAROOQ NO DOUBT IS A DUFFER BUT HE IS THE ONLY BUFFER. نیشنل کانفرنس اور کانگریس کے درمیان مفاہمت کے اعلان کے ساتھ ہی وادی میں مسلم متحدہ محاذ (M.U.F.) وجود میں آیا اس میں پیپلز کانفرنس کے عبدالغنی لون، جماعت اسلامی، محاذی، پاکستان نواز عناصر اور کٹر پنتھی عناصر شامل ہوئے۔ مسلم متحدہ محاذ نے قرآن کو اپنی علامت بنا کر مسلمانوں کو اپنا ہم نوا

www.taemeernews.com

بنانے کی ہر ممکن کوشش کی اور اس کی تحریک نے طوفان کا رخ اختیار کیا۔ پہلی بار مسلح باڈی گارڈ مسلم متحدہ محاذ کے لیڈروں کے ساتھ گھومنے لگے۔ نیشنل کانفرنس کے لئے جو نوجوان ہر الیکشن میں RIGGING کیا کرتے تھے وہ متحدہ محاذ میں شامل ہو گئے اور اس بار نیشنل کانفرنس کا آزمودہ نعرہ یعنی دفعہ ۳۷۰ کا تحفظ اور کشمیری مسلمانوں کے تشخص کی حفاظت مسلم متحدہ محاذ کا نعرہ بن گیا۔ مسلم متحدہ محاذ کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ایسا لگ رہا تھا کہ نیشنل کانفرنس کو اکثریت حاصل نہیں ہوگی لیکن محاذ کے لیڈروں کا خیال تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ۱۰ حلقوں میں کامیاب ہوسکیں گے چناؤ میں محاذ کے ہر امیدوار نے آئین ہند کی وفاداری کا حلف لیا تھا۔ جماعت اسلامی تو ۱۹۷۱ء میں ہی آئین کی وفاداری کا حلف لے کر اور کانگریس کے سرمایہ سے چناؤ لڑتی رہی تھی لیکن اس نے اپنی پاکستان نوازی ترک نہیں کی تھی۔ محاذ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ کر مرکزی سرکار بھی پریشان ہو رہی تھی اور شاید اسے نیشنل کانفرنس کو کانگریس کے ساتھ مفاہمت کرنے پر مجبور کرنے کی اپنی سنگین غلطی کا احساس ہو رہا تھا لیکن اس وقت حالات بے قابو ہو چکے تھے اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے لئے سیاسی میدان تنگ پڑ گیا تھا۔ مرکزی سرکار اور فاروق عبداللہ نے مسلم متحدہ محاذ کے اکثر امیدواروں کو ناکام بنانے کا منصوبہ بنایا جو کہ ایک خطرناک منصوبہ تھا۔ میں نے بھی نیشنل کانفرنس اور کانگریس کے لیڈروں پر واضح کر دیا کہ محاذ کے تمام امیدواروں کو ناکام بنانے سے کشمیری مسلمان بپھر اٹھے گا اور اس کے نتائج خطرناک ثابت ہوں گے۔ میں اس وقت کے وزیر اعظم مرحوم راجیو گاندھی سے بھی ملا اور ان کو وادی کے حالات اور چناؤ میں RIGGING کے خطرناک نتائج سے آگاہ کیا۔ وہ سنتے رہے لیکن کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس چناؤ میں مرکزی کانگرس کی طرف سے محترمہ نجمہ ہبت اللہ چناؤ کی انچارج تھیں۔ کانگرس کے بڑے بڑے نیتا بھی وادی کا دورہ کر رہے تھے اور کانگریس نیشنل کانفرنس مفاہمت کے فوائد پر گھنٹوں تقریریں کر رہے تھے لیکن اس کا عوامی ذہنوں پر کوئی اثر نہیں پڑ رہا تھا۔ مسلم متحدہ محاذ کی مقبولیت کے باوجود ڈاکٹر فاروق عبداللہ آسانی سے اکثریت حاصل کر سکتے تھے اور محاذ زیادہ سے زیادہ ۱۰ حلقوں میں کامیاب ہو سکتا تھا لیکن فاروق عبداللہ اس کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ پیپلز کانفرنس کے عبدالغنی لون کو کسی بھی صورت میں شکست دینا چاہتے تھے۔ چناؤ ہوئے اور کانگریس، نیشنل کانفرنس نے نہ صرف بدترین غنڈہ گردی برپا کی بلکہ ننگے ہو کر RIGGING کی اور جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ ووٹوں کی گنتی کے وقت پوری کی گئی۔ محاذ کے نوجوان کارکنوں کو ووٹ شماری کے ہالوں سے باہر نکال دیا گیا۔ ان پر تشدد کیا گیا اور جواب بھی اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے ان پر پولس تھانوں میں بدترین ظلم کیا گیا۔ ایک سابق وزیر اور فاروق عبداللہ کے نزدیکی رشتہ دار محی الدین شاہ جو کہ نیشنل کانفرنس کے امیدوار تھے انہوں نے محاذ کے

www.taemeernews.com

الیکشن ایجنٹوں پر پولس تھانوں کے اندر خود تشدد کیا۔ شیخ حمید جو اس چناؤ کے بعد ایک زبردست دہشت گرد بنا گذشتہ برس ایک جھڑپ میں ہلاک ہوا اس کی چھاتی پر محی الدین جوتوں سمیت کھڑے ہو گئے اور دیر تک اس کو مارتے رہے۔ مسلم متحدہ محاذ کے کئی ایسے امیدواروں کی شکست کشمیری مسلمانوں کے لئے SHOCK تھا جو واقعی چناؤ عوامی حمایت سے جیت چکے تھے لیکن ہاتھ کی صفائی نے انھیں ناکام کیا تھا۔ جمہوری نظام پر عوام کا اعتماد مکمل طور سے اٹھ گیا اور کانگرس نیشنل کانفرنس مفاہمت نے جمہوریت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ کشمیری مسلمانوں کو فاروق عبداللہ سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اسلامی مجاہدوں کے ناکام بنانے کے لئے "ہندو ہندوستان" کی مشینری کو استعمال کریں گے حالاں کہ ماضی میں خود مسلمانوں نے فاروق مخالف پاکستان نواز امیدواروں کو شکست دینے کے لئے فسطائی حربے تک استعمال کئے تھے ۔ لیکن تب لڑائی نیشنل کانفرنس (جو مرکز کے خلاف احتجاج کی آواز اور مسلمانوں کے تشخص کے تحفظ کی علامت کے طور پر ابھری تھی) اور مرکز کی ایجنٹ کانگریس کے درمیان تھی لیکن اس چناؤ میں لڑائی نیشنل کانفرنس کانگریس متحدہ محاذ اور اسلام نواز قوتوں کے درمیان تھی اور اس میں کشمیری مسلمانوں کو جو شکست دی گئی اسے کشمیریوں نے برداشت نہیں کیا۔

www.taemeernews.com

اسمبلی چناؤ میں نیشنل کانفرنس اور کانگریس کو تکنیکی اعتبار سے کامیابی تو حاصل ہوئی تھی لیکن اخلاقی اور سیاسی اعتبار سے دونوں جماعتوں کا وقار ختم ہو گیا، خاص کر نیشنل کانفرنس جو کہ کشمیری مسلمانوں کے احساسات اور جذبات کی علامت تھی اس کو زبردست دھکا لگا۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ نیشنل کانفرنس نے چناؤ میں گڑبڑ کی۔ چناؤ میں تو نیشنل کانفرنس نے ۱۹۷۷ء اور ۱۹۸۳ء میں بھی زبردست گڑبڑ کی تھی لیکن تب یہ گڑبڑ کشمیری مسلمانوں نے خود کی تھی۔ وہ نیشنل کانفرنس کو اپنا ترجمان سمجھ کر اسے کامیاب بنانے کے لئے ہر حربہ چاہے جمہوری ہو یہ غیر جمہوری استعمال کرتے رہے۔ لیکن کانگریس کے ساتھ مفاہمت کر کے نیشنل کانفرنس نے اپنا مسلم کردار ختم کر دیا اور اس کے لئے نیشنل کانفرنس خود ذمہ دار تھی۔ برسوں سے نیشنل کانفرنس نے کانگرس کو ہندو جماعت قرار دے کر مسلمانوں کو اس سے متنفر کیا تھا اور کشمیری مسلمان یہ سمجھتا تھا کہ کانگرس اس کی انفرادیت اور تشخص کی دشمن ہے۔ مسلم متحدہ محاذ نے کشمیری مسلمانوں کا ترجمان بن کر چناؤ لڑا اور اس چناؤ میں محاذ نے وہی ہتھیار اپنے حریفوں کو شکست دینے کے لئے استعمال کئے جو نیشنل کانفرنس نے کانگرس اور جنتا پارٹی کو شکست دینے کے لئے استعمال کئے تھے۔ اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ مسلم متحدہ محاذ کو مجموعی طور سے کشمیری مسلمانوں کی حمایت حاصل ہوئی لیکن چناؤ اور ووٹوں کی گنتی کے دوران زبردست ہیرا پھیری کی گئی اس نے محاذ کو بری طرح ناکام بنا دیا اور اس ناکامی نے جنم دیا دہشت گردی کو، حالاں کہ پاکستان کافی مدت سے کشمیر میں اپنی سرگرمیوں کے لئے میدان ہموار کر رہا تھا۔ نیشنل کانفرنس نے کانگریس کے خلاف اگر حقیر سیاسی مفادات کے لئے نفرت کے بیج نہ بوئے ہوتے تو شاید پاکستان کو بعد میں فصل کاٹنے کی جرأت نہ ہوتی۔

www.taemeernews.com

نیشنل کانفرنس کانگرس سرکار باب ۲۴

چناؤ لڑنے کے بعد ڈاکٹر فاروق عبداللہ ایک بار پھر وزیر اعلا مقرر ہوئے اور انہوں نے کانگرس نیشنل کانفرنس کی مخلوط وزارت تشکیل دی۔ کانگریس کے امیدواروں کا انتخاب ظاہر ہے کانگرس ہائی کمان نے کیا اور اس میں ایسے امیدواروں کا انتخاب کیا گیا۔ جن کا سیاسی جنم جموں کشمیر کی سیاسی زندگی کے اسقاط حمل کا نتیجہ تھا۔ نہ سیاسی پختگی نہ شعور، نہ نظم نسق چلانے کی صلاحیت۔ بس ایک ہی ڈگری تھی ان سیاسی بنجاروں کے پاس۔ کہ وہ مرکزی کانگریس لیڈروں کے ذاتی وفادار تھے۔ چند ہی کانگریسی وزیر تھے جنہیں انتظامیہ کا تجربہ تھا۔ ڈاکٹر فاروق نے نیشنل کانفرنس سے جن ساتھیوں کا انتخاب کیا ان میں چند ایسے بھی تھے جو نیشنل کانفرنس سے کانگرس مفاہمت کے نظریاتی طور سے مخالف تھے اور وہ بدستور کانگریس کو مسلمانوں کا دشمن سمجھتے تھے لیکن ان میں اخلاقی جرات نہ تھی مخلوط وزارت میں شامل ہونے سے انکار کرنے کی۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے وزیر اعلا بنتے ہی سرینگر کے دوردرشن کیندر سے پہلی Live پریس کانفرنس کی۔ گو ان کے پریس مشیر ست پال ساہنی نے پریس کانفرنس سے قبل مجھ سمیت دوسرے صحافیوں کو سوالات کے بارے میں Brief کر دیا تھا، لیکن جب پریس کانفرنس شروع ہوئی تو ہر ایک بھول گیا کہ اس نے پریس مشیر سے وعدے کئے تھے۔ میں نے یہ سوال پوچھا کہ "چناؤ میں نیشنل کانفرنس کی سیاسی ساکھ نہ صرف داغدار ہوگئی ہے بلکہ اس کے سیاسی جسم پر اتنے زخم لگ گئے ہیں کہ اس کا زندہ رہنا مشکل دکھائی دے رہا ہے۔ آپ کس طرح کی حکمت عملی سے نیشنل کانفرنس کو زندہ کریں گے۔" ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے اس سے انکار نہیں کیا کہ نیشنل کانفرنس چناؤ میں پٹ گئی ہے، البتہ انہوں نے کہا کہ وہ پرانی غلطیوں کو نہیں دہرائیں گے اور عوامی مسائل کی طرف تمام تر توجہ دے کر لوگوں کو پھر ہمنوا بنالیں گے۔ دوسرے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ وہ مرحوم بخشی غلام محمد کی طرح حکمت عملی اپنا کر لوگوں کی ناراضگی دور کریں گے۔ کبھی کبھی ڈاکٹر فاروق عبداللہ بیوقوفوں کی حد تک جرات مندی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس پریس کانفرنس میں انہوں نے نتائج کی پروا کئے بغیر اعلان کیا کہ دربار موو کی بدعت ختم کی جائے گی کیوں کہ اس سے حکومت کو کروڑوں روپے کی بچت ہو گی۔ موروثی

www.taemeernews.com

حکومت کے دوران سردیوں میں دربار چھ ماہ کے لئے جموں چلا جاتا تھا اور گرمیوں میں پھر سرینگر منتقل ہو جاتا تھا۔ گو یہ فیصلہ مہاراجہ نے اپنے ذاتی آرام اور سکون کے لئے کیا تھا لیکن اس سے کشمیر اور جموں کے لوگوں کے درمیان دیواریں ٹوٹ گئی تھیں۔ ہزاروں کشمیری ملازم اور ان کے کنبے چھ ماہ کے لئے جموں چلے جاتے اور اسی طرح موسم گرما میں ہزاروں جموں کے ملازم سرینگر چلے آتے۔ چھ ماہ جموں کے تاجر پیشہ طبقے کو مالی فائدہ ملتا اور چھ ماہ کشمیری تاجروں کو۔ برسوں سے جاری یہ نظام آپسی کشمکش اور ٹکراؤ کے باوجود قائم تھا اور جب اچانک فاروق عبداللہ نے دربار موبند کرنے کا اعلان کیا تو جموں میں اس کے خلاف زبردست ایجی ٹیشن شروع ہوئی۔ ممکن ہے کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے دیانت داری اور خلوص کے ساتھ اس فیصلے کا اعلان کیا تھا لیکن اس سے جموں میں غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور کانگریسیوں سمیت دوسری سیاسی پارٹیوں نے اس کو کھلم کھلا علاحدگی پسندی قرار دیا۔ مرکزی سرکار کی مداخلت سے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو اپنا یہ فیصلہ واپس لینا پڑا اور اس طرح حکومت سنبھالتے ہی فاروق عبداللہ کا پہلا اہم فیصلہ ردی کی ٹوکری کی نذر ہو گیا۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے ذہن پر کانگریس کے ساتھ مفاہمت کے منفی نتائج کا بوجھ تو تھا ہی بیورو کریسی پر بھی ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ دو دھاری تلوار تھی۔ ایک طرف کانگرس کے تقاضے تھے تو دوسری طرف نیشنل کانفرنس کی گرتی ہوئی ساکھ کا مسئلہ تھا۔ ایک طرف مسلم متحدہ محاذ جس پر جماعت اسلامی کا مکمل قبضہ ہو گیا تھا اس کی بڑھتی ہوئی سرگرمیاں تھیں تو دوسری طرف ان نوجوانوں پر قابو پانے کا سوال تھا جن پر چناؤ کے دوران پولس تھانوں میں تشدد کیا گیا تھا۔ ایک طرف کانگرس کے اندر وزارتی کرسیوں پر براجمان کانگریسی لیڈروں کے خلاف بڑھتی ہوئی ناراضگی تو دوسری طرف نیشنل کانفرنس وزراء کے خلاف محاذ آرائی اور اس پر طرہ یہ کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ خود بھی پریشان کہ وزیر اعلا کا منصب حاصل کر کے ان پر کس طرح کے فرائض عائد ہیں۔

اس افراتفری کے ماحول میں وادی میں دہشت گردی کے واقعات شروع ہو گئے۔ ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو لال چوک میں کھڑی ایک ماروتی وین میں دھماکہ ہوا اور ایک لیڈی وکیل شدید زخمی ہو گئی اور اس کی ٹانگ کو کاٹا۔ اس کے بعد ۱۳۔ جولائی ۱۹۸۸ء کو سی آر پی کی ایک بس پر فائرنگ کی گئی۔ سی آر پی کے ۲۔ جوانوں سمیت ۱۶ افراد ہلاک ہوئے۔ ۲۰۔ جولائی کو چنار سنیما کے لیڈیز باتھ روم میں بم دھماکہ ہوا اور ۲۹۔ جولائی کو دو مسلمان عورتوں کے چہرے کو تیزاب سے جلا دیا گیا۔ ۲۱۔ اگست کو نیشنل کانفرنس کا رکن محمد یوسف حلوائی کو سرینگر کے صفاکدل علاقے میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ بم دھماکوں، فائرنگ اور ہلاکتوں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا اور حکومت پر فالج گر پڑا۔ کانگرس اور نیشنل کانفرنس میدان سے غائب ہو گئی اور اس دوران بابائے قوم شیخ

www.taemeernews.com

محمد عبداللہ کے خلاف نفرت کی تحریک بھی شروع ہوئی۔ چوراہوں اور دوسرے مقامات پر آویزاں ان کے فوٹو اتار دئے گئے اور ان کی بے حرمتی کی جانے لگی۔ ایک بے نام خوف ہر ایک پر طاری تھا۔ محکمہ پولیس اور خفیہ پولس محکمہ بھی خاموش تھا۔ نہ ریاستی حکومت کوئی فیصلہ کن قدم اٹھا رہی تھی اور نہ حکومت ہند اس طرف توجہ دے رہے تھی۔ ۱۴۔ ستمبر کو سرینگر ہائی کورٹ کے ایک سینئر وکیل ٹیکہ لال ٹپلو کو صبح دس بجے بھرے بازار میں اس وقت گولیوں سے بھون دیا گیا جب وہ عدالت کی طرف جارہے تھے۔ اس سے انکار نہیں کہ ٹیکہ لال ٹپلو کا تعلق بھارتیہ جنتا پارٹی کے ساتھ تھا لیکن وہ مسلمانوں میں کافی مقبول تھے۔ ذہنی طور پر وہ نہ تو فرقہ پرست تھے اور نہ ہی مسلمان دشمن۔ وہ ایک پکے کشمیری تھے۔ ٹیکہ لال ٹپلو کی ہلاکت کشمیری پنڈتوں کے لئے ایک وارننگ تھی کیوں کہ جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ نے اعلان کیا کہ "جو بھی ہندوستان کے ساتھ الحاق کو حتمی قرار دے گا اسے قتل کیا جائے گا۔" اور عام طور سے کشمیری پنڈت پر یہ سب سے بڑا الزام تھا کہ وہ ہندوستان کے وفادار ہیں حالاں کہ یہ عشق یکطرفہ تھا۔ مرکزی سرکار کے لئے چند ہزار کشمیری پنڈتوں کی وفاداری کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ وہ کشمیری پنڈتوں کو For Granted لے رہی تھی کہ انھیں تو ہندوستان زندہ باد کہنا ہی ہے نتیجہ یہ نکلا کہ کشمیری پنڈت قربانی کا بکرا بن گیا۔

اسی دوران ریاستی انتظامیہ میں بھی ہندوستان مخالف عناصر سرگرم ہو گئے۔ کئی برسوں سے جماعت اسلامی کے حمایتی لوگوں کو محکمہ مال، تعلیم اور پولس میں بھرتی کیا جارہا تھا اور وہ انتظامیہ پر چھا گئے تھے انہوں نے سرکاری ملازموں کی اس حد تک چالاکی سے ذہنی دھلائی کی کہ جب پیپلز لیگ کے لیڈر بشیر شاہ کو رام بن میں گرفتار کر کے لایا گیا تو سرینگر کے ڈپٹی کمشنر نے اس کے وارنٹ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اننت ناگ کے ڈپٹی کمشنر نے بھی ایسا ہی رویہ اختیار کیا جب کہ ایڈوکیٹ جنرل نے عدالت میں حکومت کے اس کیس کی پیروی کرنے سے انکار کر دیا۔ ڈپٹی ایڈوکیٹ جنرل نے بھی صاف انکار کر دیا۔ ایڈوکیٹ جنرل اب حکومت ہند کے اعلا قانونی مشیر ہیں اور ڈپٹی ایڈوکیٹ جنرل ریاستی ہائی کورٹ کے معزز جج ہیں۔ ہڑتالوں اور بندوں کا سیزن شروع ہو گیا۔ ہندوستان مخالف پروپگنڈے کو نئی زندگی مل گئی اور جسے دیکھو وہ ہندوستان مخالف بن گیا۔ اس دوران لوک سبھا چناؤ کرائے گئے اور ریاست میں اس چناؤ نے ہندوستان حامی عناصر کی عوامی مقبولیت کی قلعی کھول دی۔ علاحدگی پسند پاکستان نواز عناصر نے چناؤ بائیکاٹ کا اعلان کیا اور پولنگ کے روز ۲۲۔ نومبر کو سول کرفیو نافذ کیا گیا۔ ہر بوتھ کے باہر رنگین ٹی وی سیٹ رکھا گیا اور یہ اعلان ہوا کہ "جو کوئی ووٹ ڈالنے آئے گا اس کو ٹی وی سیٹ انعام میں دیا جائے گا۔" وادی میں بارہمولہ سے پروفیسر سیف الدین سوز اور اننت ناگ

www.taemeernews.com

سے پیارے لال ہنڈو کو نیشنل کانفرنس نے ٹکٹ دیا تھا جب سرینگر میں کوئی امیدوار کاغذات نامزدگی داخل کرنے کے لئے تیار نہ ہوا تو ایک غیر معروف وکیل محمد شفیع بٹ نے نیشنل کانفرنس کے امیدوار کی حیثیت سے کاغذات داخل کئے۔ محمد شفیع بٹ کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دوسرے امیدواروں نے ان کے خلاف کاغذات داخل کرنے کو اپنی توہین سمجھ لیا اور ہندوستان کی جمہوری پارلیمنٹ کے لئے محمد شفیع بٹ بلامقابلہ کامیاب ہو گئے پروفیسر سیف الدین سوز اور پیارے لال ہنڈو بھی کامیاب ہوئے حالاں کہ ان کے مقابلے پر امیدوار کھڑے تھے۔ چند ہی ووٹ ڈالے گئے اور چند ہی ووٹوں سے یہ دونوں عوامی نمائندگی کے لئے لوک سبھا کے لئے منتخب ہو گئے۔ حکومت ہند کی نظر کرم سے محمد شفیع بٹ اور پروفیسر سیف الدین سوز لوک سبھا کے ممبر تو بن گئے لیکن ممبر بنتے ہی بیان دیا کہ ریاست میں بگڑتی ہوئی صورت حال کے لئے مرکز ذمے دار ہے جو کہ جموں کشمیر کو اپنی نو آبادی سمجھتا ہے۔ مرکز نے ۱۹۴۷ء میں کشمیریوں سے کیا گیا وعدہ پورا نہیں کیا۔"

چناؤ نے نیشنل کانفرنس، کانگرس اور ریاستی سرکار تینوں کا بھرم توڑ دیا۔ نیشنل کانفرنس اچھوت بن گئی اور روزنامہ اخبارات میں اشتہارات شائع ہونے لگے کہ "ہمارا نیشنل کانفرنس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

مرکز میں کانگریس چناؤ ہار گئی تھی اور وشوناتھ پرتاپ سنگھ وزیر اعظم بن گئے تھے۔ مفتی محمد سعید کو انہوں نے وزیر داخلہ مقرر کیا۔ وزیر اعلا ڈاکٹر فاروق عبداللہ حسب معمول بیرون ملک چلے گئے تھے اور نظم نسق جو پہلے ہی تن آسانی اور مجرمانہ غفلت کا شکار تھا مکمل طور سے ٹوٹ گیا۔ بے نام تنظیموں کی سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی پر گرفت مضبوط ہو گئی۔ کبھی سنیما ہال کبھی ویڈیو لائبریریاں، کبھی سیلون اور کبھی مے خانے بند کرانے کے احکامات جاری ہوئے تو کبھی مسلمان لڑکیوں اور عورتوں کو برقعہ پہننے کا حکم دیا گیا۔ مقامی اخبارات ان نئے احکامات کو عوام تک پہنچانے کا ذریعہ بن گئے اور یہ اخبارات نئے حاکموں، کے منظور نظر بننے کے لئے افسروں اور سیاسی کارکنوں کے خلاف من گھڑت قصے شائع کرتے رہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی سرکاری ملازم قتل ہوئے جس میں ایک ایمان دار اور نماز گذار پولس افسر بھی شامل ہے۔ ۸۔ دسمبر ۱۹۸۹ء وزیر داخلہ مفتی محمد سعید کی بیٹی ڈاکٹر روبیہ سعید کو جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے کارکنوں نے اغوا کیا۔ اس اغوا کی خبر نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا۔ وادی کی کئی مسلم تنظیموں اور پاکستان کی جماعت اسلامی نے اغوا کی مذمت کی اور اغوا کاروں سے اپیل کی کہ وہ روبیہ سعید کو رہا کر دیں۔ ڈاکٹر سعید کو رہا کرانے کے لئے جموں کے انگریزی اخبار کے مدیر وید بھسین، ان کے نمائندے ظفر معراج اور پیٹریاٹ کے رپورٹر محمد سعید ملک کی خدمات حاصل کی

www.taemeernews.com

گئیں لیکن وہ اس میں ناکام رہ گئے۔ حالاں کہ وہ آخری وقت تک یہ تاثر دیتے رہے کہ وہ روبیہ کو رہا کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لبریشن فرنٹ نے یرغمال کو رہا کرنے کے لئے پانچ گرفتار دہشت گردوں حمید شیخ، شیر خان، جاوید محمد زرگر، محمد کلوال اور محمد الطاف بٹ کو رہا کرنے کی شرط پیش کی۔ دہشت گردوں کے ساتھ بات چیت کرنے کے لئے الہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس بٹ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جسٹس بٹ جموں کشمیر ہائی کورٹ کے بھی جج رہ چکے تھے اور عام طور سے ان کے بارے میں یہ عام رائے تھی کہ وہ سیاسی مصلحتوں کے بجائے قانونی ضابطوں کا احترام کرتے ہیں اور کشمیری مسلمانوں میں ان کے لئے کافی عزت تھی۔ انہوں نے ڈاکٹر گورو کے ذریعے جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور آخر کار پانچ دہشت گردوں کی رہائی کے عوض روبیہ سعید کو رہا کیا گیا۔

یہ وادی میں دہشت گردی کی پہلی نمایاں کامیابی تھی۔ پانچوں رہا کئے گئے دہشت گردوں کو اندرون شہر رہا کیا گیا ہزاروں کشمیریوں نے ان کا استقبال کیا۔ دہشت گردوں نے ہوا میں فائرنگ کر کے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا، اور اس کے ساتھ ہی ہلاکتوں بم دھماکوں سرکاری املاک کو نذر آتش کرنے اور سیکورٹی فورسز پر حملوں میں تیزی آ گئی۔ بنکوں کو لوٹنے کا عمل شروع ہوا۔ سنیما ہال بند ہو گئے۔ شراب کی دوکانوں کو لوٹ کر دیشی شراب کی بوتلیں توڑنے اور ولایتی شراب کی بوتلوں کو محفوظ مقامات تک پہنچانے کی تحریک کا آغاز ہوا۔ حکمراں سول سکرٹیریٹ میں بیٹھے اس صورت حال کا نظارہ کرتے رہے اور کشمیری عوام دہشت گردوں کے رحم کرم پر زندہ رہے۔ پولس نظام ٹوٹ گیا۔ لا اینڈ آرڈر مشینری بھی ٹوٹ گئی حکومت کا نام و نشان بھی مٹ گیا اور عام کشمیری دہشت گردوں کی عدالتوں کے دروازوں پر سجدے کرنے لگے۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ واپس بھی آ گئے لیکن تب جہلم کا پانی کافی بہہ چکا تھا۔ جو کشمیری ینگ عبداللہ زندہ باد کے نعرے بلند کرتے کرتے تھکنے کا نام نہیں لیتے تھے ان کی آنکھوں کا پانی مر گیا اور ڈاکٹر فاروق کے خلاف نفرت کا لاوا بہنے لگا۔ ابتدا میں دہشت گرد تحریک کا کردار خالصتاً اسلامی تھا اور عام کشمیری مسلمان یہی محسوس کر رہا تھا کہ یہ تحریک نظام مصطفےٰ کے قیام کے لئے شروع کی گئی ہے اس لئے انہوں نے کھلے دل سے اس کی حمایت کی۔ لوٹ مار اور قتل و غارت سے شاید وہ خوفزدہ تھے لیکن انہیں یہ یقین دلایا گیا کہ بھارتی فوجوں کو وادی سے نکالنے کے لئے یہ کاروائی نہایت لازمی ہے۔ دریں وہ جماعت اسلامی ایک اور کھیل کھیل رہی تھی حالاں کہ حالات پر کنٹرول جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کا تھا۔ جماعت اسلامی نے کشمیر کو کشمیری پنڈتوں سے پاک کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس پر لبریشن فرنٹ نے عمل کیا حالاں کہ کشمیری پنڈت نہ تو تحریک کی مخالفت کر رہا تھا اور نہ حمایت۔

www.taemeernews.com

مفتی محمد سعید کی بیٹی روبیہ سعید کی رہائی کے بعد برف میں آگ نے پوری وادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ٹھنڈی آگ ایک دم گرم ہو گئی اور اس کے شعلوں نے ریاستی سرکار کو بھسم کر دیا۔ دہشت گرد تنظیموں کو یقین ہو گیا کہ ان کا سکہ رائج ہے اور اس سکہ کو کھوٹا قرار دینے والے فرار ہو گئے ہیں۔ بندوق کی نلکی نمائش نے کشمیریوں کو یہ یقین دلایا کہ جو لڑائی شیخ محمد عبداللہ ۲۲ برس کی سرد گرم جنگ کے بعد بھی جیت نہ سکے وہ لڑائی نوجوان جیت سکتے ہیں۔ دہشت گرد قومی ہیرو بن گئے اور ایکشن پر جانے سے قبل عام کشمیریوں نے ان پر گلپوشی کا سلسلہ شروع کیا۔ کل کے ٹھکرائے ہوئے مجاہدین بن گئے اور لوگ ٹوٹ کر ان سے پیار کرنے لگے۔ مرکزی سرکار کا بھرم بھی ٹوٹ گیا اور خاص کر جب فضائیہ کے جوانوں کو سرراہ ہلاک کیا گیا تو اس کے بعد عام احساس ابھرنے لگا کہ ہندوستان کو کشمیر سے اپنا بستر اگول کرنا پڑے گا۔ کانگریس نیشنل کانفرنس مخلوط وزارت کا وجود ہی ختم ہو گیا۔ امن و قانون کی مشینری پر فالج گر گیا اور سرکاری انتظامیہ میں جماعت اسلامی کے دراندازوں نے پاکستان کے حق میں فضا ساز گار کرنے کے لئے کھلم کھلا سرگرمیاں شروع کر دیں۔ نظام مصطفےٰ قائم کرنے کے لئے جماعت اسلامی نے جو مہم شروع کی وہ خالصتاً فرقہ وارانہ تھی اور اس کی بنیاد نفرت اور تعصب پر رکھی گئی۔ جو نوجوان اس تحریک میں شریک تھے وہ اپنی تاریخ اپنی تہذیب اور اپنی روایات سے ناواقف تھے۔ کچے ذہنوں میں جب نفرت اور تشدد کے بیج بوئے جاتے ہیں، نسلی برتری کا زہر بھر دیا جاتا ہے تو فسطائیت جنم لیتی ہے اور جماعت اسلامی نے اسکا بھرپور فائدہ اٹھا کر کشمیر کی تہذیب اور اس کی روایات کو قتل کرنے کا عمل شروع کیا۔

www.taemeernews.com

جگموہن کی آمد　　باب ۲۵

حالات بے قابو ہو رہے تھے۔ بلا کتوں کا نہ رکنے والا سیلاب بھیانک رخ اختیار کر رہا تھا۔ پولس سڑکوں اور تھانوں سے غائب اور اگر کسی تھانے میں پولس موجود تھی تو خوف و دہشت یا آزادی پسندوں کے ساتھ ہمدردی کی وجہ سے خاموش تھی۔ سرکاری افسر اور ملازم بھی بے خوف ہو کر آزادی پسندوں کے حق میں تحریک چلانے لگے۔ اگر کسی باضمیر، فرض شناس اور دیانتدار افسر نے کاروائی کرنے کا حکم بھی دیا تو کسی نے اس پر عمل نہیں کیا ایک طرف دہشت گردی کا کالا ناگ پھن پھیلائے شرافت انسانیت اور آپسی رشتوں پر ڈنک مار رہا تھا تو دوسری طرف وادی کے اخبارات اس کالے ناگ کو آزادی کا دیو قرار دے کر اس کے زہر کو امرت قرار دے رہے تھے۔ مقامی اخبارات رو کے ساتھ بہہ گئے اور انہوں نے کشمیریوں کو صحیح راستہ دکھانے کے بجائے موت کو گلے سے لگانے کی تحریک دی۔ کشمیر کے اخبارات کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہر دور میں اخبارات حاکم وقت کی دہلیز پر ناک رگڑتے رہے۔ کبھی بھی اخبارات نے لوگوں کو حالات و واقعات کے بارے میں صحیح جانکاری نہیں دی۔ بخشی دور میں وہ ظلم و تشدد، غنڈہ گردی پر پردہ ڈالتے رہے۔ صادق دور میں وہ بخشی دور کے تاریک دور سے پردہ ہٹانے لگے اور قاسم دور میں مفاد پرستی غالب رہی۔ شیخ محمد عبداللہ اخبارات کی پروا نہیں کرتے تھے اور اکثر اوقات ان کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی جارحانہ انداز سے نشان دہی کرتے تھے۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے بھی مقامی پریس سے ٹکر لی اور ایک وقت میں انہوں نے پریس کو صحیح راستے پر لانے کے لئے پریس بل بھی اسمبلی میں پیش کیا تھا لیکن جیسا کہ دستور ہے اس جمہوری ملک کا کہ پریس پر جائز نکتہ چینی کو بھی پریس کی آزادی پر حملہ قرار دیا جاتا ہے اس بل پر بھی طوفان برپا ہوا اور بل کو واپس لے لیا گیا۔ ڈاکٹر فاروق نے بل اسمبلی میں پیش کر کے ایک تاریخی قدم اٹھایا تھا لیکن پریس کی بے ہنگم اور بے لگام آزادی کے متوالوں نے اس تاریخی قدم کو تاریک قرار دیا دہشت گردی برپا ہوتے ہی مقامی پریس نے ان تمام پردوں کو چاک کر دیا جو وہ مختلف دوروں میں اپنے چہرے پر ڈالنے کے عادی ہو چکے تھے۔ ہندوستان اچانک ایک قابض ملک بن گیا۔ ہندوستانی فوج اور سیکورٹی فورسز دشمن بن گئے بلکہ ان دونوں جماعتوں کے خلاف نفرت کی تحریک

www.taemeernews.com

اخبارات نے شروع کی۔ دیانت دار اور مخلص افسروں کو چنگیز خان اور کا مخبر قرار دے کر دہشت گردوں کو اکسایا گیا۔ اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ کئی سرکاری افسر مقامی اخبارات کی قلمی غنڈہ گردی سے دہشت گردوں کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے۔

اسی دوران وزارت سے الگ کانگرسی لیڈروں نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو اینٹی نیشنل قرار دینا شروع کیا اور انہیں جموں کشمیر لبریشن فرنٹ اور پاکستان ایجنٹ کے طور پر پیش کرنے کی تحریک شروع ہو گئی۔ اس وقت محمد شفیع قریشی پردیش کانگرس کمیٹی کے صدر تھے۔ انہوں نے کھلم کھلا فاروق عبداللہ کے خلاف مہم شروع کی اور الزام لگایا کہ فاروق سرکار دہشت گردی پر قابو پانے میں ناکام ہو گئی ہے۔ نیشنل کانفرنس نے پردیش کانگرس صدر پر علاحدگی پسندی کی حمایت کر کے راجیو فاروق ایکارڈ کو سبوتار کرنے کا الزام لگایا۔ کانگرس وزراء غلام رسول کار اور منگت رام شرما نے ایک مشترکہ بیان میں محمد شفیع قریشی اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے جنرل سکریٹری کے این سنگھ کو کشمیر سے ہٹانے کا مطالبہ کیا۔ نیشنل کانفرنس میں جہاں اندرونی رسہ کشی تیز ہو رہی تھی وہیں پارٹی کے کارکن اور لیڈر دہشت گردوں سے خوفزدہ ہو کر اخبارات میں بیان دے کر پارٹی سے علاحدگی کا اعلان کر رہے تھے اور سیاسی افراتفری کے اس ماحول میں مرکز میں وی پی سنگھ سرکار تاریکی میں روشنی کی کرن تلاش کر رہی تھی لیکن تاریکی بہت گہری تھی۔ دہشت گردی کے کالے بادل پوری وادی پر چھا گئے تھے۔ فاروق سرکار کا وجود ہی ختم ہو گیا تھا اور دہشت گردوں نے سول سرکار قائم کر لی تھی۔

جماعت اسلامی نے نفرت اور تعصب کی جو جارحانہ تحریک شروع کی تھی اسے جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کی فوجی قوت حاصل ہوئی تھی اور فرنٹ نے مسجدوں اور مسجدوں کے اماموں کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ جماعت اسلامی کشمیری پنڈتوں کی موجودگی کو آزادی کی تحریک میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھ رہی تھی۔ کشمیری پنڈتوں کو وادی کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی میں اپنا ایک منفرد مقام حاصل تھا۔ وہ تجارتی اور تعلیمی اداروں، بنکوں، سرکاری دفتروں اور دوسرے عوامی رابطہ اداروں میں کلیدی عہدوں پر فائز تھے۔ جماعت اسلامی کشمیری پنڈتوں کو حکومت ہند کا ایجنٹ سمجھتی تھی اور وہ کسی بھی صورت میں ان ایجنٹوں کو وادی سے باہر نکالنا چاہتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دہشت گردی شروع ہوتے ہی کشمیری پنڈتوں کو ہلاک کرنے کا سلسلہ شروع ہوا ہر ہلاکت کے بعد یہی اعلان کیا جاتا تھا کہ مخبر ہلاک ہوا۔

اس پس منظر میں جنتا دل سرکار نے جگموہن کو ریاست کا گورنر مقرر کیا۔ ان کے گورنر مقرر کئے جانے پر مرکزی کانگریس اور نیشنل کانفرنس نے زبردست احتجاج کیا اور وادی میں جگموہن کو مسلمانوں کے قاتل کے طور پر پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی حالاں کہ پہلے

www.taemeernews.com

دور میں گورنر جگموہن نے عوامی بہبود اور ترقی کے ایسے منصوبے تیار کر کے ان کو مکمل کیا کہ کشمیریوں نے جگموہن کو مسیحا قرار دیا۔ اس دور میں جگموہن بغیر کسی سیکورٹی کے وادی کا دورہ کرتے۔ عوامی شکایات کا جائزہ لیتے اور ان شکایات کو دور کرنے کے لئے کاروائی بھی کرتے۔ کرپٹ انتظامیہ ان سے تنگ تو تھا لیکن عوامی سطح پر انھیں مقبولیت حاصل تھی انہوں نے ریاست کے مالی وسائل کو بڑھانے، LOPHOLES کو بند کرنے کے لئے نئے قواعد بنانے اور کرپشن پر بھرپور وار کرنے کے لئے کئی اہم فیصلے کئے۔ حالانکہ اس دور میں بھی اخبارات ان کے خلاف مکروہ پروپگنڈہ مہم چلاتے رہے تھے لیکن اس کا ان کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ دہشت گردی کے شروع ہوتے ہی جب جگموہن نے دوبارہ گورنر کا عہدہ سنبھالا تو ایڈمنسٹریشن ہل کر رہ گیا۔ کرپٹ اور آزادی حامی افسروں اور ملازموں میں خوف پیدا ہوا کہ جگموہن سختی کے ساتھ انتظامیہ کو واپس پٹری پر لا کر دہشت گردی کا کامیاب مقابلہ کریں گے۔ مقامی اخبارات جانتے تھے کہ جگموہن ایک قابل اور دیانت دار ایڈمنسٹریٹر ہیں، وہ ہندوستان مخالف تحریک کو برداشت نہیں کریں گے اور پھر جگموہن جانتے تھے کہ ایسے حالات کا مقابلہ کس طرح کیا جانا چاہئے۔ کانگرس اور نیشنل کانفرنس کے جگ موہن مخالف رویے کو دیکھتے ہوئے دہشت گردوں کو بھی نئی زندگی مل گئی۔ جگموہن کے عہدہ سنبھالنے سے چند روز قبل وزیر اعلا ڈاکٹر فاروق نے ۱۲۔ جنوری کو پولس ہیڈ کوارٹر سرینگر میں اعلا پولس افسروں کی میٹنگ بلائی اور پولس کو حالات پر قابو پانے کے احکامات دئے۔ جگموہن نے ۱۹۔ جنوری کو جموں میں حلف لیا اور ڈاکٹر فاروق کے زبانی احکامات پر ڈائریکٹر جنرل پولس این ایس سکسینہ نے ۱۹۔ اور ۲۰ کی رات میں سی آر پی کی مدد سے وسیع پیمانے پر تلاشیوں اور چھاپے مارنے کا عمل شروع کیا۔ گورنر کو اس اہم فیصلے کی اطلاع نہیں دی گئی۔ البتہ مقامی طور سے سینہ بہ سینہ یہ CANARD پھیلایا گیا کہ مسلم دشمن گورنر جگموہن نے تلاشیوں اور چھاپوں کا حکم دیا ہے۔ نئی دہلی میں کانگریس، نیشنل کانفرنس اور بائیں بازو کی جماعتوں نے پہلے ہی جگموہن کے خلاف ماحول میں نفرت کا زہر گھول دیا تھا اور اس پر بھارتیہ جنتا پارٹی نے جگموہن کی حمایت کر کے کشمیری دہشت گردوں کو گورنر کے خلاف وسیع پیمانے پر ایجی ٹیشن کرنے کی تحریک دی۔

ان تلاشیوں کے خلاف احتجاج کے لئے تیاری پہلے سے ہی تیار کر لی گئی تھیں۔ وادی کی تمام مسجدوں پر لاؤڈ اسپیکر لگا دئے گئے تھے اور ۲۰ کی شام کو لاؤڈ اسپیکر سے مسلمانوں کو سڑکوں پر جمع ہونے کا حکم دیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں مسلمان سڑکوں پر اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ ہم کیا چاہتے ہیں پاکستان زندہ باد۔ ہندوستانی کتوں، واپس جاؤ کے جنگجویانہ نعرے بلند ہوئے۔ ایک بھیانک رات۔ ہر طرف بھیانک آوازیں۔ ہوا میں فائرنگ اور سڑکوں سے پولس اور سیکورٹی فورسز

www.taemeernews.com

غائب۔ اس نئی فضا کو دیکھتے ہوئے کشمیری پنڈتوں پر خوف طاری ہوا۔ اسے مسلمانوں کا ڈر نہیں تھا لیکن وہ دہشت گردوں سے خوفزدہ تھا۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا اور اگر ایک بھی دہشت گرد نے شرارت کی ہوتی تو اس رات کشمیر ایک وسیع شمشان گھاٹ میں تبدیل ہو جاتا۔ حکومتی نظام اس حد تک ٹوٹ چکا تھا کہ جب میں نے مرکزی سکریٹری داخلہ سے ٹیلیفون پر اس نئی صورت حال پر تشویش کا اظہار کیا تو انہوں نے کہا" آپ افواہ پھیلا رہے ہیں۔ کشمیر خاموش ہے۔ کوئی ایجی ٹیشن نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو مجھے معلوم ہوتا۔" ٹیلیفون کا رابطہ ٹوٹ گیا لیکن ۱۰۔منٹ کے بعد ہوم سکریٹری نے واپس ٹیلیفون کیا۔ I AM SORRY. YOR ARE CORRECT. WE ARE TAKING IMMEDIATE STEPS.

ایک طرف وادی میں مسلح بغاوت ایک نیا رخ اختیار کر رہی تھی تو دوسری طرف کانگریس اور نیشنل کانفرنس نتائج کی پروا کئے بغیر جگموہن کو مسلمان دشمن قرار دے کر دہشت گردوں کو غیر شعوری طور پر اکسا رہی تھی۔ ڈاکٹر فاروق نے عوام دوستی کا لبادہ اوڑھنے کے لئے جگموہن نے کے تقرر کے خلاف استعفا دے دیا حالاں کہ اس نئے ڈرامے کا ان کی مسخ شدہ شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ البتہ جگموہن کے خلاف نفرت کی تحریک میں شدت پیدا ہو گئی۔ نیشنل کانفرنس بھی درپردہ اس تحریک کی مدد کرتی رہی۔ گورنر جگموہن نے سری نگر میں کرفیو نافذ کر دیا اور کرفیو پر سختی سے عمل کرانے کے لئے سخت احکامات دیئے۔ فائرنگ بھی ہوئی۔ کئی افراد ہلاک بھی ہو گئے۔ طوفان تھم گیا گو وقتی طور پر۔

سڑک چھاپ تحریکوں نے دم توڑ دیا لیکن ہلاکتوں کا سلسلہ جاری رہا اور ابتدائی ایام میں کشمیری پنڈت گولی کا شکار ہوتا اور گھنٹوں سڑک پر لاش پڑی رہتی۔ کوئی جرات بھی نہیں کرتا لاش اٹھانے کی۔ ان میں ایسے بھی کشمیری پنڈت تھے جن کا سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن ہلاکتوں کا سلسلہ جاری رہا اور ابتدائی ایام میں کشمیری پنڈت نشانہ بنے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی کشمیری پنڈت گولی کا شکار ہوتا اور گھنٹوں سڑک پر لاش پڑی رہتی۔ ان میں سرینگر دوردرشن کے ڈائریکٹر کول بھی شامل ہیں۔ لسہ کول ایک بے ضرر انسان تھے۔ کشمیر اور کشمیریت سے اٹوٹ پیار کرتے تھے۔ کسی سے نفرت کرنا انہوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ قصور صرف اتنا تھا کہ وہ دوردرشن کیندر کے ڈائریکٹر تھے۔ کول کی ہلاکت نے کشمیری پنڈتوں میں ہیجان پیدا کر دیا اور وہ بھاگنے لگے اور ایسے بھاگے کہ بستیوں کی بستیاں خالی ہو گئیں۔ اخبارات نفرت کے ساتھ کشمیری پنڈتوں کا ذکر کرتے ہیں تو مغرور پنڈت کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ عام طور سے یہ پروپگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ جگموہن کی تحریک پر کشمیری پنڈتوں نے ہجرت کی جو کہ ایک بے بنیاد پروپگنڈہ ہے جو دہشت گردوں خاص کر جماعت اسلامی کے کشمیری پنڈت مخالف رجحان پر پردہ ڈالنے کی مذموم حرکت ہے۔ کشمیری پنڈت ہرگز اپنا وطن چھوڑ کر نہیں بھاگتے اگر

www.taemeernews.com

کشمیری مسلمانوں نے ان پر ہو رہے تشدد پر خاموشی اختیار نہ کی ہوتی لیکن اخبارات کی معنی خیز خاموشی کو معاف نہیں کیا جا سکتا حالاں کہ بعد میں ان ہی اخبارات نے مسلمانوں کی ہلاکتوں پر بھی خاموشی اختیار کر لی۔

www.taemeernews.com

رشتے جڑتے بھی ہیں ٹوٹ بھی جاتے ہیں۔ باپ بیٹے کا رشتہ ٹوٹ سکتا ہے۔ بہن بھائی علاحدہ ہو سکتے ہیں۔ شوہر بیوی کا رشتہ ختم ہو سکتا ہے لیکن کئی ایسے بے نام رشتے بھی ہیں جو ٹوٹتے نہیں اور اگر ٹوٹ جائیں تو انسان کا وجود ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ جس مکان میں پیدا ہوئے ہیں اس کی ایک ایک اینٹ، ایک ایک پتھر سے رشتہ جڑ جاتا ہے۔ جس محلہ میں پیدا ہوئے اس کی ہر گلی، ہر نکڑ اور ہر بازار سے رشتہ جڑ جاتا ہے۔ اپنے محلے کی کھلی بدبو دار گندی نالی کی بدبو سے بھی رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ بدبو بھی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ یہ ایسے بے نام رشتے ہیں جو ٹوٹ جائیں تو وجود ہل جاتا ہے اور پھر کشمیری کے لئے ان بے نام رشتوں سے رشتہ ٹوٹ جانا المیہ سے کم نہیں ہے۔ عجیب انسان ہے یہ کشمیری۔ دنیا بھر کی ڈھیر ساری لذیذ سبزیاں کشمیری کے سامنے رکھئے پھر بھی شکوہ کرے گا کہ کاش کشمیر کی سبزی مل جاتی۔ صاف شفاف فلٹر کیا ہوا پانی بلوریں گلاس میں پیش کیجیے پیے گا تو ضرور لیکن ٹھنڈی آہ بھر کر کہے گا کہ کاش کشمیر کے نلکے کا پانی پلایا ہوتا۔

حقیقت میں کشمیر ایسا سماجی جانور ہے، جو کشمیر کے جنگل میں ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ کشمیری کو کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں رکھئے، زندگی کی ہر ضرورت اس کی پوری کیجیئے، عیاشی کا سامان بھی کیجیئے لیکن پھر بھی شکایت کرے گا کہ کشمیر کی کھلی فضا میں چناروں کے سائے تلے کھلے آسمان کے نیچے زندگی گذارنے میں جو لطف ہے وہ فائیو اسٹار ہوٹل میں کہاں۔ عجیب کردار ہے کشمیری کا کہ لاکھ بار اپنوں سے پٹ بھی جائے تب بھی کہے گا اپنوں سے ہی تو پٹا ہوں، غیروں سے تو نہیں پٹا۔ اور یہی حال آج ان لاکھوں کشمیری پنڈتوں کا ہے جو خوف و دہشت کی وجہ سے کشمیر سے بھاگ گئے، جموں اور دہلی کے بازاروں میں ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں کاش مجھے اپنا کشمیر واپس مل جائے۔ کاش بے نام رشتے نہ ٹوٹے ہوتے۔ کاش یہ رشتے پھر جڑ جائیں۔

www.taemeernews.com

کشمیری پنڈتوں کی ہجرت باب ۲۶

وادی سے کشمیری پنڈتوں کی دوسری ہجرت کو جماعت اسلامی کی گماشتی سازش نے کامیاب بنا دیا۔ پہلی بار کشمیری پنڈت نے پٹھان دور میں ہجرت کی تھی اور آج جو افغان دہشت گرد کشمیری کی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں یہ ان ہی پٹھانوں کی نسل ہے جنہوں نے کشمیریوں کا قتل عام کیا تھا۔ جماعت اسلامی نے ۱۹۸۹ء میں جب شورش شروع ہوئی، کشمیری پنڈتوں کو کیوں اپنا نشانہ بنایا؟ یہ ایک غور طلب سوال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کشمیری پنڈتوں کے خلاف نفرت کی تحریک بہت پہلے شروع ہو چکی تھی، البتہ یہ تحریک منظم نہیں تھی۔ نکتہ چینی کی جاتی تھی کہ کشمیری پنڈت سرکاری نوکریوں پر قابض ہیں۔ حکومت ہند کے دفاتر انکم ٹیکس ٹیلی کمیونیکیشن، بنکوں، ٹیلی ویژن صحافت اور ریڈیو پر بھی کشمیری پنڈت چھا گئے ہیں جب کہ آبادی کے لحاظ سے کشمیری پنڈت ایک مختصر سی اقلیت ہے۔ بحث طلب سوال یہ نہیں ہے کہ کشمیری پنڈت کیوں ان اداروں میں کامیاب ہو گئے، کیوں کشمیری پنڈتوں میں باصلاحیت انجینئر، ڈاکٹر، فنکار اور استاد پیدا ہوئے۔ یہ تو ان کی ذہنی پرورش اور صلاحیت کا نتیجہ تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کشمیری پنڈت کو کیوں نشانہ بنایا گیا۔ سیاسی طور پر بھی کشمیری پنڈت کسی بھی صورت میں سیاسی زندگی پر حاوی نہیں تھا۔ اسمبلی میں ایک یا دو کشمیری پنڈتوں کی موجودگی ۷۵۔ ممبری ایوان کے فیصلوں پر اثر انداز بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ کابینہ میں بھی زیادہ سے زیادہ ایک کشمیری پنڈت کو نمائندگی ملتی۔ اعلا عہدوں پر چند کشمیری پنڈتوں کی موجودگی بھی کیسے حکومتی فیصلوں پر اثر انداز ہو سکتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود جماعت اسلامی نے کیوں شورش شروع ہوتے ہی پاکستان کی شہ پر کشمیری پنڈتوں کے خلاف خوف و دہشت پھیلائی۔

اگر کشمیری پنڈت شورش شروع ہوتے ہی کشمیر سے ہجرت نہ کرتا تو عین ممکن ہے کہ کشمیر کے حالات اس حد تک نہ بگڑتے۔ کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ کشمیری پنڈت دہشت گردی کے خلاف میدان میں کود پڑتا۔ پاکستان نواز عناصر کے خلاف جم کر لڑائی کرتا۔ کشمیری پنڈت نے ۲۲۔ برس کے دوران، جب شیخ محمد عبداللہ محاذ رائے شماری تنظیم کے سرپرست تھے، کبھی بھی رائے شماری کی مخالفت نہیں کی۔ پاکستان کے حق میں نعرے بلند ہوئے تو کشمیری

www.taemeernews.com

پنڈتوں نے ہندوستان زندہ باد کے نعرے سے اس کی کاٹ نہیں کی۔ اس سے انکار نہیں کہ کشمیری پنڈت ہندوستان نواز تھا اور وہ پاکستان نواز نعروں کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن اس نے کھل کر کبھی نہ تو ہندوستان نوازی کی حمایت کی اور نہ پاکستان نواز عناصر کے خلاف غم و غصے کا اظہار کیا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ جماعت اسلامی نے کشمیری پنڈت کو ہی اپنا نشانہ بنایا؟

نیشنل کانفرنس کی تحریک پاکستان کے دو قومی نظریے کے خلاف تحریک تھی اور جموں کشمیر کا ہندوستان کے الحاق بھی دو قومی نظریے کو جھٹلانے کا نتیجہ تھا۔ اس کے برعکس مسلم کانفرنس اور جماعت اسلامی نہ صرف دو قومی نظریے کی زبردست حامی ہے بلکہ وہ سیکولرزم کو اسلام کی ضد قرار دیتی ہے۔ اپنے اس نظریے کو تقویت پہنچانے کے لئے جماعت اسلامی نے کشمیر کی صدیوں پرانی مذہبی رواداری کی صحت مند روایات کو ختم کرنے کی غرض سے کشمیری پنڈتوں کے خلاف سازش کی اور اس میں وہ کامیاب ہوئی۔ اس میں شاید جماعت اسلامی کو کامیابی حاصل نہ ہوئی ہوتی اگر مجموعی طور سے کشمیری مسلمان خاموش نہ رہا ہوتا۔ خاموش احتجاج بھی جماعت اسلامی کی گھناؤنی سازش کو ناکام بنا سکتا تھا۔ اس سے انکار نہیں کہ بندوق کے خوف سے کشمیری مسلمان کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کشمیری مسلمان بھی جماعت اسلامی کی دہشت گردی کا شکار تھا لیکن اکثریت میں ہونے کے باعث اگر اس نے ابتدائی ایام میں کشمیری پنڈتوں کی ہلاکتوں کے خلاف آواز بلند کی ہوتی تو کشمیری پنڈت کو حوصلہ ملتا اور وہ مہاجر نہ بنتا۔ گورنر جگموہن کو کشمیری پنڈتوں کی ہجرت کے لئے ذمہ دار ٹھہرانا نہ صرف جگموہن کے ساتھ زیادتی ہے۔ بلکہ کشمیری پنڈتوں کا مذاق اڑانے کی کوشش بھی ہے۔ جماعت اسلامی کے لیڈروں کا دعوا ہے کہ وہ اس سازش میں ملوث نہیں تھی اگر یہ دلیل تسلیم بھی کر لی جائے تو ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ مہاجرین کے مکانوں کو کیوں آگ لگائی گئی جو عمل اب تک جاری ہے۔ مہاجرین کے مکانوں کو کیوں لوٹا گیا اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور پھر مقامی اخبارات نے کشمیری پنڈتوں کے لئے مفرور کی اصطلاح کیوں ایجاد کی۔ جماعت اسلامی یہ بدنما داغ اپنے چہرے سے مٹانے کی لاکھ کوشش کرے یہ داغ دھل نہیں سکتا کہ اس نے اپنے کٹر پنتھی نظریات اور دو قومی نظریے کو درست ثابت کرنے کے لئے کشمیر کی تہذیب اور اس کی روایات کو تباہ کر دیا

جماعت اسلامی اور کانگرس سمیت دوسری سیکولر جماعتوں نے نظریاتی ٹکراؤ کے باوجود بالواسطہ طور پر ایک پوائنٹ پروگرام پر اتفاق کیا کہ جگموہن اینٹی مسلم ہے اور بھارتیہ جنتا پارٹی کا ایجنٹ ہے۔ جگموہن کو ریاست کا گورنر یہ طے کرنے کے لئے نہیں مقرر کیا گیا تھا کہ کشمیریوں کو بھارتیہ جنتا پارٹی کی پالیسیوں کے مطابق ہندوستان سے دور پھینک دینا ہے۔

www.taemeernews.com

جگموہن کو گورنر مقرر کیا گیا تھا سیاسی قیادت کی بے ہنگم پالیسیوں کے نتیجہ میں ابھرتی مسلح شورش کو دبانے کے لئے۔ اور اس فریضے کو وہ نبھا رہے تھے ایک تجربہ کار بیوروکریٹ کی طرح۔ لیکن انتظامیہ مکمل طور سے درہم برہم ہو گیا تھا۔ جماعت اسلامی نے سرکاری افسروں اور ملازموں کی ذہنی دھلائی کی تھی اور دہشت گردوں کی کامیابیوں نے عام کشمیری کو یہ یقین دلایا تھا کہ آزادی مستقبل قریب میں ملنے والی ہے جس کی وجہ سے نہ تو بیوروکریسی نے اور نہ ہی عام لوگوں نے ان کو اپنا تعاون دیا۔ اس کے ساتھ کانگریس کی قیادت کردار کشی کی جو مہم ہندوستان بھر میں جگموہن کے خلاف چلائی جا رہی تھی اس سے حالات مخالف رخ اختیار کر رہے تھے۔

اس دوران نئی دہلی سے نائب وزیر اعظم دیوی لال کی قیادت میں ایک ہل پارٹیز وفد سرینگر گیا۔ اس وفد میں کانگریس صدر راجیو گاندھی، غلام نبی آزاد، مکھن لال فوطیدار کے علاوہ سی پی آئی۔ بھارتیہ جنتا پارٹی اور جنتا دل کے لیڈر بھی موجود تھے۔ وفد کے ٹھہرنے کا انتظام سنتور ہوٹل سرینگر میں کیا گیا تھا۔ کانگریس، سی پی ایم اور سی پی آئی کے ساتھ ساتھ نیشنل کانفرنس کے لیڈروں نے پہلے سے ہی جگموہن کو EMBARASS کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور جونہی جگموہن نے وفد سے ملاقات کی تو ٹکراؤ شروع ہوا۔ کانگریس لیڈروں کا مطالبہ تھا کہ وہ لوگوں کے وفد سے ملنا چاہتے ہیں جب کہ جگموہن کا اصرار تھا کہ وہ سیکورٹی خطرات کے پیش نظر وفد کو شہر میں جانے نہیں دیں گے۔ کانگریس کے مولوی افتخار حسین انصاری اس بات پر بضد تھے کہ راجیو گاندھی کو سرکاری ہسپتالوں میں سیکورٹی فورسز کے ہاتھوں زخمی کشمیریوں کی مزاج پرسی کرنی چاہئے۔ راجیو گاندھی اس پر تیار بھی ہوئے لیکن میں نے جو کہ اس موقع پر سنتور ہوٹل میں موجود تھا اس کوشش کو ناکام بنا دیا کیوں کہ میں جانتا تھا کہ راجیو گاندھی اگر کسی بھی ہسپتال میں جاتے یا تو ان پر حملہ ہوتا یا تو انہیں گولی مار دی جاتی اور یہ جگموہن کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوتی۔ مولانا افتخار حسین انصاری اس بات کو سمجھ رہے تھے کہ نہیں لیکن وہ اپنی بات پر ڈٹے رہے لیکن راجیو گاندھی خطرے کی بو کو سونگھ گئے تھے اور انہوں نے اس طرح کا خطرہ مول لینے سے انکار کر دیا۔ ابھی یہ مغالطہ طے ہی ہو رہا تھا کہ سرینگر کے صحافیوں نے راجیو گاندھی کو گھیر لیا اور بی بی سی کے نمائندے یوسف جمیل نے انہیں بتایا INDIA IS NOT WELCOME HERE لوگ ہندوستان سے آزاد ہو جانا چاہتے ہیں۔

آزادی کے ان مجاہدوں سے فرصت ملی کہ سنتور ہوٹل کے اندر انڈین ڈاگس گو بیک کے نعرے بلند ہوئے اور راجیو گاندھی،، مکھن لال فوطیدار اور غلام نبی آزاد کو لوگوں نے گھیر لیا، ڈپٹی وزیر اعظم غائب۔ دوسرے لیڈر بھی غائب۔ گو بیک کا نعرہ بلند کرنے والوں میں سنتور ہوٹل

www.taemeernews.com

کے وردی پوش ملازم پیش پیش تھے۔ اعلا پولس افسر اور اعلا سول افسر خاموشی کے ساتھ گو بیک کے نعروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ لیکن راجیو گاندھی صبر تحمل کے ساتھ گو بیک کے نعرے بھی سنتے رہے اور لوگوں کے ساتھ بات چیت بھی کرتے رہے۔ نہ چہرے پر غصہ نہ ماتھے پر شکن۔ ایک مشتعل ہجوم کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ریاست ہندوستان سے نہ علاحدہ ہوگی اور نہ ہی آزادی ممکن ہے۔ بات کرنی ہے تو ہندوستان میں رہ کر ہی کرنی ہوگی اور آئین کے حدود کے اندر رہ کر مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔ راجیو گاندھی اور کانگریسی لیڈروں کے خلاف جو مظاہرے ہوئے اس سے جگموہن کا یہ نظریہ تقویت حاصل کر گیا کہ حالات اس قدر بگڑ چکے ہیں کہ سیاسی بات چیت ناممکن ہے لیکن نچلی سطح کے کانگرسی یہی پروپگنڈہ کرتے رہے کہ جگموہن کی سازش ہے حالاں کہ اس میں جگموہن کا کوئی قصور نہیں تھا یہ تو کشمیر کا ماحول تھا جس میں ہر ایک کو یہ یقین تھا کہ آزادی ملنے والی ہے اور کشمیر ہندوستان سے علاحدہ ہو رہا ہے۔

www.taemeernews.com

وطن کی دہلیز پر بے وطنی کے زخم   باب ۲۷

تقسیم ہندستان کے پس منظر میں راما نند ساگر نے "اور انسان مر گیا" ناول تخلیق کیا تھا۔ تب محسوس ہوا تھا کہ ساگر نے انسان سے انصاف نہیں کیا ہے۔ بھلا انسان کیسے مر سکتا ہے۔ انسان کیسے حیوان بن سکتا ہے۔ ادکھلی کلی کو کیسے مسل سکتا ہے۔ منٹو کی "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کہانی پڑھی تو لگا کہ فرضی کہانی ہے انسانوں کو شرمسار کرنے کے لیے۔ بھلا کیا کسی کا وطن اس کے ہم وطن اس سے چھین سکتے ہیں، اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو سے محروم کر سکتے ہے۔ لیکن آج مجھے ساگر اور منٹو کی یاد آرہی ہے کیونکہ میری آنکھوں کے سامنے انسان ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر چکا ہے۔ انسانیت لٹ کر دم توڑ گئی ہے۔ انسان نے حیوان کے پنجے لگا کر زندہ انسانوں کی شہ رگ کو کاٹ دیا ہے۔ وطن سے بے وطن بھی کیا ہے، خوشبو بھی چھین لی ہے۔ کاش منٹو زندہ ہوتا۔ ساگر رامائن کے ساگر میں ڈوب کر خاموش نہ ہوا ہوتا تو آج مجھے یہ سب لکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ منٹو اور ساگر کے زمانے میں نہرو اور آزاد جیسے سیاستداں اور انسان بھی تھے اور یہی وجہ ہے کہ انسان مرتے مرتے پھر جی اٹھے۔ سنبھل گئے آج کے لیڈر گھناونے، انسانی جذبوں سے محروم، انسانی ہمدردی سے پاک، وعدوں پر زندہ رکھنے والے حیوان خصلت انسان، کورے کاغذ کے ورق، ہر ورق پر خود غرضی، فریب، نفرت، لالچ، بے حسی اور کم ظرفی کی سیاہ تصویریں۔

۱۹۴۷ء میں وطن تقسیم ہوا۔ وطن کے سینے پر ایک گہری لکیر کھینچی گئی۔ اب کی بار وطن تقسیم نہیں ہوا۔ انسانوں کو مذہب کے نام پر، تشخص کے نام پر، پاکستان کے نام پر اور کشمیر کی سرزمین کو کافروں سے پاک کرنے کے نام پر تقسیم کیا گیا۔ اس تقسیم نے کشمیر کی تہذیب، اس کی روایات اور اس کی زبان پر ایسے گہرے زخم لگائے کہ زخموں سے رستے خون سے ہندو اور مسلمان کی بو آنے لگی۔ آج کی تقسیم نے پوری ایک قوم کی شناخت مٹا دی اور اگر کچھ بچا بھی تو اسے ایک سازش کے تحت دھیرے دھیرے ختم کیا جارہا ہے۔ میں نے جب لکھا تھا کہ پنن کشمیر ایک خواب ہے، خواب دیکھنا بند کر دو تو تقسیم کے زخموں سے نڈھال ایک مریض نے کہا تھا "جس طوفان سے گذر کر ہم کٹ کر گر گئے ہیں اور گر رہے ہیں اس میں خواب ہی دیکھے جا سکتے ہیں، خوابوں کی تعبیر کی عیاشی نہیں کر سکتے۔ لے دے کر اب خواب ہی رہ گئے ہیں، ان

www.taemeernews.com

خوابوں سے بیدار کرنے کی کوشش مت کرو۔" مریض نے کہا" تم بھی خواب دیکھنا شروع کروگے اگر ویرانوں میں چہرے پڑھنے کی کوشش کروگے۔" میں نے چیلنج قبول کیا اور تلاش شروع کی چہروں کی اور یہ چہرے مجھے جموں کے مصری والا کیمپ میں دکھائی دیئے۔ اس کیمپ میں کشمیر کے وہ مہاجرین کھلے آسمان تلے ویرانے میں زندگی کے آخری پڑاؤ پر بے حس پڑے ہیں جو سبزہ زاروں میں پیدا ہوئے۔ گل پوش وادی میں پھولوں کی مہک میں جوان ہوئے۔ برف پوش پہاڑیوں میں زندگی کے ساتھ حسین اور لطیف چھیڑ چھاڑ کرتے رہے۔ اچانک طوفان آیا۔ آنکھیں تھرا گئیں چہرے بدل گئے اور پاکستان کے مجاہدوں نے پھونکوں سے انسانیت کے چراغ بجھا کر لاکھوں لوگوں کو تاریک غار کی طرف دھکیل دیا اور قافلے بنتے گئے۔ بھاگتے رہے اور حاتم طائی کی ناجائز اولاد سرکار نے ان لٹے قافلوں کو کیمپوں میں پناہ دی۔

مصری والا کیمپ ایک ایسا ہی CONCENTRATION کیمپ ہے۔ ہاں فرق اتنا ہے کہ ارد گرد نہ خاردار تار ہے نہ بندوق تھامے سپاہی چاروں اور کھڑے ہیں۔ یہ کیمپ ایک ایسا وسیع قبرستان ہے جس میں لاوارث لاشوں کو دفنایا جاتا ہے۔ تینوں طرف ایسٹ کے بھٹے۔ بھٹوں کی بھٹیوں سے اگلتی آگ۔ بھٹوں سے اڑتی دھول۔ سانس لیں تو دم گھٹ جاتا ہے۔ کیمپ میں داخل ہوتے ہی سرکاری دیسی شراب کی دکان استقبال کرتی ہے اور دکان کی دائیں طرف مہاجرین کی حفاظت کے لئے پولیس کیمپ اور کیمپ میں پولیس کے دو سپاہی اونگھ رہے ہیں، شاید دیسی شراب کی بو نے مدہوش کر دیا ہے۔ دور دور تک گندے، پھٹے اور ٹوٹے ٹینٹوں کی قطاریں۔ ٹینٹوں کے ارد گرد جھاڑیاں اور سامنے " کانگریسی گھاس" جسے چھوتے ہی سارے بدن پر کھجلی شروع ہو جاتی ہے اور کھجلی بھی ایسی کہ کھرچتے کھرچتے خون نکل آتا ہے۔

برف پوش پہاڑیوں کے دامن میں وادی گل پوش کا ہر شخص خوبصورت تھا۔ چہرے لال، گماں ہوتا تھا کہ سرنج سے گالوں میں گلال بھر دیا گیا ہے۔ جلد ملائم، خدشہ رہتا تھا کہ جسم پر بارش کا قطرہ گرے تو شرم سے ٹوٹ جائے۔ جسم صاف ستھرا، جیسے کسی برفاب سی حسینہ کا جسم۔ صحت اتنی اچھی کہ بیماری خوف کھا کر بھاگ جاتی تھی۔ مگر مصری والا کیمپ میں چہرے بدل گئے ہیں، بے نام، بے شناخت۔ چہروں کو ٹینٹوں کی دھول نے دھو دیا ہے۔ چہرے بدصورت، لالی پر کالک۔ جلد سخت اور کھردری۔ دھول چاٹتے چاٹتے اور بدبو سونگھتے سونگھتے چوڑے سینے سکڑ گئے ہیں۔ کھانستے کھانستے گلے سوکھ گئے ہیں۔ مریل سی آواز، جیسے کوئی خارش زدہ کتا آخری سانس لے رہا ہو۔ ٹینٹ تین برس قبل الاٹ کئے گئے تھے اور تین برسوں میں آگ اگلتی گرمی، تیز بارش اور تیز ہواؤں نے ان ٹینٹوں کی ہیت ہی بدل دی ہے۔ پھٹے، ٹوٹے اور تیز جھونکوں میں جھولتے۔ پانی برستا ہے تو ٹینٹ اندر باہر دھل جاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی ندیاں چاروں طرف بہنے لگتی ہیں اور

www.taemeernews.com

ان میں تیرتے ہیں ٹوٹے پھوٹے برتن۔ پھٹے پرانے کپڑے۔ چھوٹے بچے تیرتے ہیں زندگی کے آخری سرمایہ کو سمیٹنے اور انسانوں جیسی شکل والے ہزاروں لوگ جھاڑیوں میں چھپ جاتے ہیں اور جھاڑیاں ہیں کہ زخم پر زخم لگا دیتی ہیں۔ کھجلی شروع ہو جاتی ہے اور خون بہنے لگتا ہے۔ آگ برساتی گرمی میں انسانوں کی یہ کھلی بستی تڑپتی رہتی ہے۔ سسکتی رہتی ہے۔ بارش کے لئے دعا کرتی ہے تو بارش سب کچھ بہا کر لے جاتی ہے۔ ویران بستی میں بیت الخلا بھی ہے۔ گندگی پلتی رہتی ہے، بہتی رہتی ہے گرمی ہو تو چاروں اور بدبو۔ بارش ہو تو گندگی ٹینٹوں میں پناہ لیتی ہے۔ بڑے لوگ کبھی کبھی آتے ہیں اور وعدوں کی ٹافی کھلا کر چلے جاتے ہیں۔ ایک بار وزیر مملکت داخلہ راجیش پائلٹ بھی گئے تھے اور وعدے کیے تھے کہ صحرا میں پھول اگائے جائیں گے اور یہ بستی پھولوں کے انتظار میں پھول جیسے بچوں کی بینائی قربانی کر رہی ہے۔

میں گیا تو پہلا نشتر ـــ کیا آپ بھی زخموں کے منہ چوڑے کرنے آئے ہیں۔" بھئی میں تو اخبار والا ہوں اور اخبار کا نام سن کر چہروں پر نفرت پھیل جاتی ہے اور ہر چہرا بولنے لگتا ہے۔" صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ بھوک، بیماری، لاچاری، بے بسی اور افلاس پر ایک نئی دکان کھولنے آئے ہو۔" زندگی کے بوجھ سے جھکے ایک بزرگ نے کہا۔" کیا ہندوستان مر چکا ہے کیا ہندوستانی ختم ہو گئے ہیں۔ کیا ہندوستان کا ضمیر ٹوٹ گیا ہے۔ کیا سرکار اندھی ہو چکی ہے۔ کیا ریاستی سرکار کا وجود مٹ گیا ہے کہ اخبار والے ماتم پرسی کے لئے آئے ہیں ـــ؟" میں نے کہا بھئی میں تو آپ لوگوں کی گمشدہ تاریخ کو تلاش کرنے آیا ہوں تو ایک صاحب بول پڑے" تاریخ ان کی ہوتی ہے جن کا وطن ہوتا ہے، جن کی کوئی شناخت ہوتی ہے، جن کا کوئی سماج ہوتا ہے، جن کے رشتے ہوتے ہیں، جن کے چہرے ہوتے ہیں۔ ہم تو بے چہرہ بے نام، بے شناخت لوگ ہیں۔ NO MANS LAND میں رہتے ہیں۔ ہماری تاریخ بھلا آپ کیا تلاش کریں گے ہم تو آثار قدیمہ میں دفن ہو گئے ہیں۔" ایک اور نے فقرہ چست کیا" صاحب یہاں جو بچے پیدا ہوتے ہیں سرکار ان کا رجسٹریشن نہیں کرتی کیونکہ سرکار کا فرمان ہے کہ علاقہ غیر کے بچوں کی شناخت بے معنی ہے۔" مایوسی کے گھنے سیاہ بادلوں میں روشنی دکھانے کے لئے میں نے پوچھا اسکول کہاں ہے؟ جی ہاں، اسکول ہے سرکاری سیکرٹیریٹ کی فائلوں میں۔ ایک برس قبل پرائمری اسکول کتابوں میں کھولا گیا۔ گرانٹ بھی منظور ہوئی۔ استاد بھی بھرتی ہوئے۔ تنخواہ بھی وصول کرتے ہیں لیکن اسکول کہاں ہے معلوم نہیں۔ ویسے بھی پڑھنے کا کیا فائدہ، کشمیر یونیورسٹی کے لیے مہاجر طلبہ و طالبات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ نتائج دو برسوں سے ظاہر نہیں کیے گئے اور اگر ہوئے بھی مہاجر طلبہ کی شرح کامیابی ۸۰ فیصد سے گھٹ کر ۱۱ فیصد دکھائی جاتی ہے۔ ایک پڑھے لکھے مریل نوجوان نے کہا" وطن تو چھن گیا اب ہماری تہذیب، ہماری زبان اور ہمارا معاشرہ بھی ایک

www.taemeernews.com

سازش کے تحت ہم سے چھینا جارہا ہے۔ ہماری شناخت بھی مٹانے کا سامان کیا گیا ہے۔" راشن تو ملتا ہو گا۔ ریلیف کے ایک ہزار روپے بھی ملتے ہونگے۔" جی ہاں اکتوبر کی ریلیف جنوری میں ملی ہے۔" چیف سکریٹری سے بات نہیں کی۔ جی ہاں، کرتے ہیں، کہ رہے تھے پھٹے پرانے ٹینٹوں کی مرمت کرو ویسے بھی انھیں فرصت کہاں ہے، مصروف ترین شخصیت ہیں اور پھر دہشت گردوں کے ساتھ حساب کتاب صاف رکھنا پڑتا ہے۔" ایک اور صاحب بول پڑے" کس سرکار کی بات کر رہے ہیں، وہ ابھی فیصلہ نہیں کر سکی ہے کہ ہم کو کشمیر سے کیوں بھاگنا پڑا۔ وہ تو یہی نہیں طے کر پائی ہے کہ ہم کو جگموہن نے بھگایا یا اس دھمکی نے جو دہشت گردوں نے اخبار الصفا کے ذریعہ دی تھی کشمیری پنڈت ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر وادی کو خالی کر دیں۔"

کشمیر جب زندہ تھا تو اپنی ایک علاحدہ شناخت تھی۔ عورت کو بلند مقام حاصل تھا اور عورت تھی کہ کبھی اس بلند مقام کا سر جھکنے نہیں دیا۔ کشمیری عورت چاہے کتنی ہی ماڈرن کیوں نہ ہو کبھی بھی گیلے بالوں کی نمائش نہیں کرتی۔ کسی پبلک نلکے پر بالوں کو دھوتی نہیں۔ مرد بھی سڑکوں پر نہاتے نہیں لیکن مصری والا کیمپ میں کیسی شرم و حیا۔ مختصر سے ٹینٹ میں ماں باپ۔ بھائی بھابھی۔ بیٹا بیٹی۔ بیٹی داماد ایک ہی فرش پر سوتے ہیں۔ کپڑے بدلنے ہو تو مرد باہر نکل کر پہرا دیتے ہیں اور عورتیں اندر کپڑے بدلتی ہیں۔ نوجوان جوڑوں کو اس ویران صحرا میں اکیلے میں ملنے کی خواہش ہو تو رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح کسی جھاڑی کی طرف نکل پڑتے ہیں۔ زبان ترستی ہے شوہر کی بیوی کے ساتھ دو میٹھے بول کے لیے اور پھر ویرانے میں مٹھاس کہاں۔ لطیف جذبے کہاں۔ سب ٹھنڈے پڑ گئے ہیں۔ کھلے عام نلکوں پر مرد نہا رہے ہیں تو دوسری طرف عورتیں بال دھو رہی ہیں اور تیسری طرف پینے کا پانی حاصل کرنے کے لئے کیچڑ کے دلدل کو پار کرنے کی کوئی کوشش کر رہا ہے۔ اس بستی کے اکثر لوگ بیمار ہیں۔ کھانستے ہیں۔ آنکھوں کی بینائی گل ہوئی جاتی ہے۔ خارش سے بدن جلتے رہتے ہیں۔ حکومت غافل نہیں، دو چھوٹے کمروں کی ایک ڈسپنسری بنائی ہے۔ باہر پھٹے گندے پردے لٹک رہے ہیں اور دو بیڈ ایک الماری، ایک زنگ آلودہ ٹیبل پر ایک رنگ آلود ٹرے میں خالی ڈبے اور خالی ڈبوں کے بیچ چند ڈبے۔ دوائی کی چند رنگین گولیاں ساتھ ہی پڑی ہے ایک میلے ٹیبل پر زنگ آلودہ تخت پر جراثیم مارنے کے لئے پانی ابالنے کی کیتلی۔ ہاتھ لگایا تو دھول سے ہاتھ صاف ہوا۔ ڈسپنسری کے ساتھ ہی بیت الخلا اور ننگی نالیاں جس میں پانی جمع رہتا ہے، نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، پڑا پڑا سڑتا رہتا ہے۔

سڑکیں ہیں تو نہیں جھاڑیوں کو توڑ کر ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں بنائی گئی ہیں اور اس پر چل کر اینٹ اور لکڑی سے بنے ایک منزلہ مکانوں کی بستی ہے۔ 8\1\2 x 10\1\2 فٹ کا

www.taemeernews.com

ایک کمرہ بس جیل کی وہ کوٹھری جہاں سے پھانسی یافتہ مجرموں کی زندگی کا آخری پڑاؤ شروع ہوتا ہے۔ ایک طرف کچن یعنی لٹکائے گئے پردے کے پیچھے چند برتن۔ دوسرے کونے میں کپڑے اور تیسرے کونے میں ٹوٹی چارپائی۔ ان مکانوں کے ساتھ ہی بنا ہے بیت الخلا جس کی گندگی ان مکانوں کے سامنے سنک میں جمع ہو جاتی ہے۔ سارا گندہ پانی کھلی نالیوں میں جمع ہو جاتا ہے۔ مکان نئے ہیں لیکن چھتوں سے پانی ٹپک رہا ہے۔ سیمنٹ اکھڑ رہا ہے۔ ان کھلی نالیوں کے پاس ہی بیٹھی ہیں چار عورتیں چاول صاف کرنے کے لیے۔

پوری بستی میں کئی گھنٹے گذارے اور بار بار ذہن میں ایک ہی سوال ابھرتا رہا کہ کیا حکومت کا ضمیر مر چکا ہے۔ کیا گورنر کی بینائی ختم ہو چکی ہے۔ کیا گورنر انتظامیہ مردہ ہے۔ کیا مرکزی سرکار نے لوریاں سنا سنا کر اپنے ضمیر کو سلا دیا ہے۔ یہ سب لوگ تو اسی دیش کے واسی ہیں جس میں گنگا بہتی ہے، جس میں گنگا کو صاف کرنے کے لیے اربوں روپے خرچ ہو رہے ہیں اور مصری والا کیمپ کے یہ نیم زندہ لوگ زندگی کی بھیک مانگ رہے ہیں۔

مصری والا کیمپ کے ٹوٹے انسانوں کی یہ داستان غم ان دوسرے کیمپوں سے مختلف نہیں ہے جن میں کشمیری مہاجرین کو زندہ دفن کیا گیا ہے۔ ایک پوری قوم کی اس تباہی اور حکومت کی لاپرواہی پر آنسو بھی تو نہیں بہائے جا سکتے کیونکہ بھوک اور مجبوری کی وجہ سے آنسو ہی خشک ہو گئے ہیں اور پھر روئیں بھی تو کس کے سامنے کوئی آنسو پونچھنے والا بھی نہیں ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ یہ سب ٹوٹے لوگ باعزت شہری تھے۔ یہ تب کی بات ہے جب ان کا اپنا وطن ان سے چھینا نہیں گیا تھا۔ ہنستے کھیلتے گھروں کے یہ بدنصیب لوگ کسی کے راہ کے روڑے بھی نہیں تھے۔ انھوں نے کبھی بھی کسی نظام کی مخالفت نہیں کی۔ تب بھی نہیں جب پٹھان دور میں وادی میں صرف گیارہ کنبے زندہ رہ گئے تھے۔ تب بھی نہیں جب اس فرقہ کے لوگوں کو چمڑے کے تھیلوں میں بند کر کے وتستا میں پھینک دیا جاتا تھا۔ اس فرقہ نے تب بھی احتجاج نہیں کیا جب" کشمیر میں رائے شماری کے فوراً کراؤ۔ ہندوستانی کتوں واپس جاؤ" کے نعرے بلند ہوتے تھے۔ یہ لوگ تو ہر حال میں خوش رہتے تھے کیونکہ ان کا اپنا وطن تھا۔ اپنے وطن کی مٹی تھی۔ اپنے وطن کی خوشبو تھی۔ وطن ہو تو آدمی پیٹ پر پتھر باندھ کر بھی، بھوک کی تڑپ کو برداشت کر سکتا ہے۔ اپنی شناخت موجود ہو تو آدمی زندگی کی معمولی معمولی ضرورتوں سے محروم ہو کر بھی خوش رہتا ہے۔ اپنی تہذیب، اپنی زبان زندہ ہو تو گونگ زبان بھی قینچی کی طرح چلتی ہے۔ وطن سے بے وطن لوگ۔ شناخت سے بے شناخت لوگ۔ تہذیب اور زبان سے کٹے لوگ تو احتجاج بھی نہیں کر پاتے۔ اپنوں نے اپنے سے کاٹ کر دور پھینک دیا اور جس بھارتی سرکار پر آنکھیں لگی ہوئی تھیں اس سرکار کی روشنی گل ہو گئی۔ اپنی سرکار کو فرصت ہی نہیں ان کے دکھوں کا مداوا

www.taemeernews.com

کرنے کی۔ عجیب طرح کا تعصب ہے۔ عجیب طرح کی نفرت ہے۔ عجیب طرح کا امتیاز ہے۔ عجیب طرح کا غیر انسانی رویہ ہے جس نے اس زندہ قوم کو نیم مردہ بنا دیا ہے اور آج بھی جب سب کچھ لٹ چکا ہے، ہر کوئی اپنی ہی لاش اپنے کندھے پر اٹھائے گھوم رہا ہے، آنکھوں سے شعلے برستے ہیں اور ایسا لگ رہا ہے کہ اگر امید کی آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی تو یہ نیم مردہ جوان بھی ہتھیار اٹھالیں گے۔ انھیں یقین ہے کہ حکومت صرف بندوق کی آواز سن سکتی ہے، بارود کی بو سونگھ سکتی ہے، آگ اور خون کی ہولی کھیل سکتی ہے۔ لیکن اب بھی ان لوگوں میں زندگی کے آثار باقی ہیں مگر شرط یہ ہے کہ" کوئی ان کو احساس ذلت دلا دے۔ کوئی ان کی سوئی ہوئی دم ہلا دے۔ یہ مظلوم مخلوق گر سر اٹھائے تو انسان سب سر کشی بھول جائے۔ یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا لیں۔ یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبالیں۔"

www.taemeernews.com

منافع بخش انڈسٹری باب ۲۸

کشمیر میں پاکستان کی شرارت ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہندوستان کی ساتھ ہی شروع ہوئی۔ کئی بار پاکستان نے کشمیر کے سوال پر ہندوستان پر جنگ ٹھونس دی لیکن ہر بکی ہتھیاروں کے باوجود پاکستان کو ہر بار شکست ملی۔ ابکی بار ۱۹۸۹ء میں اپنی حکمت عملی میں تبدیلی کر کے پاکستان نے ایک غیر اعلان شدہ جنگ شروع کی جس کی شدت کو دیکھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اب کی بار پاکستان یہ جنگ جیت جائے گا وجہ یہ نہیں تھی کہ ہندوستان کمزور تھا یا ہندوستان اپنا دفاع نہیں کر سکتا تھا۔ وجہ یہ تھی اس بار پاکستان نے اسلامی ہتھیار اس موثر ڈھنگ سے استعمال کیا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی کشمیری مسلمان اس اسلامی ہتھیار کو آزمانے پر آمادہ ہو گیا۔ شورش شروع ہوتے ہی سیاسی نظام ٹوٹ گیا۔ سول انتظامیہ پر فالج گر گیا۔ دفاع کرنے والے ہی میدان سے بھاگ گئے۔ امن قانون کے محافظ محض تماشائی بن گئے اور کشمیر پر بندوق کی حکمرانی قائم ہوگئی۔ نیشنل کانفرنس اور کانگرس دونوں سیاسی جماعتیں سیاسی میدان سی ایسے غائب ہو گئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ نیشنل کانفرنس جسے کشمیری مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعوا تھا وہ اچانک اچھوت بن گئی۔ مقامی اخبارات میں آئے روز اشتہارات شائع ہونے لگے کہ ہمارا نیشنل کانفرنس کی ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ نیشنل کانفرنس کے خلاف نفرت نے ایسا رخ اختیار کر لیا کہ شیخ محمد عبداللہ کے فوٹو چوراہوں۔ دیواروں۔ بازاروں اور سرکاری دفاتر سے اتار لیے گئے۔ شیخ محمد عبداللہ کی قبر کی بے حرمتی کی گئی۔ شیخ محمد عبداللہ جس کشمیری مسلمان کو زندگی کی آداب سکھائے تھے۔ انہیں سر اونچا کر کے سینہ تان کر اپنا حق مانگنے کا سلیقہ سکھایا۔ شیخ محمد عبداللہ جس نے کشمیری مسلمان کے چہرے سے غربت۔ بھوک اور جہالت کے صدیوں پرانے سیاہ دھبوں کو دھو دیا تھا۔ وہی شیخ محمد عبداللہ کشمیری مسلمانوں کے لئے کوڑھ بن گیا۔ کانگرس ایک مختصر سی جماعت تھی اس کا سیاسی افق سے غائب ہوجانا کوئی غیر فطری بات نہیں تھی لیکن اس کے باوجود کسی بھی کانگریسی نے اخبارات کے ذریعہ یہ اعلان نہیں کیا کہ اس کا کانگرس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کانگرسی خاموش ہو گئی اور گھروں کی چاردیواری کی اندر قیدی بن گئے۔ جن کانگرسی لیڈروں نے ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کے ساتھ الحاق کا بھرپور معاوضہ حاصل کیا تھا۔

www.taemeernews.com

کروڑوں کی جائداد بنائی تھی وہ اپنی دولت کے بل پر کشمیر سے بھاگ گئے اور شہید بن کر بدستور اپنی بے نام شہادت کا معاوضہ حاصل کرتے رہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کا سیاسی طور سے کشمیر میں وجود تھا ہی نہیں۔ جنتا دل بھی ایک مختصر ترین پارٹی تھی البتہ اسے اس وقت کے وزیر داخلہ مفتی محمد سعید کی سرپرستی حاصل تھی جسکی وجہ سے اسے کلیدی حیثیت حاصل تھی لیکن اس کے مقامی لیڈر خاص کر چرار شریف کے عبدالقیوم۔ عبدالغنی نختہ ہالی اور کئی دوسرے اہم کارکن کشمیر سے بھاگ نہیں گئے۔ اپنے ہی لوگوں میں رہے اور اپنے لوگوں کے دکھ سکھ میں شریک رہے۔ مارکسٹ کمیونسٹ پارٹی اور کمیونسٹ پارٹی چند افراد کی جماعتیں ہیں اس لئے ان کا سیاسی افق سے غائب ہونا صورت حال پر کوئی اثر نہیں ڈال سکا۔ سیاسی لیڈرشپ جو ایسے نازک موقوں پر لوگوں کی رہنمائی کرتی ہے وہ اکھڑ گئی۔ سرکاری انتظامیہ میں یہ احساس پیدا ہوا کہ اسلامی ہتھیار کامیاب ہو جائے گا اور یہی وجہ ہے کہ چھوٹے بڑے سرکاری ملازم بھی اس ہتھیار کو آزمانے پر آمادہ ہو گئے۔ گذشتہ چھ برسوں کے دوران اسلامی ہتھیار کے کثرت استعمال سے یہ ہتھیار اب کند ہو گیا ہے۔ جس اسلامی جنگ نے ۱۹۸۹ میں پورے کشمیر کو اپنی لپیٹ میں لیا آج وہ جنگ بہت کمزور ہوگئی ہے حالانکہ آج بھی بارود سے انسانوں کی پرخچے اڑتے رہتے ہیں۔ گولیوں کی سنسناہٹ سے آج بھی کشمیری خوفزدہ ہیں۔ بندوق کی نال پر آج بھی کشمیری خاموش رہتا ہے۔ کلانشکاف کے بل پر آج بھی عصمتیں لٹ رہی ہیں۔ تحریر و تقریر کی آزادی پر آج بھی پہرے ہیں۔ آج بھی ذہن ماؤف ہیں۔ آج بھی زبان کنگ ہے لیکن آج موت کے ننگے ناچ سے۔ بلا کتوں سے۔ آگ اور خون کی ہولی سے تمام کشمیری تنگ ہیں۔ اسلامی نظام کا جو خواب ۱۹۸۹ میں کشمیریوں کو خوفزدہ کر کے دکھایا گیا تھا وہ خواب بکھر چکا ہے۔ جس پاکستان کا آئینہ دکھایا گیا تھا وہ دھندلا پڑ گیا ہے۔ ۶ برسوں میں نہ تو پاکستان کشمیر کے ایک انچ رقبہ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوا ہے اور نہ ہی اسلامی مجاہد کشمیر کو ہندوستان سے آزاد کر سکے ہیں۔ آج وہ کشمیری جو پاکستان کی ساتھ الحاق کے لئے جنونی بن گیا تھا وہ اس حقیقت کو پہچان گیا ہے کہ جموں کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ الحاق ایسے کچے دھاگے سے بندھا نہیں ہے کہ بندوق کی ایک گولی۔ بم کا ایک دھماکہ اور بارود کے پھٹ جانے سے یہ کچا دھاگا ٹوٹ سکتا ہے۔ ہندوستان کے ساتھ الحاق نظریاتی تھا یا شیخ محمد عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کی مجبوری تھی اس پر کافی بحث ہو چکی ہے اور اب یہ بحث بے معنی ہے کیونکہ الحاق کا فارمولہ نہ تو سیاسی نظریات۔ نہ تو اکثریت یا اقلیت اور نہ ہی رائے شماری کے ذریعہ عوامی رائے معلوم کرنے کا فارمولہ تھا۔ الحاق کا نظریہ انگریز سامراج نے تقسیم ہندوستان کے وقت پیش کیا تھا جسے ہندوستان اور پاکستان دونوں نے ہی تسلیم کر لیا تھا۔ اسی نظریہ کے تحت ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے مہاراجوں اور نوابوں کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ

www.taemeernews.com

ہندوستان یا پاکستان دو میں سے کسی ایک مملکت کے ساتھ الحاق کر سکتے ہیں۔ یا دونوں مملکتوں کے ساتھ جوں کا توں یعنی Stand Still معاہدہ کر سکتے ہیں۔ عوام سے پوچھنے یا رائے شماری کرانے کی کوئی شرط نہیں تھی مہاراجہ ہری سنگھ کے ذہن میں آزاد مملکت کا خاکہ تھا اور وہ دونوں مملکتوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھ کر اپنی موروثی حکمرانی قائم رکھنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ ذہنی طور سے پریشان تھے کہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کی صورت میں وہ موروثی حکمرانی سے محروم جائیں گے۔ پاکستان کے ساتھ الحاق کی صورت میں وہ ہندو اکثریت کی حمایت سے محروم ہو جائیں گے۔ انہیں پاکستان کی قیادت پر بھی بھروسہ نہیں تھا کہ الحاق کے بعد وہاں کی لیڈرشپ انہیں زیادہ مدت تک برداشت کرے گی۔ وجہ کچھ بھی ہو۔ مہاراجہ ہری سنگھ کی ذہنی پریشانی اور خود غرضی نے صحیح وقت پر درست فیصلہ لینے نہیں دیا۔ اس سلسلہ میں شیخ محمد عبداللہ نے اپنی سوانح حیات آتش چنار میں لکھا ہے کہ "میری رہائی کی ساتھ ہی نیشنل کانفرنس کے دوسرے لیڈروں اور کارکنوں کی رہائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میرے جو ساتھی ریاست سے باہر گئے ہوئے تھے وہ آہستہ آہستہ واپس لوٹنے لگے۔ خواجہ محی الدین قمرہ اپنی روپوشی ترک کر کے منظر عام پر آ گئے۔ میں نے دھیرے دھیرے جماعت کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو پھر سے اکٹھا کرنا شروع کیا اور جماعت کو دوبارہ منظم کیا۔ مجاہد منزل تو ہمارا صدر دفتر تھا لیکن ہم نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر شہر کے دماغ امیرا کدل کے بڑے چوک میں جو بعد میں لال چوک کہلایا، واقع پلیڈیم سینما میں اپنا کارگذار دفتر قائم کیا۔ چونکہ ریاست کی انتظامیہ کی باگیں ڈھیلی پڑ رہی تھیں اور آنے والے دنوں کے پر آشوب امکانات نے ہمیں اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس لیے ہم نے اندورونی امن و امان اور شہریوں کی عزت و عصمت اور جان و مال کی حفاظت کی لیے ایک رضا کار تنظیم بنانے کی کاروائی بھی شروع کر دی۔ میں نے اس تنظیم کی غرض وغایت خانقاہ معلی کے اس جلسے میں بیان کی جو میری رہائی کی تہنیت میں بلایا گیا صف بندی کی بعد میں نے اس تنظیم میں عوام کو بلالحاظ مذہب وملت شامل ہونے کی دعوت دیتے ہوئے اس کے اغراض و مقاصد بیان کئے

۱۔ سلامتی فوج کے سامنے ملک کشمیر کی آزادی اور اس کی ناموس کی حفاظت مقدم ہو گی۔
۲۔ سلامتی فوج کے رضا کاروں پر ملک کے لوگوں کے عزت و عصمت کی حفاظت کا فرض لازم ہو گا۔
۳۔ رضا کاروں کو مسلم اکثریت پر یہ امر واضح کرنا ہو گا کہ غیر مسلم اقلیت کی حفاظت نہ صرف فرض اولین ہے بلکہ اسلام کے صحیح اصولوں کا تقاضہ بھی ہے۔
۴۔ رضا کاروں کو مستعد رہنا ہو گا کہ فرقہ وارانہ منافرت کا کوئی موقع پیدا نہ ہونے پائے اور

www.taemeernews.com

باہمی چپقلش اور خلفشار کے رجحانات سر نہ اٹھانے پائیں۔

ادھر سرحد پار سے تشویشناک اطلاع آرہی تھی۔ مغربی اور مشرقی پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ اس طوفان بے تمیزی میں صرف ہماری ریاست دارالامان کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس لیے ہندو۔ مسلم۔ سکھ پناہ گزیں ریاست کی سرحدوں میں داخل ہو رہے تھے۔ مہاراجہ کی حکومت نے ہند اور پاکستان سے موجودہ حالات کو قائم رکھنے کا معاہدہ کرنے کی جو پیشکش کی تھی۔ حکومت ہند نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ کیونکہ اس وقت ہند کا کشمیر کے ساتھ کوئی براہ راست رابطہ نہ تھا۔ لیکن پاکستان کے ساتھ ڈاک خانوں وغیرہ کے سلسلے میں سمجھوتا ہو گیا تھا۔ اور ڈاک و تار کا سارا نظام پاکستان کے محکمہ ڈاک و تار نے سنبھال رکھا تھا۔ لیکن جب ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے قیام پر سرینگر کے ڈاک خانہ پر پاکستان کا سبز ہلالی جھنڈا لہرایا گیا تو قائم مقام وزیر اعظم جنرل جنک سنگھ کو یہ بات ناگوار گذری اور انہوں نے یہ جھنڈا نیچے اتارنے کا حکم دیا۔ پاکستان کی طرف سے ایک خاص ایلچی مہاراجہ کو پاکستان سے الحاق پر آمادہ کرنے کے لئے سرینگر آیا لیکن اس کی گفتگو منڈھے نہیں چڑھی۔ حالانکہ اس سے قبل رام چند کاک نے اپنی وزارت اعظمیٰ کے زمانے میں نواب زادہ لیاقت علی خان کے ساتھ پاکستان کے ساتھ الحاق کے بارے میں پینگیں بڑھائی تھیں۔ بہر حال پاکستان کو مہاراجہ کی روش پسند نہیں آئی اور اس نے ریاست کی درآمدات جن میں نمک، پٹرول اور غذائی اجناس شامل تھیں، راولپنڈی میں روک لیں۔ کشمیر میں امپیریل بینک کی شاخ کو کرنسی نوٹوں اور ریزگاری کی بہم رسانی بھی روکی گئی۔ ریاست کو ہندوستان کی ساتھ جو راستے ملاتے تھے وہ سب پاکستان ہو کر جاتے تھے۔ اس لئے صورت حال گھمبیر ہوتی گئی۔ مہاراجہ کی حکومت نے پاکستان کی اس روش پر احتجاج کیا لیکن حالات بگڑتے ہی گئے۔

ادھر پاکستان کے ارباب اقتدار نے دو نمائندے ہم سے بات چیت کرنے کے لئے سرینگر روانہ کیے۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور شیخ صادق حسن یہ دونوں حضرات کشمیری نژاد تھے۔ ڈاکٹر تاثیر لاہور کے ایک امیر کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور کچھ عرصہ کے لیے ایس پی کالج سرینگر کی پرنسپل بھی رہ چکے تھے۔ ان دنوں اس سے کافی راہ رسم بھی پیدا ہو گئی تھی۔ موخرالذکر امرتسر کے ایک معزز کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور قالین بنانے کے ایک بڑے کارخانے کے مالک تھے۔ تقسیم کی بعد یہ لاہور میں مقیم ہو گئے اور پنجاب مسلم لیگ کے صوبائی صدر بنا دیئے گئے میں ان دونوں اصحاب سے خوب اچھی طرح واقف تھا بلکہ شیخ صادق حسن نے تحریک کی ابتدا میں کشمیر آ کر ہماری ہمت بھی بندھائی تھی۔ چنانچہ میرے گھر میں ان کی میری اور خواجہ غلام احمد عشائی کے ساتھ مفصل ملاقات ہوئی۔ ادھر ادھر کی باتوں سے

www.taemeernews.com

فرصت پانے کے بعد میں نے شیخ محمد صادق حسن سے پوچھا کہ بہ حیثیت ایک کشمیری کے ان کا کیا مشورہ ہے کہ ہم کس طرح اپنے مستقبل کا تعین کریں؟ شیخ صاحب نے بڑی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ بہ حیثیت کشمیری کے وہ یہی پسند کریں گے کہ ہم نہ ہندوستان کے ساتھ رشتہ جوڑیں اور نہ پاکستان کے ساتھ بلکہ ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے رہیں۔ کیونکہ دونوں جانب کے حالات انتہائی خراب ہیں۔ لیکن بہ حیثیت صدر پنجاب مسلم لیگ کے وہ چاہیں گے کہ کشمیر کا رشتہ پاکستان کے ساتھ ہی قائم ہو۔ میں نے جواب میں کہا کہ ہم ابھی ایک شخصی نظام کے غلام ہیں اور غلاموں کا فیصلہ صائب نہیں ہوتا ہمیں پہلے اپنی ریاست میں آزادی ملنی چاہئے اس کے بعد ہی ہم اس نازک ترین فیصلے کی ذمہ داریوں سے عہدہ برہو سکتے ہیں۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ ہماری تحریک کے متعلق ماضی میں مسلم لیگ کا جو بھی رویہ رہا وہ ہمارے فیصلے پر اثر انداز نہ ہو گا۔ اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو سے دوستی اور کانگرس کی وہ امداد جو اس نے ہماری تحریک کو دی ہے، ہمارے فیصلے پر اثر انداز نہیں ہو گی۔ اگر ہم یہ محسوس کریں کہ چالیس لاکھ کشمیریوں کا مستقبل پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے سے ہی روشن ہو سکتا ہے۔ تو ہم اس سے گریز نہ کریں گے۔ لیکن ہم کسی بھی صورت میں یہ پسند نہیں کریں گے کہ ہم پر کوئی فیصلہ ٹھونسا جائے۔

ڈاکٹر تاثیر نے اپنی گفتگو میں پاکستان سے الحاق کرنے پر سخت زور دیا۔ اور اس سلسلے میں ہمیں جلد قدم اٹھانے کی ترغیب دی۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ وقت اس اہم سوال کا فیصلہ کرنے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ ہم ابھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ مستقبل میں ہندوستان اور پاکستان میں کس قسم کے نظام کا نقشہ ابھرے گا اور دونوں ممالک میں حالات کیا رخ کیا اختیار کریں گے؟ اس وقت آگ کے شعلے ان دونوں مملکتوں کو آگ کی لپیٹ میں لے چکے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ آگ بجھانے میں کامیاب بھی ہو سکتے ہیں؟ ان حالات میں ہم سے توقع رکھنا کہ ہم فوراً اپنے مستقبل کا تعین کریں، قرین انصاف نہیں ہے۔ ہمیں اس وقت تک انتظار کرنا ہو گا جب تک آگ بجھ نہیں جاتی۔ کیونکہ ہم امن و سکون کے ماحول میں ہی اس سوال کو مناسب طریقے سے حل کر سکتے ہیں۔ یہ فیصلہ نہ صرف ہماری موجودہ نسل پر ہی اثر انداز ہو گا بلکہ آنے والی نسلوں پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔ دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم کو ابھی مہاراجا کی شخصی حکومت کے چنگل سے آزاد ہونے کا موقع فراہم کیا جائے تاکہ بعد میں یہاں کے ہندو، مسلمان، سکھ مل بیٹھ کر کر سکیں گے کہ وہ ہند سے رشتہ جوڑیں۔ پاکستان سے الحاق کریں یا آزاد رہیں۔ اس لیے اس وقت اس سوال کا فیصلہ کرنے کے لیے ہم پر دباؤ ڈالنا ہم پر زیادتی ہے۔ وقت آنے پر یہاں کے لوگ اس سوال کا فیصلہ کریں گے اور دونوں مملکتوں کو یہاں کے عوام کی خواہشات کا احترام کرنا ہو گا۔ اس پر ڈاکٹر تاثیر بولے کہ ہم تو اس بات کا تہیہ کر چکے ہیں کہ ریاست کشمیر پاکستان کا ایک

www.taemeernews.com

بن کر رہے گی۔ میں نے جواباً کہا کہ کشمیری عوام نے تو یہ حق آپ کو نہیں سونپا۔ ۱۹۳۱ء میں جب ہم نے تحریک کشمیر شروع کی تو ہم نے کسی بھی طاقت کو، چاہے وہ مسلم غلبے کی ہو یا ہندو اکثریت کی، یہ اختیار نہیں دیا ہے کہ وہ ہمارے مستقبل کا فیصلہ کرے۔ ہم اپنی تقدیر اپنے ہاتھوں سے بنائیں گے کسی دوسرے کے ہاتھوں میں یہ امانت سپرد نہ کریں گے۔ اس پر ڈاکٹر ثاثیر بولے کہ آپ اس صورت میں ہمیں تحریری طور پر یقین دلائیں کہ آپ وقت آنے پر ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ کرنے پر رضامند ہوں گے۔ میں نے جواب دیا کہ یہ تو حالات پر منحصر ہوگا کہ یہاں رہنے والے باشندوں کی آزادانہ رائے اور رضا پر۔ میں ان سے یہ حق پہلے سے ہی چھیننا نہ حقدار ہوں نہ روادار۔ تاثیر صاحب اس پر جھلاہٹ کا شکار ہو گئے اور انھوں نے تحکمانہ لہجے میں، جس میں طاقت کا غرور جھلک رہا تھا، کہا کہ اگر میں ان کا کہنا ماننے پر راضی نہیں تو وہ پھر "دوسرے ذرائع" استعمال کریں گے۔ مجھے بھی اس پر غصہ آ گیا اور میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا کہ آپ جو چاہیں کریں۔ لیکن اگر آپ نے زور زبردستی کا راستہ اختیار کیا تو آپ پھر ہماری لاشوں پر کشمیر حاصل کر سکتے ہیں۔ بہرحال شیخ صادق حسن اور عشائی صاحب نے مداخلت کی اور ہنسی مذاق میں یہ ناخوشگواری دور کرنے کی کوشش کی۔ معاملہ وہیں پر ختم ہو گیا۔ البتہ دونوں نے مجھے لاہور آنے اور وہاں جناح صاحب سے ملنے اور روبرو گفتگو کرنے کی دعوت دی۔ میں نے دعوت قبول کر لی لیکن مجھے لاہور جانے سے پہلے دہلی کا رخ اختیار کرنا پڑا۔ میری اسیری کے زمانے میں مجھے آل انڈیا اسٹیٹس پیوپلز کانفرنس کا صدر چن لیا گیا تھا۔ چونکہ یہ کارروائی میری عدم موجودگی میں عمل میں آئی تھی۔ اس لیے اپنی نئی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے وہاں میرا جانا ضروری تھا۔ اور پھر ریاستوں کو درپیش اہم ترین معاملات پر غور کرنے کے لیے میں نے کانفرنس کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس بھی بلایا تھا۔ مبادا پاکستان کے رہنماؤں کو میرے دہلی جانے سے کوئی غلط فہمی ہو میں نے اپنے اس قصد سفر کی اطلاع پاکستان کے وزیر اعظم کو دیدی اور یہ بھی کہلا بھیجا کہ دہلی سے واپسی پر میں بذات خود ان سے ملنے کے لیے آؤں گا اور اپنا نقطہ نظر ان کے سامنے پیش کروں گا۔ اس کے علاوہ دہلی روانہ ہوتے ہوئے میں نے اپنے ایک معتمد ساتھی خواجہ غلام محمد صادق کو پاکستان کے رہنماؤں کے ساتھ تبادلہ خیالات کے لیے لاہور بھیج دیا۔ میں ہوائی جہاز کے ذریعے دہلی پہنچا۔ جواہر لال کے ساتھ جیل کے باہر یہ میری پہلی ملاقات تھی وہ اب وزیر اعظم بن گئے تھے۔ لیکن وہ دوستوں کے دوست بھی تھے۔ چنانچہ انھوں نے رسوم و آداب کی تمام قیود نظر انداز کرتے ہوئے بذات خود دہلی کے ہوائی اڈے پر میرا استقبال کیا اور مجھے گارڈ آف آنر کی سلامی بھی پیش کی گئی۔ مجھے دہلی میں وزیر اعظم کے خاص مہمان کی حیثیت سے ان کی ہی رہائش گاہ پر ٹھہرایا گیا اور وہاں میں نے ایک اخباری کانفرنس میں بتایا۔

www.taemeernews.com

"کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ وہاں کے عوام کسی بیرونی مداخلت کے بغیر اور امن سکون کی فضا میں کرنا چاہتے ہیں۔ اگر کسی طرف سے ہم پر کوئی زبردستی کا فیصلہ ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تو ہم بغاوت کریں گے۔ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ وہاں کے مہاراجہ کو نہیں عوام کو کرنا ہے اور جب تک ان کو اندرونی طور پر آزادی نہیں ملتی وہ کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہیں۔"

ایک طرف تو ہندوستانی رہنماؤں کا یہ رویہ تھا۔ جس میں ممکن ہے ان کی دور اندیشی کی مصلحتیں بھی شامل رہی ہوں دوسری طرف پاکستانی حکمرانوں کو عجیب پریشانی نے گھیر رکھا تھا۔ جناح صاحب اور مسلم لیگ نے کشمیر کی تحریک کے تئیں جو معاندانہ اور مخالفانہ روش اختیار کر رکھی تھی اس نے ان میں ایک احساس جرم پیدا کر دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں محسوس کرتے تھے کہ اگر کشمیریوں سے آزادی کے ساتھ الحاق کے معاملے پر رائے حاصل کر لی گئی تو صوبہ سرحد کے برعکس کشمیر میں فیصلہ ان کے خلاف ہوگا۔ کیونکہ نیشنل کانفرنس کی مقبولیت اور عوامی قوت کا خوب اندازہ کر چکے تھے۔ اسی لیے وہ مہاراجہ کو ہی گانٹھ کر کشمیر کو ہڑپ کر لینا چاہتے کشمیری عوام اور ان کے نمائندوں سے بات چیت کرنے میں ہیٹی سمجھتے تھے۔ ادھر مہاراجہ نے تذبذب دکھانا شروع کیا اور اس کے دل میں اپنی الگ سلطنت قائم کرنے کا خیال رچ بس گیا۔ چنانچہ جب جون ۱۹۴۷ء میں ماونٹ بیٹن کشمیر آیا تو اس نے مہاراجہ کو صلاح دی کہ اس کی ریاست کی آبادی کی ترکیب ذلون تو پاکستان کے ساتھ الحاق کا تقاضا کرتی ہے۔ لہذا وہ اگر راضی ہے تو پاکستان سے الحاق کا اعلان کر دے لیکن مہاراجا نے ہچکچاہٹ دکھائی۔ اس پر ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ پھر ہندوستان کے ساتھ الحاق کر لو پیادہ فوج کا ایک ڈویژن فوراً یہاں بھجوا دوں گا تاکہ کسی کو شرارت کی نہ سوجھے لیکن مہاراجہ پھر بھی چپ رہا۔ اس کا دماغ اس قدر ماؤف ہو گیا تھا کہ جس وقت ماؤنٹ بیٹن دہلی واپس جانے کے لیے مہاراجا سے ملنے کے لیے آیا تو مہاراجا نے کہلوا بھیجا کہ میرا پیٹ خراب ہے اور ڈاکٹر نے مجھے کسی سے ملنے سے منع کر دیا ہے مہاراجا دراصل اس سیاسی بیماری کی آڑ میں کوئی دو ٹوک جواب ٹال رہا تھا۔ پاکستان کے حکمرانوں نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھے تو انھوں نے سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو معاملہ استصواب رائے پر آجائے جس میں پاکستان کی جیت کا امکان نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے کشمیریوں کو اس حق سے محروم کرنے کے لیے دراز دستی کا راستہ اختیار کرنے کی ٹھان لی۔ صوب سرحد کے استصوات سے متعلق یہ کہنا بے محل ہوگا کہ وہاں لیگ نے اس لیے جیت حاصل کر لی کہ خان عبدالغفار خان کی خدائی خدمت گار جماعت نے رائے شماری میں حصہ نہیں لیا۔ ان کے حصہ نہ لینے کی وجہ تو یہ بھی تھی کہ وہ ہوا کا رخ دیکھ رہے تھے اور کچھ یہ بھی کہ انھیں کانگریسی قیادت کی رویے سے مایوسی، محرومی اور بیزاری کا احساس ہو

www.taemeernews.com

گیا تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ عمر بھر کانگریس کا ساتھ دینے کے بعد کانگریسیوں نے انھیں اپنی گدی سنبھالتے ہی مگر مچھ کے آگے پھینک دیا ہے۔ اس لیے وہ استصوات میں پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان سے الحاق کی تجویز پیش کرنے پر خود بھی آمادہ اور مطمعن نہیں تھے۔ پاکستانی حکمرانوں کے انداز فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے پاکستانی حکومت کے ترجمان "ڈان" کراچی نے انہی دنوں یہ دھمکی آمیز اداریہ لکھا۔

"وقت آیا ہے کہ مہاراجا کشمیر کو بتایا جائے کہ وہ پاکستان میں شامل ہو جائے۔ اگر اس نے لیت ولعل سے کام لیا تو اس کے نہایت خطرناک نتائج برآمد ہونا ناگزیر ہوں گے۔"

اسی دوران پاکستان کے صوبہ سرحد اور نواحی علاقوں سے جسے قدیم زمانے میں گاندھارا کے نام سے پکارا جاتا تھا، قبائلیوں کے پرے کے پرے کشمیر کی طرف بڑھنے لگے اور مظفر آباد تک پہنچ گئے۔ سرینگر میں حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ مہاراجا کے پاس قلیل فوج تھی۔ جو اس نے مختلف علاقوں میں پھیلادی اور دفاعی انتظامات کرنے لگا۔ ادھر پونچھ اور میرپور وغیرہ میں جلسے منعقد ہوئے جن میں تجاویز منظور ہوئیں۔ ان تجاویز کے ذریعے مہاراجا سے استدعا کی گئی کہ وہ ریاست کا الحاق پاکستان سے کرے۔ پونچھ میں جب حالات نے پلٹا کھایا تو مہاراجا کو مشورہ دیا گیا کہ وہ خود پونچھ کا دورہ کرے۔ چنانچہ مہاراجا اپنی فوج کے انگریز چیف آف دی سٹاف جنرل اسکاٹ کے ساتھ وہاں چلا گیا۔ پونچھ پلندری وغیرہ کے اکثر لوگ فوجی ملازمت میں تھے کچھ ریاستی اور کچھ ہندوستانی فوج میں۔ کیونکہ پونچھ فوجی بھرتی کا بڑا زرخیز میدان تھا۔ وہاں کے سابق اور موجودہ فوجیوں نے اپنی وردی میں ملبوس ہو کر اور ان پر اپنے میڈل چمکاتے ہوئے فوجی طریقے پر مہاراجا کا پرجوش استقبال کیا۔ لیکن بدقسمتی سے مہاراجا کی سطح بین نگاہیں تہہ تک نہ جا سکیں اور اس نے رسمی استقبال کا بالکل غلط مفہوم اخذ کیا۔ اس نے ان کی محبت کا جواب غرور اور نخوت سے دیا۔ پاکستان سے الحاق کرنے کا جو مطالبہ انھوں نے کیا تھا مہاراجا نے اس کو گستاخی پر محمول کیا اور انھیں مزہ چکھانے کے لیے اپنی فوج بھیج کر شدید مظالم توڑے۔ گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ گھروں کو آگ لگوا دی گئی اور عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ کشمیر فوج میں وہاں کے لوگ ملازم تھے ان میں واقعات سے بڑی تشویش پھیل گئی۔ ان واقعات کی صدائے بازگشت ہمارے کانوں تک بھی پہنچی۔ ہم نے بھی وہاں حالات کا مشاہدہ کرنے کے لیے اپنے کچھ نمائندے بھیجے۔ یہ نمائندے واپس آئے تو انھوں نے دردناک واقعات کی بڑی دلگداز رپورٹ پیش کی۔ چنانچہ ہم نے بھی ان مظالم کے خلاف زبردست احتجاج کیا اور حکومت کو دراز دستیاں بند کرنے کی صلاح دی۔ میں نے دہلی میں ۱۲۔اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جب قبائلی حملہ آور مظفر آباد تک پہنچ چکے تھے۔ پونچھ کے سوال پر ایک اخباری کانفرنس میں کہا۔

www.taemeernews.com

"پونچھ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ مہاراجہ کے مظالم کا براہ راست نتیجہ ہے وہاں کے لوگوں کو ان مظالم کے خلاف احتجاج کا پیدائشی حق حاصل ہے۔ اور ان کو اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اپنے حقوق کی بازیافت کے لیے تحریک شروع کر رکھی ہے۔ اور مہاراجا نے ان پر فوجی یلغار کر کے وہاں حالات کو تباہی کے دہانے پر لایا ہے۔"

میں نے مسلمانان کشمیر کی نفسیاتی کیفیت کی تصویر پیش کرتے ہوئے کہا۔

"پنجاب کے مسلم اکثریت والی ریاست کپور تھلہ میں اب ایک مسلمان نظر نہیں آتا۔ یہی حال الور، بھرتپور وغیرہ ریاستوں کے مسلمانوں کے ساتھ ہوا ہے اس لیے کشمیر میں اگر کچھ لوگ ان اندیشوں میں گرفتار ہیں کہ ان کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوگا تو اس کو ہمدردی سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔"

ادھر مہر چند مہاجن اور ان کے نائب رام لال بترہ نے جو ایک پنجابی اور کٹر آریہ سماجی تھا، کشمیری پنڈت رہنماؤں کو بلا کر انھیں بندوقیں اور دوسرے اسلحہ جات کی پیش کش کی تاکہ وہ اپنی حفاظت کر سکیں۔ خدا کا شکر ہے کہ کشمیری پنڈت رہنما مہر چند جی کے اس جھانسے میں نہیں آئے۔ انھوں نے اپنے نادان مہربانوں کو جواب دیا کہ ان کی حفاظت کے لیے ہتھیاروں سے زیادہ اکثریت کی خوشنودی کی ضرورت ہے۔ اس لیے وہ ہتھیاروں کے اس تحفے کو اپنے ہی پاس رکھنے دیں۔

حکومت برطانیہ نے ریاستوں کے سربراہوں کو یہ اختیار دیا تھا اگر کسی وجہ سے وہ یوم آزادی یعنی ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء تک اپنی ریاستوں کے مستقبل کا فیصلہ نہ کر پائیں انھیں دونوں مملکتوں کے ساتھ کچھ عرصہ کے لیے جوں کا توں معاہدہ (STAND STILL AGREEMENT) کر لینا چاہیئے۔ تاکہ رسل و رسائل اور ڈاک و تار کا سلسلہ برقرار رکھا جائے۔ جیسا کہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ مہاراجا نے پاکستان کے ساتھ تو معاہدہ کر لیا لیکن ہندوستان نے معاہدہ پر دستخط کرنے کے لیے یہ شرط لگائی کہ مہاراجہ کو پہلے سیاسی قیدیوں کو رہا کرنا چاہیئے۔ مہاراجا اس پر راضی نہ ہوا اس لیے ہندوستان کے ساتھ معاہدہ نہ ہو سکا۔ پاکستان کو اس معاہدہ کی رو سے ڈاک و تار کے شعبے پر بالادستی حاصل ہو گئی۔ چنانچہ سرینگر کے ڈاک خانے اور تار گھروں پر پاکستان کا جھنڈا لہرایا گیا اور ملازموں سے پوچھا گیا کہ وہ ہندوستان میں جانا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ اکثر مسلمان ملازموں نے جب پاکستان کا سبز ہلال پرچم لہراتے دیکھا تو وہ سمجھے کہ الحاق کا فیصلہ ہو چکا ہے اور انھوں نے اپنی رضا پاکستان کے حق میں ظاہر کی۔ لیکن معاہدے کی رو سے وہ چھ مہینے کے اندر اندر اپنے اس چناؤ OPTION کو بدل بھی سکتے تھے۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ جب پانسہ پلٹا تو ہندوستان نے ان ملازموں کی رائے جاننے کی پرواہ نہیں کی۔ الٹا ان بے

www.taemeernews.com

چاروں کو ملازمت سے ہی نکال باہر کر دیا۔ یہ بات بھی شروع میں ہی میرے اور ہندوستان کے درمیان تلخی کی ایک وجہ بن گئی۔

پنڈت رام چند کاک کا ریاست کی وزارت عظمیٰ تک پہنچ جانا کمال کی بات تھی۔ انھوں نے محکمہ آثار قدیمہ میں ایک معمولی عہدہ سے ملازمت شروع کی تھی بعد میں ریاست کے چیف سکریٹری، وزیر حضور اور وزیر اعظم کے منصب پر فائز ہوئے۔ سر بی۔این۔راؤ کے علاوہ جو بھی وزیر اعظم کشمیر آیا وہ زیادہ دیر تک یہاں ٹک نہ سکا۔ سر مہاراج سنگھ آئے اور چند ہی مہینوں میں بستر ہ گول کر کے چلے گئے۔ یہی حال کرنل ہاکسر کا بھی ہوا۔ ان کے بعد رام چند کاک وزیر اعظم بنائے گئے۔ یہ کشمیری بولنے والے پہلے شخص تھے جو ڈوگرہ شاہی میں وزارت عظمیٰ کے مرتبے تک پہنچ پانے میں کامیاب ہوئے۔ تھے تو وہ کشمیری پنڈت لیکن اپنے معزز طبقے کی نہ تو ان میں حلیمی تھی نہ نرمی اور نہ انکسار۔ یہ بڑے تند خو اور اکڑفوں کرنے والے سجن تھے انہی کے زمانہ اقتدار میں بیگ صاحب کو مہاراجے کی حکومت سے استعفیٰ دینے کے سوائے کوئی اور چارہ کار نظر نہیں آیا تھا۔ اور انہی نے میاں احمد یار خان کو ساز باز سے اپنے شیشے میں اتار لیا تھا۔ اور پارٹی کے فیصلے کے خلاف بیگ صاحب کی جگہ سنبھالنے پر تیار کر لیا تھا۔ رام چند کاک کے تعلقات مہاراجا کے ساتھ کس قسم اور نوعیت کے تھے۔ وہ تو میں بتا نہیں سکتا لیکن یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ پاکستان کے ارباب اقتدار کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے خاصے تھے۔ غالباً اپنی فہم و فراست اور دور اندیشی کے سبب وہ بھانپ گئے تھے کہ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور اس کی جغرافیائی حیثیت ایسی ہے کہ یہ پاکستان کے ساتھ آخر کار الحاق پر مجبور ہو جائے گا۔ اس لیے وہ اپنا راستہ ہموار کرنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے جناح صاحب اور لیاقت علی خان سے بھی ملاقاتیں کی تھیں۔ مہاراجا اگرچہ رنگین طبعیت کے مالک تھے جہاں ان کے ذاتی اور خاندانی مفاد کا سوال آتا تھا، وہ بڑے سخت واقع ہوئے تھے۔ کاک صاحب کے یہ تیور دیکھ کر غالباً انھوں نے کاک صاحب کو وزارت عظمیٰ سے چلتا کر دیا۔ ۱۱۔ اگست ۱۹۴۷ء یعنی پاکستان کے قیام کے صرف چار دن پہلے وہ شیرگڑھی میں اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ مہاراجا کا ایک اے، ڈی، سی، ایک شکار گاہ سے جہاں مہاراجا شکار کھیلنے کے لیے گیا تھا ایک مہر بند لفافہ لایا۔ کاک نے لفافہ کھول کر خط پڑھا تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس میں ان کو فوری طور پر برخواست کرنے کے احکامات درج تھے۔ جب رام چند کاک کو نوشتۂ دیوار نظر آیا تو اس نے ہوائی جہاز کے ذریعے ریاست سے بھاگ جانے کی کوشش کی۔ لیکن مہاراجا نے اسے ہوائی اڈے پر ہی گرفتار کروا لیا۔ اور اس کی جگہ جنرل جنک سنگھ کو وزیر اعظم بنایا۔ پنڈت رام چند کو سرینگر سنٹرل جیل میں بند رکھا گیا اور ان کے خلاف کچھ مقدمے بھی دائر کر دیئے گئے۔ جنک سنگھ نے اس کے خلاف

www.taemeernews.com

بعض الزامات کی تحقیقات کے لیے ایک انکوائری بھی بٹھادی۔ خود مہاراجہ کشمیر کے تعلقات آریہ سماج کے ساتھ بہت گہرے تھے۔ اول اول تو مہاراجا کو بہت اعتدال پسند، لبرل اور مذہبی تعصب سے بالاتر سمجھا جاتا تھا۔ ان دنوں اس کا میل جول بھی زیادہ تر مسلمان مصاحبوں اور درباریوں کے ساتھ رہتا تھا۔ جن میں نواب خسرو جنگ، عبدالرحمن آفندی اور صاحب زادہ نور محمد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن جب ہندوستان میں شدھی اور تبلیغ کی تحریکوں کا زور ہوا اور خواجہ حسن نظامی نے اپنے اخبار "منادی" میں یہ خبر چھاپ دی کہ ایک بڑی ریاست کا ہندو مہاراجہ مذہب اسلام قبول کرنے ہی والا ہے تو ہندوؤں کے ایک بڑے طبقے میں یہ تشویش پھیلی کہ ہو نہ ہو یہ مہاراجا کشمیر ہی ہو گا۔ چنانچہ مہاراجا کے گرد انھوں نے زبردست گھیرا ڈالا ان کے تعلقات آریہ سماج کے ساتھ بڑھتے چلے گئے۔ آریہ سماج کے چالاک آبجتوں نے ان کے دل میں مسلمانوں کے خلاف شکوک و شبہات پیدا کئے اور آخر کار انھیں مسلمان دشمن بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان حالات میں جب نئے وزیر اعظم کی تلاش شروع ہوئی تو ان کی نگاہیں آریہ سماج کی صفوں کو تاکنے لگیں۔ اس پس منظر میں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت سردار پٹیل نے مہر چند مہاجن اور رام لال بترہ کو کشمیر میں اقتدار کے سنگھاسن پر بٹھوا دیا۔ الحاق کے بارے میں راجا کی دلی خواہش تھی کہ وہ اپنی ریاست کو دونوں نو زائد مملکتوں سے الگ رکھ کے آزاد رکھے۔ چنانچہ اس نے مسودہ الحاق پر دستخط کرنے سے پہلے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو جو خط لکھا اس میں اس بات کا اعتراف کیا کہ کشمیر کے جغرافیائی محل وقوع اور اس کی آبادی کی ہیئت ترکیبی کے پیش نظر اس کی اپنی خواہش آزاد رہنے کی تھی۔ بعد میں پاکستان نے اپنی کوتاہ اندیشی میں حملہ کر کے مہاراجہ کے اس خواب کو مسمار کر دیا اور خود اس کے الفاظ میں اس کے لیے "اس بات کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ وہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کر کے اس سے فوجی معاونت مانگے"۔ لیکن ان صریح واقعات کے باوجود فرقہ پرست ہندو پریس آج تک برابر چلاتا آیا ہے کہ میں کشمیر کا سلطان بننے کا خواب دیکھتا رہا ہوں۔ حالانکہ میں نے ریاست کی آئین ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں الحاق کے مسئلے پر تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے۔ اسی طرح فرقہ پرستی کے یرقان میں مبتلا لوگوں کو ہر چیز پیلی لگتی ہے انھیں حقائق سے تو کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ لیکن وہ گوئبلز کے اس فلسفے میں اعتقاد رکھتے ہیں کہ "جھوٹ کہے جاؤ، کہتے چلو، کچھ نہ کچھ تو چپک جائے گا اور بالآخر لوگ اس کو سچ ماننے لگیں گے۔" بہر حال یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں اکتوبر کے تیسرے ہفتے میں دہلی سے واپس سرینگر لوٹ آیا۔ صادق صاحب قبائلی حملے ۲۲۔ اکتوبر سے صرف ایک دن پہلے لاہور سے سرینگر پہنچ چکے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان سے بڑی مشکل سے وہ نکل پائے تھے کیونکہ وہ انھیں یرغمال بنا کر وہیں رکھنا چاہتے

www.taemeernews.com

تھے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ جب پاکستانی حکمران اپنے وطن کی سرزمین پر میرے نمائندے کے ساتھ میرے دورہ کراچی کی تفصیلات طے کر رہے تھے، ان کے بھیجے ہوئے حملہ آور کشمیر کی دھرتی کو روندنے اور کشمیریوں کے حقوق کو پامال کرنے کے لیے پیش قدمی کر رہے تھے۔ لاہور میں ان کی ملاقات پاکستان وزیر اعظم کے ساتھ نہ ہو سکی۔ اور انھیں صرف نواب افتخار حسین محمد وٹ جیسے دوسری صف کے لیڈر سے ہی ملنے پر اکتفا کرنا پڑا۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ وہ ہر قیمت پر یقین دہانی اور اعلان چاہتے تھے کہ کشمیر کا الحاق صرف پاکستان کے ساتھ ہی ہوگا۔ جو ہماری طے شدہ پالیسی کے مطابق ممکن نہیں تھا۔ اس سے قبل بخشی غلام محمد بھی نواب محمد وٹ، ممتاز دولتانہ وغیرہ سے مل آئے تھے۔ اور انھوں نے بھی یہی رٹ لگائی تھی۔ صادق صاحب کے ذریعے پاکستانی زعماء نے مجھے وہاں آنے کا بلاوا بھیجا وہ چاہتے تھے کہ میں کراچی جا کر محمد علی جناح سے ملوں اور خود ان کے ساتھ گفتگو کروں۔ آمد و رفت کا انتظام پاکستانی حکام نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ ایک صحافی جی۔ کے۔ ریڈی نے جو سری نگر سے "کشمیر ٹائمز" نامی اخبار نکالتا رہا تھا وہ پاکستان کی زبردست وکالت کر رہا تھا اور پاکستان بننے کے بعد وہاں کے تعلقات عامہ کا ناظم بن گیا تھا، بعد میں انکشاف کیا کہ میرے پاکستانی بلانے میں ان کی نیت صاف نہ تھی۔ وہ مجھے کسی نہ کسی طرح کراچی لانا چاہتے تھے۔ اور وہاں مجھے قید میں ڈال کر میرے نام پر پاکستان کے حق میں کشمیر کے لیے بیانات شائع کرانا چاہتے تھے۔ ریڈی نے ان کے منصوبوں کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

"ان کی اسکیم یہ تھی کہ جب شیخ صاحب کراچی پہنچیں گے تو ان کا شاندار استقبال کیا جائے۔ اگر وہ لیگی لیڈروں کے فریب میں آجائیں تو ٹھیک دوسری صورت میں کراچی میں جناح کے ساتھ ان کی ملاقات کے دو دن بعد کشمیر پر حملہ کرنے کی تیاری کی گئی تھی۔ چال یہ سوچی کہ اگر شیخ صاحب اپنی بات پر اڑے رہے اور قائد اعظم کی ترغیب و تحریص میں نہ آئے تو انھیں چپکے سے گرفتار کر کے کسی غیر معروف مقام پر لے جایا جائے اور جب وہ کسی جیل میں پڑے زندگی کے دن گذار رہے ہوں تو ان کی صدارت میں عارضی حکومت کا اعلان کر کے ان کے نام پر بیانات و اعلانات جاری کیے جائیں۔ اس طرح سے جب قبائلیوں کے غول کے غول کشمیر میں لوٹ مار کر رہے ہوں گے تو کشمیری یہی خیال کریں گے انھیں شیخ صاحب نے کشمیر بھیجا ہے۔ بہر کیف مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے۔ پاکستانیوں کی یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔"

ادھر فوجی محاذ پر ریاست کے لئے خطرات بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ مہاراجا کا چیف آف

www.taemeernews.com

اسٹاف ایک انگریز تھا۔ اس نے مہاراجا کی ۱۲ ہزار فوج کو مختلف اطراف میں جھونک دیا تھا۔ ایک ٹکڑی مظفر آباد کے متصل سرحد پر تعینات کی گئی تھی۔ یہ ٹکڑی مخلوط تھی اس میں ہندو ڈوگرے بھی تھے۔ اور پونچھ و میرپور میں جھونک دیا تھا۔ ایک ٹکڑی مظفر آباد کے متصل ڈوگرے بھی تھے۔ اور پونچھ و میرپور کے سدن قبیلے کے مسلمان بھی۔ پونچھ و میرپور کے لوگ پہلے سے ہی جلے بیٹھے تھے۔ وہ مظفر آباد کی پہاڑی چوٹیوں سے اپنے گھروں سے شعلے اٹھتے دیکھ رہے تھے اور جو مظالم ڈوگرہ ہندو فوج نے وہاں توڑے تھے اس کے خبریں بھی ان کو مل چکی تھیں۔ اس لیے ان کی وفاداری کے خیمے اکھڑ چکے تھے۔ چنانچہ جب قبائلی اس راستے سے سرحد کے اندر گھس آئے تو انھوں نے بغاوت کر دی اور قبائلیوں سے جا ملے۔ حملہ آوروں کی جس ٹکڑی نے ایبٹ آباد مانسرہ سرحد سے مظفر آباد پر حملہ کیا۔ وہ دو ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ ان میں محود، محمند، وزیری، آفریدی اور دوسرے قبیلوں کے لوگ شامل تھے اور کچھ تو افغانستان کے یاغی علاقے سے بھی آ گئے تھے۔ ان کی پشت پر رسل و رسائل کی فوجی تنظیم تھی اور وہ جب صبح کاذب کے دھندلکے میں کچھ پا پیادہ اور کچھ بسوں یا ٹرکوں میں مظفر آباد میں داخل ہوئے تو انھوں نے اسلام زندہ باد کے نعرے بلند کر کے مقامی آبادی کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مہاراجے کی چوتھی جے اینڈ بٹالین یہاں ایک ڈوگرہ لیفٹیننٹ کرنل نارائن سنگھ کی کمان میں تعینات تھی۔ فوج مسلح قبائلیوں کے مقابلے میں چند گھنٹوں سے زیادہ دیر تک نہ ٹک سکی۔ اور ان کا صفایا ہو گیا۔ مقامی ڈپٹی کمیشنر مہتہ مارا گیا اور اس کی بیوہ کرشنا کوئی ایک سال تک مقبوضہ کشمیر کے پناہ گزیں کیمپ میں رہی۔ بعد میں ہم نے اسے ہندوستان پہنچا دیا اور جواہر لال نہرو کے گھر میں اس کی خوب رسائی ہو گئی۔ قبائلی تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ ۲۲۔ اکتوبر کو مظفر آباد گر گیا اور ۲۳ کو چناری مہاراجا نے بر گیڈیر راجندر سنگھ کی کمان میں، جس نے کچھ عرصہ پہلے ہی جنرل سکاٹس سے چیف آف اسٹاف کا چارج حاصل کر لیا تھا، کچھ کمک مظفر آباد کی طرف روانہ کی۔ ان کی مٹ بھیڑ قبائلیوں کے ساتھ بونیار کے دیوان مندر کے پاس ہوئی۔ راجندر سنگھ خود بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے کام آئے۔ لیکن اس کی فوج کو شکست فاش ہوئی۔ ان میں سے کچھ تو مارے گئے اور کچھ دم دبا کے بھاگ گئے۔ ۲۴ اکتوبر کو قبائلیوں نے اوڑی پر قبضہ کر کے اسے لوٹ لیا۔ اب سری نگر کا راستہ بلا کسی مزاحمت کے کھلا تھا اور حملہ آور چاہتے تو چند گھنٹے میں وہاں پہنچ کر دم لیتے لیکن انھیں لوٹ مار کی حرص نے اندھا بنا دیا اور "سرینگر ہنوز دور است" ہو کر رہ گیا۔ ان دنوں ایک امریکی اخبار نویس مارگریٹ بروک وائٹ ان کے ساتھ تھی۔ اس نے اپنی کتاب " HALF WAY TO FREEDOM "میں قبائلیوں کی لوٹ کا ماجرا بیان کیا ہے۔ اس کے مطابق۔

www.taemeernews.com

"ان کی بسیں اور ٹرکیں مالی غنیمت سے لدی پھندی ایک یا دو دن میں واپس آجاتی تھیں تاکہ اور مٹھائوں کو لے کر پھر کشمیر لوٹیں اور اپنے مسلمان کشمیری بھائیوں کو آزاد کرانے کے اسی عمل کا اعادہ کرتے ہوئے بلا تفریق مذہب و ملت ہندو، سکھ اور مسلمان دہقانوں کو لوٹیں۔ قبائلیوں کی پیش قدمی سے ڈوگرہ فوج کا کیا حال ہوا، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بادامی باغ چھاؤنی میں تعینات ساڑھے اٹھارہ سو فوجی افسروں اور آدمیوں نے روپوش ہو جانے میں خیریت سمجھی اور بعد میں جب ہندوستانی افواج کی آمد پر انھیں چھپے ہوئے پایا گیا تو ہندوستانی فوج کے افسر بزدلی کے اس مظاہرے پر انگشت بہ دنداں رہ گئے۔ اور انھیں جنرل کلونت سنگھ نے جموں جانے کا حکم دیا۔"

۲۶۔ اکتوبر کو قبائلیوں نے مہورہ کے اس بجلی گھر کو تباہ کر دیا جو سرینگر کو برقی روشنی مہیا کرتا تھا اور اس طرح راجدھانی اندھیرے میں ڈوب گئی۔ کہا جاتا ہے کہ جب روم جل رہا تھا تو وہاں کا ظالم بادشاہ نیرو بانسری بجا رہا تھا۔ لیکن اس دن مہاراجا ہری سنگھ نے یہ کہاوت سچ کر دکھائی وہ دربار گڈھ سرینگر کے جگ مگ جگ مگ کرنے والے ہال میں اس وقت اپنے مصاحبوں اور حاشیہ نشینوں سے دسہرے کے جشن پر اشرفیوں کا خراج حاصل کر رہا تھا۔ اچانک ساری روشنیاں چلی گئیں اور اس کے ساتھ ہی مہاراجا کی سلطنت کا ستارہ بھی غروب ہو گیا قبائلی حملہ آوروں نے بارہمولہ کا رخ اختیار کیا جو پہاڑوں کے دامن میں دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر آباد ہے اور اس علاقے کی سب سے بڑی تجارتی منڈی رہی ہے۔ بارہمولہ سے سرینگر کا فاصلہ ایک گھنٹے سے زیادہ کا نہ تھا اور اس وقت بھی یہ راستہ برصغیر کے عمدہ ترین راستوں میں سے ایک تھا۔ یہاں کی آبادی سولہ ہزار کے قریب تھی۔ قبایلی چاہتے تو اسی دن سرینگر پہنچ سکتے تھے۔ لیکن بارہمولہ کے گھروں کو دیکھ کر ان کی آنکھیں چندھیا گئیں اور انھوں نے تین دن تک بارہمولہ میں زنا کاری، شکم پری اور لوٹ مار کا ایسا بازار گرم کیا کہ انھیں سرینگر کی یاد ہی نہ آئی۔ انہی تین دن میں ساری صورت حال کا پانسہ پلٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی قبائلیوں کی شبیہہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسخ اور غارت ہو کر رہ گئی۔ بارہمولہ کے شہری ان تمام دیہات اور چھوٹے قصبوں سے زیادہ خوش حال اور دولت مند تھے۔ جنھیں قبائلیوں نے تاراج کیا تھا۔ اس لیے ان کی رفتار رک گئی۔ یہ قتل و غارت، عصمت دری اور لوٹ مار میں مگن ہو گئے دو دن تک یہ بازار گرم رہا اور اس میں قبائلیوں نے مذہب کی تمیز روا نہ رکھی۔ ان کی خرمستی اس حد تک بڑھ گئی کہ انھوں نے یہاں کے عیسائی مشن ہسپتال میں چودہ دختران کلیسا یعنی یورپی راہباؤں تک کو اپنی دراز دستی کا نشانہ بنایا۔ سیٹ جوزف۔ مشن ہسپتال کی مدر سپریر جو بلجیم کی ایک راہبہ سسٹر میری اڈلیٹر یوڈ تھی کے علاوہ

www.taemeernews.com

تین نرسوں اور ایک انگریز جوڑے کو تہہ تیغ کر دیا۔ کئی انڈور بیمار موت کے گھاٹ اتارے اور ہسپتال کی دوائیوں تک پر ہاتھ صاف کیا۔ سکھ دوست تو خاص طور پر ان کا نشانہ بنے۔ چنانچہ اذیتوں کی تاب نہ لا کر عورتوں نے اپنی جان دے دی یا ان کے مردوں نے انھیں قطاروں میں لٹا کر ان کے سروں کو تن سے جدا کر دیا۔ ایک عجیب کسمپرسی اور ہائے وہو کا عالم تھا۔ یہ کشمیر کے مسلمانوں کا "سلطنت خداداد" پاکستان سے پہلا سابقہ تھا۔ مسلمانوں کے مکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ اور ان کے مال و اسباب کو لوٹا گیا۔ ایک مسلمان جولاہے غنی جو کی چادر چھین لی گئی۔ جب اس نے پوچھا کہ کیا یہی مسلمانوں کا شیوہ ہے تو اس کو گولی مار دی گئی۔ بارہمولہ میں ایک چھوٹا سا سنیما گھر بھی تھا اس کو ایک قحبہ خانے میں تبدیل کر لیا گیا۔ اور یہاں غیر مسلم عورتوں کے ساتھ مسلمان عورتوں کو بھی ہوس کا نشانہ بنایا گیا۔ ایک مقامی مسلمان رسول جو درزی نے دو سو قبائلیوں کو اپنے گھر دعوت پر بلایا۔ وہ کھا پی چکے تو انھوں نے عورتیں طلب کیں۔ خوش قسمتی سے عورتیں پہلے سے ہی گھر چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ کشمیری پنڈت عورتیں کانوں میں "ڈیجھرو" نام کا ایک زیور پہنتی ہیں جو سونے کا ہوتا ہے قبائلی درندے چھینا جھپٹی میں اس طرح سے یہ زیور کھینچ لیتے تھے کہ عورتوں کے کان بھی کٹ جاتے تھے۔ قبائلیوں نے کشمیری عورتوں کے قیمتی پھرن تک نہ چھوڑے وہ انھیں پہنے ہوئے بارہمولہ میں گھومتے پھرتے دیکھے اور قہقہے لگاتے دیکھے گئے۔

واقعہ یہ ہے کہ قبائلیوں کی یہ لوٹ مار کوئی اتفاقیہ واقعہ نہیں تھا۔ پاکستان بننے کے ساتھ ہی وہاں کے حکمرانوں کو خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں یہ قانون دشمن لوگ خود پشاور اور پاکستان کے دوسرے بڑے شہروں میں لوٹ کا بازار گرم نہ کریں۔ یہ لوگ قبایلی علاقوں سے برطانوی فوج کے چلے آنے کے بعد اپنے ذریعہ معاش سے محروم ہو گئے تھے اور پاکستان کے شہروں کی طرف حریصانہ نظریں اٹھا رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے انھیں کشمیر کا راستہ دکھایا اور انھیں بتایا گیا کہ وہاں انھیں نقد و جنس اور عورتوں کی صورت میں جو کچھ ملے گا وہ ان کا مال غنیمت تصور ہوگا۔ اس کا مقصد ایک تو خود اس آفت سے چھٹکارا حاصل کرنا اور دوسرا کشمیری عوام کو غلام بنانا تھا۔ چنانچہ جب بارہمولہ سے قبائلی آگے جانے کا نام ہی نہ لینے لگے تو عبدالقیوم خان نے قبایلیوں کے ایک بڑے پیر مانکی کو بارہمولہ بھیجا۔ جس نے انھیں آگے بڑھنے کی ترغیب دی۔ لیکن قبائلی اپنے لوٹ مار کے مال اور عورتوں کو کسی اور تحویل میں دینے پر راضی نہ تھے۔ چنانچہ ان میں سے بہت سے اپنا انعام لے کر واپس اپنے ٹھکانوں کی طرف جانے لگے۔

ادھر یہ حالات رونما ہو رہے تھے ادھر مہاراجا نے بوریا بستر باندھ کر اپنے جواہرات اور دیگر قیمتی اثاثہ کو صندوق میں بند کر کے ایک سو سے زیادہ گاڑیوں میں لاد دیا اور خود اس بھگوڑے

www.taemeernews.com

قافلے کی رہنمائی کرتے ہوئے ۲۵ - اکتوبر کو جموں کی طرف کوچ کرگیا۔ اس کے ساتھ اس کے نزدیکی رشتہ دار، مصاحب، احباب وغیرہ کے علاوہ اس کے خاندانی مندر گدادھر کی طلائی مورتی بھی تھی۔ جب یہ قافلہ ادھمپور پہنچا تو مہارانی تارا دیوی نے اپنے بال بکھیر کر اس مورتی کو اپنی گود میں لے لیا۔ جب مقامی ہندو آبادی ایک کھلی کار میں مہارانی کو مورتی لیے ہوئے دیکھ رہی تھی تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ جذبات کا پارہ کہاں پہنچا ہو گا۔ ان کا خون ابال کر مہارانی وہاں مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلنے کا ناٹک کھیلنا چاہتی تھی اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ مہاراجا کی بزدلانا حرکت سے کشمیری عوام کو بڑا دکھ ہوا۔ کیونکہ ان پر ایک سو برس راج کرنے کے بعد اور ان کے خون پسینے کی کمائی سے عالی شان محلات تعمیر کرنے کے بعد اپنے خاندان کے نمائندے کی حیثیت سے اس نے آزمائش کی گھڑی میں انھیں یکہ و تنہا چھوڑ دیا تھا۔ یہ بزدلانہ فرار مہاراجا کی اس شبیہہ کو ریزہ ریزہ کرنے کا باعث بن گیا جو اس نے بڑی محنت اور لاگت سے بنائی تھی۔ وہ اپنے آپ کو مہاراجا گلاب سنگھ کا جانشین کہتا تھا۔ اور اس کو "لیفٹننٹ جنرل راجیشور مہاراجا ادھیراج" کا بھاری بھرکم خطاب بھی ملا ہوا تھا۔ اب اس کی اصلیت ظاہر ہوگئی تھی۔ وہ کشمیریوں سے صرف استحصال کا رشتہ رکھتا تھا۔ چنانچہ کشمیریوں کے ساتھ اس کی اس جذباتی عدم وابستگی کا مظاہرہ اس وقت بھی ہوا جب اس نے وصیت کی کہ مرنے کے بعد اس کی راکھ صرف جموں شہر کی فضاؤں میں بکھیر دی جائے۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت کی قیمت کے مطابق فرار ہوتے وقت اس نے کروڑوں کی مالیت کے ہیرے جواہرات موتی اور نیلم اپنے ساتھ رکھ لیے تھے۔ عوامی حکومت نے اگرچہ بعد میں سونے چاندی کے ظروف اور کچھ نوادرات ان کے یہاں سے واپس لا کر توشہ خانہ میں محفوظ کرا دیئے لیکن بہت سا مال و متاع ان کے پاس ہی رہا۔ ان سے وہ تخت بھی حاصل کرلیا گیا جس پر سونے کا بڑا زبردست جڑاؤ کام ہے۔ لیکن بعد میں میر قاسم نے اپنے دور میں اس تخت کو امر محل جموں میں نمائش کے لیے رکھنے کے بہانے کرن سنگھ کے حوالے کر دیا۔ بہرحال اس نازک گھڑی پر رونے پیٹنے کا پارہ کسے تھا اس وقت سب سے اہم کام لوگوں کے حوصلے حواس اور MORALE قائم رکھنا تھا۔ مہاراجا کی اس حرکت کے بعد حکومت کے وہ سبھی چھوٹے بڑے اہلکار جو جموں کے رہنے والے تھے اس کے پیچھے پیچھے جموں کی طرف بھاگ گئے۔ انتظام و انصرام پر فالج گر گیا۔ اب نیشنل کانفرنس کے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا کہ وہ اپنے رضا کاروں کی مدد سے انتظامیہ کو سنبھالے ہم نے اس انتہائی نازک موقعہ پر یہ ذمہ داری قبول کرلی اور کشمیر کے اقتدار کو، جسے مہاراجا شہر کے چوک میں چھوڑ کر رفوچکر ہو گیا تھا، اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ادھر پاکستان کے کچھ ایجنٹ سرینگر میں مصروف کار تھے۔ اگرچہ قبائلیوں نے انھیں وقت پر نہ پہنچ کر مایوس کر دیا تھا لیکن انھوں نے

www.taemeernews.com

ایک خفیہ میٹنگ میں طے کیا کہ وہ شہر کے تمام پلوں خاص طور پر ہوائی اڈے جانے والے پلوں کو تباہ کر ڈالیں گے تا کہ ہندوستانی افواج کی آمد کی صورت میں ان کی نقل و حرکت مفلوج ہو کر رہ جائے۔ ہمیں اس بات کی اطلاع مل گئی اور ہم نے نیشنل کانفرنس کے رضا کاروں کو پلوں اور دوسری تنصیبات کے پہرے پر متعین کر دیا۔ ادھر قبائلیوں کی لوٹ مار کی خبروں نے بھی ساری وادی میں اشتعال کی لہر پیدا کر دی تھی اور سبھی ہندو، مسلمان نیشنل کانفرنس کی قیادت میں قومی عزت کی حفاظت کے لیے کمر بستہ ہو گئے تھے۔ جن لوگوں کے پاس جس نوع کے بھی ٹوٹے پھوٹے نجی ہتھیار تھے ان سے اپیل کی گئی کہ وہ انھیں نیشنل کانفرنس کے حوالے کر دیں۔ جن لوگوں کے پاس موٹر کار یا کسی اور قسم کی سواریاں تھیں ان سے بھی یہی استدعا کی گئی۔ رضا کاروں کو ہتھیار استعمال کرنے کی ترغیب دینے کے لیے رات دن مختصر سی ٹریننگ دی گئی اور اس طرح کشمیر ملیشیا کی بنیاد پڑ گئی۔ مغلوں، پٹھانوں، سکھوں اور ڈوگروں نے صدیوں سے کشمیریوں کو غیر مسلح کر کے انھیں عسکری تربیت سے دور رکھا تھا۔ لیکن اب آزمائش کی اس گھڑی میں ان کا جذبہ، حب وطن ان کی بہادری کے دبے ہوئے سرچشموں کو ابال رہا تھا۔ رضا کاروں میں ہندو، مسلم، سکھ نوجوانوں کے علاوہ لڑکیاں بھی شامل ہوئیں اور ان سب نے پلوں، بینکوں اور دیگر اہم دفاتر پر پہرہ دیا عجیب جذبہ تھا۔ ان میں بھی۔ وہ دن رات اسی دھن میں لگے رہتے۔ کھانا ملے یا نہیں، پاؤں میں جوتے ہوں یا نہیں، لیکن وطن کی محبت سے اتنے سرشار تھے کہ ذاتی آرام و آسائش کا بالکل خیال ہی نہیں رہا تھا۔ شائد شاعر نے انہی مجاہدوں کے متعلق کہا تھا۔

خیریت جاں، راحت تن صحبت داناں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہل ہوس کی

رضا کاروں کو ہدایت تھی کہ وہ غیر مسلم بھائیوں کے گھروں پر کڑا پہرا دیں اور ان کو یقین دلائیں کہ جب تک وہ ان کے دروازے کی نگہبانی کر رہے ہیں کوئی قبائلی ان کی لاشوں پر سے ہی دہلیز کو پار کر کے گھر میں گھس سکتا ہے ان دنوں نہ ریڈیو اسٹیشن تھا اور نہ نشر و اشاعت کے دوسرے وسائل، ہر روز شام پرتاپ پارک میں لوگ جمع ہو جاتے تھے میں ان کو دن بھر کے تازہ حالات سے آگاہ کرتا اور دوسرے دن کے لیے ہدایت دیتا تھا۔ ان کو حوصلہ دینے کے لیے میں ان کی وطن پرستی کے جذبے کو بھی مہیز کرتا تھا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ لوگ ان دنوں ایک جان ہو کر مرنے مارنے پر تیار تھے۔

اس بدلی ہوئی صورت حال میں اب کچھ اہم سیاسی اقدام ناگزیر بن گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ پاکستان اب ہمارے ضمیر کا چراغ اور ہمارے ذہن کی روشنی بجھانا چاہتا تھا۔ تا کہ خوف اور دہشت کی تاریکی میں وہ ہماری متاع آزادی اور ہمارے حق خود ارادیت پر شب خون مارے۔ اولیت اس

www.taemeernews.com

بات کو تھی کہ ہم اپنا قومی وجود اس یلغار سے بچانے کی کوشش کریں۔ اس لیے ہم اب امداد کے لیے ہندوستان کی طرف نگاہیں اٹھا رہے تھے۔ اس جانب بہت سے مخلص دوستوں نے ہمارا ہاتھ بھی بٹایا۔ جن میں مرحوم سیف الدین کچلو بھی تھے۔ وہ ان دنوں سرینگر میں تھے۔ وہ حالات کی نزاکت بھانپ کر الٹے پاؤں دلی چلے گئے اور وہاں کانگریسی رہنماؤں پر زور دیا کہ وہ کشمیر کو بچانے کے لیے کوشش کریں۔ لیکن ہندوستان کی حکومت کے سامنے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مہاراجا نے رسمی طور پر ہندوستان سے الحاق نہیں کیا تھا۔ اور ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ جب تک ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا کوئی قانونی رشتہ قائم نہیں ہوتا، ہندوستان کی فوجوں کو کشمیر بھیجنا ایک قانونی جرم ہو گا۔ ان کا نظریہ تھا کہ اس صورت میں پاکستان بھی ایسا کر سکتا ہے اور چونکہ ابھی ہندوستان اور پاکستان کی فوجوں کی سربراہی انگریزوں کے ہاتھ میں ہے اس لیے ان کا آپس میں لڑنا ممکن نہ ہو گا اور وہ دونوں طرف سے کمان چھوڑ دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس لیے فوجی امداد بھیجنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ مہاراجا کشمیر مسودہ الحاق پر دستخط کر دیں۔ مہاراجا ہری سنگھ نے اس معاملے پر تذبذب کا مظاہرہ کیا تھا۔ جون کے وسط میں ماؤنٹ بیٹن نے سرینگر آ کر انھیں مشورہ دیا کہ وہ الحاق کے بارے میں کوئی رائے قائم کریں اور جاننے کے بعد دو میں سے ایک مملکت کے ساتھ الحاق کر لیں۔ سردار پٹیل نے ماؤنٹ بیٹن ہی کی معرفت کہلا بھیجا تھا کہ اگر مہاراجا ۱۵۔ اگست سے پہلے پاکستان میں ہی جانے کا فیصلہ کرے تو ہندوستان اسے ایک غیر دوستانہ قدم تصور نہ کرے گا۔

ایک اور رکاوٹ مہاتما گاندھی کی ذات تھی۔ اس بات پر دو رائے تھی کہ کیا گاندھی جی فوج بھیجنے کی اجازت دیں گے یا نہیں؟ چونکہ میں ہندوستانی رہنماؤں سے امداد طلب کرنے کے لیے دلی آیا ہوا تھا اس لیے میں نے اس معاملے پر گاندھی جی سے بات چیت کی۔ میں نے گاندھی جی سے کہا کہ کشمیر کی لڑائی زمین کے لیے نہیں بلکہ انہی آدرشوں کو بچانے کے لیے ہے جن کی علمبرداری اور ترجمانی وہ کرتے ہیں۔ جن کا پرچار انھوں نے عمر بھر کیا ہے اور جن کے لیے وہ اس وقت بھی چٹان بن کر باد مخالفت کی تیز جھونکوں کے آگے ڈٹ گئے ہیں۔ لہٰذا ہندوستان کو اس وقت کشمیری عوام کے امداد سے ہاتھ نہیں کھینچنا چاہئے۔ جبکہ کشمیری عوام حملہ آوروں کے ظلم و جبر کے خلاف بے جگری سے لڑ رہے ہیں۔ کیونکہ اگر ہندوستان نے امداد نہ دی تو ایسا کرنا کشمیر کے لوگوں سے زیادہ ان آدرشوں کے ساتھ بے انصافی ہو گی جو ہمیں مشترکہ طور پر عزیز ہیں۔ چنانچہ گاندھی جی نے ازراہ شفقت اس استدعا کو منظور کر لیا۔ اور فوج کشمیر روانہ کرنے کی اجازت بخشی۔ ادھر مہاراجا جموں پہنچ گیا تھا۔ مگر اس کے کیمپ میں ایسی بھگدڑ اور سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی اس کا اندازہ اس کے وزیر اعظم مہر چند مہاجن کے اس بیان سے لگایا جا

www.taemeernews.com

سکتا ہے۔

"مہاراجے کے مشورے سے طے پایا کہ کسی ہوائی جہاز کا انتظام ہو سکے تو دہلی جا کر فوری طور پر امداد لانے کی کوشش کی جائے۔ ورنہ پاکستان جا کر ہتھیار ڈال دیئے جائیں۔۔"

(مہاجن۔ کشمیر کا ہند سے الحاق۔ صفحہ ۱۶)

مہاراجا کی حالت ایسی غیر تھی کہ اس نے ۲۶۔ اکتوبر جموں پہنچنے پر اپنے خاص مصاحبین کو ہدایت دی تھی کہ اس کو اس کے خواب استراف سے صرف اسی صورت میں جگایا جائے جب وی، پی مینن واپس آئے۔ کیونکہ اس کا مطلب ہو گا کہ ہند نے الحاق منظور کیا ہے۔ دوسری صورت میں اس کو نیند ہی کی حالت میں اپنے پستول سے کنپٹی میں گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے۔ حکومت ہند نے اس مرحلے پر ریاستوں کے محکمے کے سیکریٹری وی۔ پی مینن کو روانہ کیا۔ ان کی جیب میں دستاویز الحاق کا مسودہ تھا۔ وہ ۲۶۔ اکتوبر کو ہی اس پر مہاراجا کے دستخط کروا کے واپس دہلی پہنچ گئے۔ ان کا استقبال کرنے کو خود سردار پٹیل ہوائی اڈے پر گئے تھے۔ اور انھیں اپنے ساتھ جواہر لال کی کوٹھی پر لے آئے۔ میں بھی وہیں رک گیا۔ ان دنوں پنڈت جواہر لال یارک روڈ کی کوٹھی نمبر ۱ میں رہائش پذیر تھے اور میں ان کے مہمان کی حیثیت سے وہیں مقیم تھا۔ وی، پی مینن اور مہر چند مہاجن جس وقت ان کے پاس پہنچے میں کوٹھی میں ہی موجود تھا۔ مہر چند مہاجن پنڈت جی کے ساتھ گفتگو کرنے کے لیے اندر کے کمرے میں چلے گئے۔ ان کے اپنے الفاظ میں انھوں نے پنڈت جی سے کہا۔

"فوج دیجئے، الحاق کیجئے اور جو بھی اختیارات چاہیئے عوامی پارٹی (نیشنل کانفرنس) کو دیجئے۔ لیکن آج ہی ہوائی جہاز سے فوج سرینگر بھیج دیجئے۔ ورنہ میں جناح صاحب کے پاس جا کر مصالحت کروں گا۔"

بھلا جواہر لال ایسی باتوں کی تاب لانے والے کہاں تھے۔ یہ سنتے ہی آگ بگولہ ہو گئے۔ جواہر لال کو جو غصہ آتا تھا تو غضب ہو جاتا تھا۔ انھوں نے مہاجن صاحب سے نہایت درشت لہجے میں کہا کہ پاکستان کے سمجھوتے کا شوق ہے تو فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ پنڈت جی غصے میں ہی کچھ بڑبڑاتے ہوئے شعلہ جوالہ بن کر باہر آئے۔ میں نے پنڈت جی کو اس حال میں دیکھا تو ان سے وجہ دریافت کی۔ پھر بڑی لگاوٹ سے میں نے ان کے غصے کو ٹھنڈا کیا اور ان سے کہا کہ یہ وقت خفا ہو جانے کا نہیں ہے بلکہ جلد سے جلد اقدام کرنے کا ہے اگر تھوڑی سی تاخیر ہو گئی تو پھر نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ سانپ نکل جائے گا اور ہم لکیر پیٹتے رہ جائیں گے۔ میں نے پنڈت جی کو یہ اطلاع بھی دی کہ نیشنل کانفرنس کی تائید اس فیصلے کے ساتھ ہے۔ اس سے انھیں ایک گونہ اطمینان حاصل ہوا۔ وہ اندر گئے اور مہاجن صاحب سے کہا کہ آپ جو کہتے ہیں وہی شیخ عبداللہ کا

www.taemeernews.com

بھی خیال ہے اور اس طرح دستاویز پر الحاق پر دستخط کر دیئے گئے۔ مہاجن نے اس واقعے کے متعلق بعد میں لکھا۔

"ایسے آڑے موقعے پر شیخ محمد عبداللہ کی مدد کا ہمیشہ ممنون رہوں گا کیونکہ انھوں نے بروقت پیغام بھیج کر کشمیر کو پاکستان کے ہاتھ جانے سے بچالیا۔"

دستاویز الحاق میں مہاراجا نے خارجی معاملات، رسل و رسائل اور دفاعی امور پر الحاق کیا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے گورنر جنرل ہند کی حیثیت سے الحاق منظور کرتے ہوئے یہ مشہور زمانہ شرط لگا دی۔ جس نے بعد میں کشمیر کے سوال کو بین الاقوامی سطح تک پہنچایا۔ انھوں نے مہاراجا کو لکھا۔

"جن مخصوص حالات کا آپ نے ذکر کیا ہے ان کے پیش نظر میری حکومت ہندوستانی ڈومینین کے ساتھ کشمیر کے الحاق کو اس اصول کے تحت قبول کرتی ہے جس ریاست میں الحاق کا مسئلہ مابہ نزاع ہو۔ وہاں الحاق کا فیصلہ ریاستی عوام کی خواہش کے مطابق ہونا چاہئے۔ میری حکومت کی خواہش ہے کہ کشمیر میں جوں ہی امن و امان بحال ہو اور حملہ آوروں سے ریاست کو نجات ملے تو ریاست کے الحاق کا مسئلہ عوام کی رائے سے طے کیا جائے۔"

لیکن یہ بات یہاں پر دلچسپی کا باعث ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے اس وقت فوج کشمیر میں بھیجنے کی مخالفت کر کے کچھ بین الملکی پیچیدگیوں کے اٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ ہندوستانی کابینہ کی دفاعی سب کمیٹی کے صدر تھے اور ان کی مخالفت سے ایک نازک صورت حال پیدا ہو گئی۔ لیکن جب مہاتما گاندھی نے کشمیر میں فوج بھیجنے کے حق میں رائے دی تو ماؤنٹ بیٹن کو بھی سر تسلیم خم کرنا پڑا۔

جواہر لال نہرو نے ۲۷۔۱ کتوبر ۱۹۴۷ء کو میرے نام ایک خط میں لکھا۔

"ہم نے ایک مشکل کام کا بیڑا اٹھا لیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم پار اتر جائیں گے۔ کل جب سے فیصلہ لیا گیا ہے اور جب سے میں نے آج سنا ہے کہ میری فوج سرینگر میں اتر گئی ہے، میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے اب یہ ہمارے مستقبل کا امتحان ہو گا۔"

شیخ صاحب کے اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مہاراجا ہری سنگھ نے ہندوستان کے ساتھ الحاق ہندوستان کے دباؤ میں آکر نہیں بلکہ پاکستان کی جارحانہ توسیع پسندی اور اس کے نتیجہ میں قبائلیوں کے دباؤ میں آکر کیا اور پھر ہندوستان کے ساتھ الحاق کی تصدیق کشمیریوں کی واحد پسندیدہ جماعت نیشنل کانفرنس نے بھی کی۔ الحاق پر دستخط مہاراجا ہری سنگھ نے اپنی مرضی سے کئے لیکن الحاق کے بعد حکومت ہندوستان نے شیخ محمد عبداللہ کے دباؤ میں آکر مہاراجا ہری سنگھ کے ساتھ جو توہین آمیز برتاؤ کیا اسے کوئی بھی باغیرت قوم معاف نہیں کر سکتی۔ الحاق ہوا

www.taemeernews.com

اور الحاق کے بعد ہندوستان نے کشمیر کی تعمیر و ترقی پر ہندوستان کے ٹیکس دہندگان اربوں روپے خرچ کیے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کشمیر آج ہندوستان کا سب سے ترقی یافتہ صوبہ ہے۔ نہ بھوک۔ نہ بیماری۔ نہ غربت۔ ہر طرف خوشحالی ہی خوشحالی۔ لیکن اس کے باوجود ۱۹۸۹ء شورش شروع ہوتے ہی کشمیری مسلمان اسلام کے نام پر تباہی اور بربادی کا راستہ اپنانے پر آمادہ ہوا۔ لیکن آج جب کشمیری مسلمان اسلام کے نام پر ہو رہی تباہی اور بربادی کا مشاہدہ کرتا ہے تو وہ اپنے بند ذہنی دریچوں پر ہتھوڑے مار کر یہ سوچنے پر مجبور ہو رہا ہے کہ جو راستہ اس نے اپنایا وہ خود کشی کا راستہ ہے اور پھر کوئی بھی باوقار اور خوددار خود مختار ملک اپنی علاقائی سالمیت کو کمزور کرنے کی کوششوں کو برداشت نہیں کر سکتا چاہے اس کے لئے اسے بھاری قیمت ہی چکانی پڑے۔ ہندوستان میں بھی سیاسی حالات نے ایک نئی کروٹ لی ہے۔ کانگریس سیاسی طور پر لاغر ہے۔ مرکزی سرکار کا سیاسی وقار بھی اس حد تک مجروح ہو رہا ہے کہ یہ دعوا تو خود کانگریسی بھی نہیں کر سکتے کہ ۱۹۹۶ء کے عام چناؤ میں کانگریس کو کامیابی حاصل ہو گی۔ ان حالات میں اگر کوئی پاکستان سے دوستی کی تمنا میں کشمیر کے سوال پر سمجھوتا بھی کرنا چاہے گا تو وہ اسکی موت ہو گی۔ سیاسی اختلافات اور نظریاتی ٹکراؤ کے باوجود ملک کی سالمیت۔ خود مختاری اور علاقائی وحدت کے تحفظ کے معاملہ میں ہندوستانیوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے اسکے علاوہ پاکستانی حکمرانوں کی فسطائی ذہنیت، ہندوستان کے خلاف اندھی دشمنی۔ ہندوستان کے سیاسی اور معاشی مفادات پر پے در پے حملے اور جارحانہ توسیع پسندی نے ہندوستانی عوام میں پاکستان کے خلاف ایسی نفرت پیدا کر دی ہے کہ پاکستان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر بھی شک و شبہات کا اظہار کیا جاتا ہے۔

۱۹۸۹ء کے بعد کشمیر میں اسلام کے نام پر جو گھناؤنے کھیل کھیلے گئے اس کے پس منظر میں اگر مجھ سے میری ذاتی رائے معلوم کی جائے اور اس ذاتی رائے کو کوئی اہمیت حاصل ہو تو میرا یہی مشورہ ہو گا کہ ہندوستان کو اپنی ترقی و خوشحالی کے لئے کشمیر کو پاکستان کے حوالے کر دینا چاہئے۔ کشمیر تو ہندوستان کے لئے Liabillity بن گیا ہے نہ سکون نہ آرام۔ میں یہ مشورہ اس لئے نہیں دے رہا ہوں کہ کشمیر پر پاکستان کا کوئی حق ہے۔ مشورہ صرف اس لئے کہ کشمیریوں کو یہ احساس ہو کہ کیا وہ ہندوستان میں غلاموں جیسی غلامانہ زندگی بسر کر رہے ہیں یا ایک آزاد شہری کی طرح زندگی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں؟ پاکستان کو تحفہ کے طور پر کشمیر حوالے کرنے کا مشورہ اسوجہ سے بھی دے رہا ہوں کہ کشمیری سیاست دانوں کو معلوم ہو جائے کہ اسلامی مملکت میں سیاسی بلیک میل کی سزا پھانسی ہے۔ مشورہ اس لئے دے رہا ہوں کہ کشمیریوں کو معلوم ہو کہ اپنے ملک سے بغاوت کرنے کی سزا اسلامی مملکت میں دیکھتے ہی گولی سے ہلاک کرنا ہے۔ میرا مشورہ اس لئے بھی ہے کہ کشمیریوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ہندوستان

www.taemeernews.com

میں رہ کر ہندوستانی کتو واپس جاؤ کا نعرہ بلند کر کے حکومت ہندوستان کو بلیک میل کر کے اربوں حاصل کئے جا سکتے ہیں یا کشمیر میں پاکستان کے "اسلامی بھائیوں ہمیں آزاد کرو" کی خواہش کا اظہار بند کمروں میں بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کشمیر کو پاکستان کے حوالے کرنے کا مشورہ اس لئے بھی دے رہا ہوں کہ کشمیریوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کر کے انھوں نے غربت۔ بھوک۔ بیماری اور جہالت سے آزادی حاصل کر لی ہے اور پاکستان میں انھیں معلوم بھی نہیں ہو گا کہ کب یہ آزادی چھین لی گئی ہے۔ لیکن میرا یہ مشورہ محض ایک ایسا خواب ہے جو کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔

آج کی تاریخ میں یہ دعوا بلا خوف تردید کیا جا سکتا ہے کہ کشمیر میں پاکستان کی غیر اعلانیہ جنگ کشمیر کو ہندوستان سے آزاد کرانے میں ناکام ہو چکی ہے البتہ اس جنگ نے کشمیر کے سماجی اور سیاسی رشتوں کو نہ صرف بدل دیا ہے بلکہ کشمیر اپنا ماضی بھی کھو چکا ہے۔ جس تشخص کے تحفظ کی بات ہر کشمیری کر رہا ہے وہ تشخص ۱۹۸۹ میں ہی غارت ہو گیا۔ کشمیر کا تشخص اس کا سیکولر کردار تھا۔ کشمیر کا تشخص اس کی مذہبی رواداری۔ ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی سکت۔ اور آپسی بھائی چارہ تھا۔ پاکستان نے اپنے دو قومی نظریہ کو درست ثابت کرنے کے لیے کشمیر کے اس تشخص پر ایسا مہلک وار کیا کہ کشمیر آج خالصتاً مسلم صوبہ بن گیا ہے جس کی بنیاد نفرت۔ انسانی خون اور لٹی مصلحتوں پر رکھی گئی ہے۔ آج بھی چند ہزار کشمیری پنڈت کشمیر میں یرغمالیوں جیسی زندگی بسر کر رہے ہیں اور اب ان یرغمالیوں کو بھی دھیرے دھیرے جموں کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ کشمیری پنڈتوں کی نسلی صفائی کے بعد کشمیر اپنا ماضی کھو چکا ہے اور جس کشمیر میں مہاتما گاندھی کو کمزور بینائی کے باوجود روشنی کی کرن نظر آئی تھی وہ کشمیر آج ایک اسلامی صوبہ بن گیا ہے اور اب کشمیر میں سیکولر معاشرے کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ کشمیر کے علاحدگی پسند لیڈروں کا قول ہے کہ "سیکولرزم اسلام کی ضد ہے" حریت کانفرنس کے آج کے تشدد پسند نئے گاندھی گیلے اور خشک آنسو بہا کر اگر کشمیری پنڈتوں کے وطن واپسی کے لئے کوششیں بھی کرتے رہیں گے تب بھی کشمیری پنڈت واپس نہیں جائے گا حالانکہ اسے اپنے وطن کی مٹی سے آج بھی پیار ہے۔ ایک طویل مدت کے بعد کشمیر سے بھاگے ہوئے کشمیری پنڈت بغیر کسی دباؤ۔ بغیر کسی بلیک میل اور بغیر کسی خوف کے آزاد شہری کی طرح زندگی گذار رہے ہیں۔ اس سے انکار نہیں کہ بے وطن ہو کر کشمیری پنڈت اپنا وجود کھو چکا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آج اسے ہندوستانی کتوں نکل جاؤ کا نعرہ اور فقرہ کالم ہونے کا طعنہ نہیں سننا پڑتا۔ اسے ہندوستان کا شو پیش تو نہیں بننا پڑتا۔ اگر بحث برائے بحث یہ تسلیم بھی کیا جائے کہ اپنے وطن کی مٹی کشمیری پنڈت کو

www.taemeernews.com

واپس جانے پر مجبور کرے گی تو وہ جائے گا کہاں؟ مکان تھے جلا دئے گئے۔ جو جلے نہیں ان پر قبضہ کیا گیا یا اس حد تک تباہ کیا گیا کہ انسانوں کے رہنے کے قابل نہ رہے۔ کہاں بسے گا کشمیری پنڈت اور کسی کے سہارے رہے گا جیئے گا۔ اس کے باوجود اگر کشمیری پنڈت واپس بھی جائے گا تو کیا کشمیری مسلمان اسے پیار بھری بانہوں میں جکڑنے کے لئے تیار ہوگا۔ اگر ایسا ہوتا تو اسے بھاگنے پر مجبور ہی کیوں کیا جاتا۔ آج کشمیری پنڈت آوارہ گرد بن گیا ہے اور اس کے لئے حکومت ہندوستان بھی اتنی ہی مجرم ہے جتنی پاکستان کی شورش۔ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں خاص کر کانگریس۔ جنتا دل اور بھارتیہ جنتا پارٹی نے اپنی ووٹر سیاست سے کشمیری پنڈت کو خارج کر دیا ہے۔ رہا کمیونسٹ پارٹیوں کا سوال۔ وہ تو سیکولرزم میں غوطہ لگانے میں اتنی مشغول ہیں کہ انہیں معلوم ہی نہیں کہ لاکھوں کشمیری پنڈتوں کو بے وطن کر دیا گیا ہے۔ رہا سوال حکومت کا۔ وہ اس معاملہ میں اتنی بے حس ہے کہ وہ محسوس نہیں کر رہی ہے کہ کشمیری پنڈت بھی اس ملک کے باشندے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ وہ کشمیری پنڈتوں کو قربان کر کے کشمیر کو مسلم صوبہ تسلیم کرنے پر آمادہ ہو اور میرا پختہ یقین ہے کہ کشمیر کا مسلمان بھی اس بات پر سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار ہے اگر کشمیر کو مسلم صوبہ تسلیم کیا جائے گا تو وہ ہندوستان کے ساتھ ہی رہنے پر تیار ہو جائیں گے۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ پاکستان کی سرد جنگ کی ناکامی کے بعد کشمیری دہشت گردی سے تنگ آچکا ہے۔ وہ امن کی بحالی کا خواہاں ہے۔ لیکن امن بحال نہیں ہو سکتا کیونکہ امن کی بحالی میں نہ حکومت ہندوستان کو کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی کشمیری انتظامیہ کو۔ دہشت گردی ایک ایسی منافع بخش انڈسٹری بن گئی ہے جس کے ساتھ سرکاری افسران۔ سیکورٹی فورسز۔ اور علاحدگی پسند لیڈروں اور دہشت گردوں کے نجی مفادات جڑے ہیں۔ دہشت گردی نے جواب دہی کا رجحان ختم کر دیا ہے اور اس رجحان کو ختم کرنے سے دہشت گردی ایک منافع بخش انڈسٹری بن گئی ہے۔ ہندوستان اربوں روپے کشمیر کی تعمیر و ترقی کے لئے دے رہا ہے اور یہ اربوں روپے دہشت گردی کی انڈسٹری کے پھیلاؤ کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ سرما یہ ہندوستان کا اور سرمایہ کاری ہو رہی ہے ہندوستان مخالف انڈسٹری میں۔ اسلامی مجاہد جو پاکستان اور رائے شماری کے لئے لڑ رہے ہیں آج ایک عدد سرکاری ٹھیکہ کے لئے۔ سرکاری دفتروں میں ملازمتوں کے لئے۔ خوبصورت لڑکیوں کی عصمت لوٹ لینے کے لئے پاکستان کو بھی سستے داموں سر راہ فروخت کر رہے ہیں۔ سیکورٹی فورسز کے بے ضمیر افسر اور جوان بھی اس سرد جنگ سے اتنے لطف اندوز ہو رہے ہیں کہ دہشت گرد بندوق لے کر بھی نظروں کے سامنے خرمستی کرتے دکھائی دے مجال ہے کہ سیکورٹی فورسز اس پر ہاتھ ڈال دیں۔ ایک غیر تحریری معاہدہ ہے "

www.taemeernews.com

ہم کو خوش رکھو باقی سب ٹھیک ہے۔" گذشتہ ۶ برسوں میں اسلامی مجاہدوں نے اتنی جائداد بنالی ہے کہ آج تحریک آزادی کے مجاہد بھی افسوس کر رہے ہیں کہ انھوں نے ۴۲ برسوں میں اپنا وقت ضائع کیا۔ سرکاری افسران جس میں گورنر کے مشیر بھی شامل ہیں دہشت گردی کی وجہ سے مالامال ہو گئے ہیں۔ زندگی کا کوئی شعبہ نہیں۔ مرکزی اور ریاستی سرکار کا کوئی ایسا محکمہ نہیں۔ ہندوستان نواز کوئی سیاسی لیڈر ایسا نہیں۔ علاحدگی پسندی کا کوئی ایسا لیڈر نہیں۔ جو اس منافع بخش انڈسٹری کے دلدل میں غوطہ زن نہیں ہے۔ ہندوستان سے آزادی حاصل کرنے کی تحریک رائے شماری کرانے کے لئے جدو جہد اور مرکزی سرکار کی سیاسی عمل شروع کرنے کی تحریک، دہشت گردی والی منافع بخش انڈسٹری کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئی ہے۔ ان حالات میں دہشت گردی کیسے ختم ہوگی۔ امن کیسے بحال ہوگا۔ سوال ان ذمہ دار لوگوں کی روزی روٹی کا ہے جن کی شہ رگ دہشت گردی ہے۔ بھلا کیوں کوئی اپنی شہ رگ کاٹ لے گا۔ پاکستان کو بلیک میل کرکے اس انڈسٹری کا دفاع کیا جارہا ہے۔ ہندوستان کو بلیک میل کرکے اس انڈسٹری کے لئے سرمایہ حاصل کیا جارہا ہے۔ ہلاکتوں کا سلسلہ دراز کرکے اس انڈسٹری کو توڑنے والوں کو زنجیروں میں جکڑا جارہا ہے اور اس پر بھی گلہ کہ کشمیریوں کے نہ چاہتے ہوئے بھی دہشت گردی کیوں زندہ ہے۔ کشمیری زبان کا ایک محاورہ ہے ٹوٹے برتنوں پر ٹوٹے ڈھکنے۔ برتن بھی چور اور چولہا بھی چور۔ حکومت بھی بے بس اور لوگ بھی بددل۔ تحریک لڑنے والے بھی ڈاکو اور تحریک چلانے والے بھی راہزن۔ ایسے حالات میں کون کس کو طعنہ دے گا۔ کون کس کے خلاف گواہی دے گا۔ ہندوستان کے ٹیکس دہندہ کا مال ہے ہر کوئی دو دو ہاتھ سے لوٹ رہا ہے۔

www.taemeernews.com

-

www.taemeernews.com

۱۹۸۹ میں شورش شروع ہوتے ہی ایسا بھونچال آیا کہ حکمراں جماعتوں نیشنل کانفرنس اور کانگرس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے والے ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ سیاسی نظام ٹوٹ گیا۔ امن قانون کا انتظامیہ تہس نہس ہو گیا۔ مذہبی رواداری اور بھائی چارہ کی فضا خلا میں تحلیل ہو گئی۔ چاروں طرف افراتفری راج برپا ہو گیا۔ کل تک جو سیکولرزم اور ہندو مسلم سکھ اتحاد کی میٹھی باتیں کرتے تھے غائب ہو گئے۔ چہرے بدل گئے۔ زبان دراز ہو گئی۔ رشتے بدل گئے۔ کل کے دوست دشمن بن گئے۔ کل تک جو پیار سے گلے لگتے تھے آستینوں میں تیز چھرے چھپا کر کل کے دوستوں کی تلاش کرنے لگے۔ عجیب ماحول تھا۔ ڈراونا اور خوفناک۔ ہم کیا چاہتے آزادی۔ آزادی۔ کشمیر میں نظام مصطفیٰ اور نظام کے لئے انسانی جانوں کی قربانیاں دینے کا نہ ختم ہونے والا نیا دور شروع ہوا۔ اس ماحول میں جہاں عام کشمیری کو یہ یقین ہونے لگا کہ کشمیر آزاد ہو گا وہاں اخبارات اور آزاد ہو گئے۔ ہر صحافی سینہ تان کر للکارنے لگا ہم تو آزاد ہیں کوئی ہمیں غلام بنانے کی جرائت تو کرے۔ اس خوش فہمی نے صحافیوں کو نہ صرف پاکستان کا بے باک اور نڈر ترجمان بنا دیا بلکہ ہر اس ذی ہوش کشمیری کا دشمن جو نراج جیسے حالات میں بھی انسانیت کی بات کرتا تھا، سوچ بدل گئی۔ آنکھوں کا پانی مر گیا اور صحافی اتنے چالاک ہو گئے کہ آنکھوں کا کاجل بھی چرانے کا فن سیکھ گئے۔ صحافیوں نے پرانا چولا اتار کر پھینک دیا اور آزادی کا نیا چولا پہن کر دہشت گردوں کے ترجمان بن گئے۔ اس کے بعد ہر صحافی وقت کے ساتھ چولا بدلتا رہا۔ کبھی جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کا ترجمان بن گیا۔ لبریشن فرنٹ کمزور ہوا تو حزب مجاہدین پر عاشق ہو گیا۔ حزب مجاہدین پر زنگ لگ گیا تو البرق سے معاشقہ لڑایا۔ شہد کی مکھی کی طرح مختلف رنگوں اور مختلف ذائقوں کے پھولوں کا رس چوسنے کا عمل شروع کیا۔ صحافت ایک منافع بخش انڈسٹری بن گئی اور راتوں رات سڑکوں پر زندگی گذارنے والے صحافی عالیشان بنگلوں میں منتقل ہو گئے۔ ہاکر آنکھ جھپکتے ہی مدیر بن گئے۔ اخباروں کے دفتروں کے چپراسی صحافی بن گئے۔ دہشت گردی کا جن بوتل سے نکل چکا تھا۔ ایک عرصہ تک جن نے ہر صحافی کے لئے دستر خوان بچھایا اور جب ہر طرح کے ذائقہ دار پکوان ختم گئے تو جن نے صحافیوں کو ہی نگلنا شروع کیا ہے۔

www.taemeernews.com

اخبارات کا رول باب ۲۹

آگے کی داستاں شروع کرنے سے قبل وادی کے اخبارات اور نئے پرانے صحافیوں کا ذکر کرنا ضروری ہے کیوں نکہ ۱۹۸۹ میں شورش شروع ہوتے ہی انھوں نے ایسی کروٹ لی کہ ماضی کے ساتھ ان کے تمام رشتے ٹوٹ گئے اور وہ بھول گئے کہ جس سماج اور معاشرے نے انہیں پناہ دی تھی۔ انھیں جوان کیا تھا انہیں سماج میں ایک اونچے مقام پر پہنچایا تھا وہ وقتی طور سے ختم ہو سکتا ہے لیکن بے موت مر نہیں سکتا۔ لیکن حالات اتنے تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے کہ ہر ایک کو خوش فہمی ہو رہی تھی کہ ہندوستان کا جنازہ نکل گیا ہے اور کشمیر آزاد ہو گیا ہے۔ میں نے خود لاکھوں لوگوں کو نظام مصطفے اور آزادی کے لئے مظاہرے کرتے دیکھا۔ نہ پولس کا ڈر۔ نہ فوج کا خوف۔ ویسے بھی پولس اور فوج غائب تھی۔ صحافیوں کا کیا قصور۔ معصوم اور بے چارے صحافی بھی رو کے ساتھ بہ گئے ویسے بھی وہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے ہمیشہ رو کے ساتھ ہی بہتے رہے تھے۔

وادی میں اردو کا پہلا اخبار کب شائع ہوا تاریخ اس کے بارے میں خاموش ہے لیکن تاریخ گواہ ہے کہ کشمیری مفت اخبار پڑھنے کا شوقین نہیں ہے۔ اخبار خریدے گا اور ایک ایک لفظ پڑھے گا۔ اس لئے کشمیر میں بامقصد اور بے مقصد دونوں طرح کے اردو اخبار بکتے رہے ہیں اور زندہ رہے ہیں'

۱۹۳۵ میں جب مہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف عوامی تحریک میں شدت پیدا ہو رہی تھی تو شیخ محمد عبداللہ اور پنڈت پریم ناتھ بزاز نے اردو کا ایک ہفت روزہ اخبار ہمدرد شروع کیا۔ مولانا محمد مسعودی اس کے مدیر معاون تھے۔ پریم ناتھ بزاز دانشور۔ ادیب اور سماجی کارکن تھے۔ اخبار ہمدرد کا پہلا پرچہ ایک عوامی جلسہ میں مرحوم سیف الدین کچلو نے ریلز کیا۔ ہمدرد اتنا مقبول ہوا کہ مہاراجہ کے خلاف تحریک کی آواز بن گیا۔ لیکن شیخ محمد عبداللہ اور پریم ناتھ بزاز کے درمیان لین دین کے سوال پر اختلافات پیدا ہوئے اور شیخ محمد عبداللہ ہمدرد سے علاحدہ ہو گئے۔ پریم ناتھ بزاز نے نیشنل کانفرنس کے نظریاتی دشمن مولوی محمد یوسف شاہ سے یارانہ جوڑ لیا اور وہ پاکستانی کے بانی مرحوم محمد علی جناح کے مداح بن گئے۔ ۱۹۴۸ کے بعد پریم ناتھ بزاز پاکستان کے ساتھ الحاق کے

www.taemeernews.com

مبلغ بن گئے اور انھوں نے اس سلسلہ میں کئی کتابیں بھی قلمبند کیں۔ زمانہ بدلتا گیا۔ پاکستان سے بہہ رہی گنگا سوکھنے لگی اور بزاز صاحب ایک اور گنگا کی تلاش میں نکل پڑے جنتا پارٹی میں غسل صحت کیا لیکن صحت بگڑ گئی اور انکا پوسٹل ایڈریس بھی غائب ہو گیا۔ اخبار ہمدرد، ایک معیاری اخبار تھا لیکن سیاسی تبدیلیوں نے اسے تباہ کر دیا اور ایک کاتب غلام رسول عارف نے اسے خرید لیا لیکن نہ معیار تھا نہ زبان۔ ایک بے مقصد اخبار البتہ ایک منافع بخش ٹکسال۔

ایک اور اخبار نیشنل کانفرنس نے خدمت کے نام سے شروع کیا۔ مولانا مسعودی مدیر اعلا اور پریم ناتھ بزاز کے شاگرد نند لال واتل اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ اردو صحافت کا جو معیار اس زمانے میں تھا اس معیار کو دیکھتے ہوئے اخبار خدمت ایک معیاری اخبار تھا۔ ۹۔اگست ۱۹۵۳ میں سیاسی تبدیلی کے بعد بخشی غلام محمد اخبار خدمت پر قابض ہو گئے۔ ۱۹۶۵ میں نیشنل کانفرنس کے کانگریس میں ضم ہونے کے بعد خدمت پردیش کانگریس کمیٹی کا آفیشل آرگن بن گیا۔ اس کے باوجود کہ اخبار خدمت ایک صاف ستھرا اخبار تھا۔ بلیک میلنگ اس کو چھو نہیں سکی تھی لیکن تھا بے معنی اخبار۔ نہ کوئی پیغام نہ کوئی جدت اور نہ ہی کوئی اصول۔ شورش شروع ہونے کے چند ماہ بعد اخبار کی اشاعت بند ہو گئی۔

مجاہد آزادی پنڈت کشپ بندھو نے دیش کے نام سے ایک اخبار شروع کیا تھا لیکن ۱۹۵۷ کے بعد جب اصلی دیش پر گہن لگ گیا تو اخبار دیش بھی اپنی موت خود ہی مر گیا۔ کشمیری پنڈتوں کا ترجمان مارتنڈ بھی ایک زمانے میں معیاری اخبار تھا لیکن کشمیری پنڈت لیڈرشپ کی خود غرضی اور ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے یہ اچھا اخبار بھی بند ہو گیا۔ زیر زمین کمیونسٹ پارٹی نے مشعل۔ نئی لہر اور بعد میں کشمیر کے نام سے ہفت روزہ شروع کیا۔ مدیر کامریڈ موتی لال مصری تھے۔

۱۹۵۳ کے بعد کمیونسٹ پارٹی نے دہلی کے ایک سرکردہ کمیونسٹ لیڈر کامریڈ ضیا الحسن کو اخبار کشمیر کا انچارج بنا دیا۔ ایک معیاری اور نظریاتی اخبار۔ جب ۱۹۵۷ میں ڈیمو کریٹک نیشنل کانفرنس نے نیشنل کانفرنس کی کوکھ سے جنم لیا تو کشمیر کو روزنامہ بنایا گیا۔ ادارت مرحوم درگا پرشاد در۔ موتی لال مصری اور شیخ نور محمد کے حوالے کی گئی۔ میں بھی ۳ برس تک اس سے وابستہ رہا۔ لیکن یہ اخبار بھی سیاسی موقع پرستی اور سیاسی اقتدار کی قربان گاہ پر قربان ہو گیا۔

وادی میں جدید نوعیت کا اخبار شروع کرنے میں روزنامہ آفتاب کے مدیر خواجہ ثنا اللہ نے پہل کی اور پہلی بار کشمیر میں ایک اردو روزنامہ آفسیٹ پریس پر شائع ہونے لگا۔ ایک خوبصورت اور صاف ستھرا اخبار۔ جب بھی کشمیر کی اردو صحافت کی تاریخ قلمبند ہو گی تو خواجہ ثنا اللہ بٹ کو نظر انداز کرنا ناممکن ہو گا حالاں کہ بحیثیت مدیر کے انھوں نے اخبار کی پالیسی میں ہر نئے دور کے

www.taemeernews.com

شروع ہونے کے ساتھ ہی نظر ثانی کا منافع بخش دھندہ شروع کیا۔ خواجہ ثناءاللہ بٹ نے جب کشمیر میں صحافی زندگی شروع کی تو وہ بخشی غلام محمد اور پولس افسر غلام قادر گاندربلی کی بیساکھیوں پر ہی کھڑے ہوئے۔ جب دونوں کا ستارہ ڈوب گیا تو خواجہ غلام محمد صادق پر عاشق ہو گئے۔ صادق صاحب گئے تو سید میر قاسم سے یارانہ جوڑا۔ وہ دائمی دوستی کے قائل نہیں ہیں۔اسی وجہ سے ۱۹۸۹ میں شورش شروع ہوتے ہی اچانک ان پر یہ راز افشا ہوا کہ کل تک کشمیری ایک غلام قوم تھی جسے اب دہشت گرد آزاد کرانے آئے ہیں۔ وقت وقت پر بہت خدمت کی مختلف برانڈ کے دہشت گردوں کی لیکن پھر بھی انہیں غلاموں کی سی زندگی گذارنے پر مجبور ہونا پڑا۔ گذشتہ چند برسوں سے اخبار آفتاب کے دفتر کے اندورونی کمرے میں رہائش پذیر ہیں اور وہاں تک پہنچنے کے لئے کئی طرح کے مشکل ترین مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

اخبار خدمت کے ایک ملازم صوفی غلام محمد نے اپنا اخبار سرینگر ٹائمز آفسیٹ پریس پر شروع کیا۔ ایک زمانے میں بخشی غلام محمد کے ترجمان تھے اور جب ان کا ستارہ ڈوب گیا تو ہر نئے سورج کی پرستش اور ہر ڈوبتے سورج کو قبرستان تک کندھا دیتے رہے۔ اس کے باوجود ایک معیاری مگر کاروباری اخبار شائع کرتے رہے۔ ہر حکمراں سے فیضیاب ہوتے رہے۔ سرکاری افسران سے ہر وقت خوفزدہ رہتے تھے اسی لئے ان کی ہر ناجائز حرکت بھی جائز قرار دی جاتی تھی۔ شورش ہوتے ہی وہ بھی شورش کے ساتھ بہہ گئے لیکن پھر بھی دہشت گردوں کا نشانہ بنتے رہے۔ آجکل سرینگر ٹائمز کا تمام کاروبار ان کی رہائش گاہ میں ہی ہوتا ہے۔ کشمیر کی صحت مند صحافت کا ذکر کرتے وقت شمیم احمد شمیم کا ذکر کرنا ناگریز ہے۔ جہاں خواجہ ثناءاللہ بٹ اخباری صنعت میں جدیدیت کے رہنما ہیں وہاں شمیم احمد شمیم اردو صحافت کو ایک خوبصورت موڑ پر لانے کے رہبر بھی تھے۔ شمیم ایک شعلہ بیان مقرر تو تھے ہی لیکن اردو زبان پر کا ان کا عبور۔لفظوں کی جادوگری اور تجزیہ نگاری نے انہیں صف اول کا اردو صحافی بنادیا، ہفتہ روزہ آئینہ شروع کرکے انھوں نے اردو صحافت کو ایک نئی زندگی دی۔ ائینہ نے کھوجی صحافت میں ایک منفرد مقام حاصل کیا، لیکن شمیم احمد شمیم ایک خود پسند صحافی تھے۔ انہیں اپنی شخصیت اور اپنی صلاحیتوں سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ منہ پھٹ۔ زبان دراز اور آگ برسانے والے قلم کی وجہ سے وہ اکثر بہک بھی جاتے تھے اور بیچ راستے سے بھٹک بھی جاتے تھے۔ اور ذاتی رشتے اور ذاتی تعلقات کے لطیف احساسات سے وہ نا آشنا تھے۔ شاید وہ خود اس کے لئے ذمہ دار نہیں تھے ان کی اپنی کچھ مجبوریاں تھیں اور ان مجبوریوں پر آج پردہ اٹھانا بد دیانتی ہو گی کیوں کہ شمیم اپنا دفاع کرنے کے لئے آج ہم میں موجود نہیں ہیں۔ شمیم نے زندگی کے آخری برسوں میں ہفت روزہ کو روزنامہ میں تبدیل کیا جو ان کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ زندہ رہتے۔سیاست انہیں کھوکھلا نہ کرتی تو شاید وہ

www.taemeernews.com

اپنی اس غلطی کو سدھارتے۔ لیکن ان تمام کمزوریوں کے باوجود اگر شمیم احمد شمیم نے اپنی تمام توجہ اور صحافت دی ہوتی تو آج شمیم بابا نے اردو صحافت کا درجہ حاصل کرتے۔

ایک اور ہفت روزہ چٹان کا ذکر کئے بغیر موجودہ صحافت کی مختصر سی داستاں نامکمل ہوگی۔ چٹان ایک نوجوان صحافی طاہر محی الدین کی ادارت میں گذشتہ کئی برسوں سے شائع ہورہا ہے۔ ہفت روزہ آئینہ کے ساتھ تو اس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ سنجیدہ اور صاف ستھری صحافت میں چٹان کو ایک اعلا مقام حاصل ہے۔ طاہر محی الدین قومی آواز سرینگر ایڈیشن کے نیوز ایڈیٹر بھی رہے ہیں۔ ایک روشن خیال اور نڈر صحافی طاہر محی الدین صحافیوں کی موجودہ نسل میں واحد صحافی ہیں جو نہ تو دہشت گردوں اور نہ ہی سیکورٹی فورسز سے خوفزدہ رہے سچی مگر تلخ بات وہ کہتا رہا ہے جسکی وجہ سے اسے نہ دہشت گرد خوش ہیں اور نہ ہی حکومت وقت۔ مالی بحران کی وجہ سے وہ چٹان کو ان بلندیوں پر تو نہیں لے جاسکتا ہے جن بلندیوں کی چٹان سے توقع تھی لیکن اس کے باوجود چٹان آج کے کشمیر میں ایک معیاری اور سنجیدہ اخبار ہے

وادی میں درجنوں اردو اخبار شائع ہوتے ہیں آج ان میں مزید اضافہ ہوا ہے لیکن اکثر اخبارات کی ادارت ایسے ناتجربہ کار ہاتھوں میں ہے جنہیں معلوم نہیں کہ انہیں کس ناکردہ جرم کے لئے مدیر بننے کی سزا دی گئی ہے۔ کچھ بننے کے لئے کشمیر میں صحافی بن جانا ایک اہم پیشہ بن گیا ہے چاہے کچھ بننے کے لئے کچھ کھونا ہی کیوں نہ پڑے۔ اردو اخبارات میں، وادی کی آواز کا ذکر بھی ضروری ہے اس وجہ سے نہیں کہ یہ اخبار کوئی ایسا معیاری اخبار ہے جس سے کشمیر کی رائے عامہ متاثر ہے بلکہ اس لئے کہ اس اخبار کے مدیر غلام نبی شیدا ایک ایسے صاحب کمال کشمیری ہیں کہ کچھ بھی نہ ہوتے ہوتے وہ آج بہت کچھ ہیں۔ میری پہلی ملاقات ان کے ساتھ سید میر قاسم کے دربار میں ہوئی ہے۔ خلوت میں انھوں نے قاسم صاحب پر ایسا جادو کر دیا کہ اپنی ٹسٹ رجسٹر کو یہ تعلیمی قابلیت کی سرٹیفکیٹ پیش کرنا لازمی تھا۔ روزگار کا ایک اور دروازہ کھل گیا تھا اور انہیں سکریٹ فنڈ سے ماہانہ وظیفہ ملنے لگا۔ جو وہ باقاعدگی کے ساتھ ہر ماہ سید میر قاسم کے پولیس گارڈ موتی لال سے حاصل کرتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر کرن سنگھ کے ساتھ بھی ان کے وظیفے والے رشتہ کافی مدت تک قائم تھے۔ پھر ایک صبح سرینگر میں دھماکہ ہوا کہ ضلع پلوامہ کے گاؤں گوری پور کے غلام نبی شیدا مدیر بن گئے ہیں ویسے بھی کانگرس اور سیکریٹ فنڈ سے وظیفے حاصل کرنے والوں صحافیوں میں صرف غلام نبی شیدا شامل نہیں تھے۔ سرینگر کا ہر صحافی ماسوائے بی بی سی کے آج کے نمائندے یوسف جمیل وظیفہ حاصل کرتا رہا ہے۔ قومی پریس کے اکثر نمائندے سوائے کے اخبار (States man) سٹیٹین کے مسٹر وشوم، مسٹر ونیکٹیش۔ یو این آئی کے مسٹر بھاسکر اور انڈین ایکسپریس کے مسٹر سونی حکمرانوں اور کانگریس سے فیضیاب ہوتے

www.taemeernews.com

رہے ہیں۔

۱۹۸۹ میں شورش شروع ہوتے ہی وادی کے تمام اخبارات کا لہجہ ہی بدل گیا۔ وہ پاکستان نواز دہشت گردوں اور آزادی پسندوں کے نہ صرف ترجمان بن گئے بلکہ گائڈ بھی۔ صحافیوں کی ایک نئی فصل اگ آئی حالاں کہ اس طرح کی فصل کے لئے نہ تو بیج بوئے گئے تھی اور نہ ہی فصل کاٹی گئی تھی۔ نئے ان پڑھ اور جاہل صحافیوں نے سر کردہ کشمیری صحافیوں کا دامن پکڑ لیا اور ان کی انگلی تھام کر رینگنے لگے۔ کشمیری میں آزادی پسندوں اور پاکستانی دہشت گردوں کے عاشق اور نئی دہلی کے آقاؤں کے زرخرید غلام۔ کشمیر میں کبھی ایک دہشت گرد سے وابستہ تو کبھی دوسرے دہشت گرد سے دوستی کی روایت برقرار رکھی۔ ڈوبتے سورج کو قبرستان تک کاندھا دینا اور چڑھتے سورج کی گرمی سے اپنی جیبوں کو گرمانا۔ ناموں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ جانے پہچانے چہرے ہیں۔ لیکن نام ظاہر کرنے کا کام میں کشمیریوں پر ہی چھوڑ دیتا ہوں۔ یہ میری پیشگوئی ہے کہ ہر ڈبل ایجنٹ کی طرح کشمیر کے یہ ڈبل ایجنٹ صحافی بھی کسی نہ کسی موقع پر اس طرح سے بے لباس ہو جائیں گے کہ پھر سے باالباس بننے کی جرات نہیں کریں گے۔

اسی پس منظر میں ۱۹۸۹ میں قومی آواز کا سرینگر ایڈیشن خدمت بلڈنگ سے شروع کیا گیا۔ قومی آواز کا سرینگر ایڈیشن شروع کرنے میں کئی طرح کی رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ ڈیکلیریشن دینے میں قانونی پیچیدگیوں کا سہارا لیا گیا۔ سرینگر ٹائمز کے مدیر صوفی غلام محمد نے اس وقت کے کانگریس صدر محمد شفیع قریشی کے نام ایک کھلے خط میں لکھا کہ "قومی آواز شروع کرنے سے ریاست کی خود مختاری محدود ہو جائے گی۔" معاملہ ایڈوکیٹ جنرل کی عدالت میں پیش ہوا لیکن قومی آواز کی ڈیکلیریشن رک نہیں سکی۔ ریاست کی صحافتی زندگی میں قومی آواز کا آجانا ایک صحت مند تبدیلی تھی۔ پہلی بار ہر ملازم کو تقرری کا خط۔ بھارت دیج بورڈ کے مطابق ملازمت۔ ایک اور دھماکہ ہوا۔ قومی آواز نے اپنی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اعلان کیا کہ قومی آواز میں مراسلوں۔ عوامی شکایات اور خبروں کو بغیر اجرت کے شائع کیا جائے گا اور اس اعلان اثر ہوا کہ کئی روز تک قومی آواز کے دفتر کی طرف کسی نے رخ نہیں کیا کیوں نکہ ہر ایک اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ اخبار خبریں بغیر اجرت کے شائع کرنے کا وعدہ کرتا ہے اس اخبار میں خبریں شائع نہیں ہو سکتیں۔ لیکن جب یہ بات عام ہو گئی تو قومی آواز کی اشاعت ۵۰۰ کاپیوں سے بڑھ کر ۱۰ ہزار روزانہ بڑھ گئی۔

قومی آواز کے شروع ہوتے ہی اس کے دشمن بھی بیدار ہوئے۔ مقامی اخبارات خاص کر سرینگر ٹائمز نے قومی آواز کے خلاف باضابطہ مہم شروع کر دی اور اس میں تنگ نظر مولویوں سے فتوے بھی جاری کروائے۔ دہشت گردی شروع ہوئی تھی اور قومی آواز رو کے ساتھ بہہ جانے

www.taemeernews.com

کے بجائے رو کے خلاف تیرنے نے کو ہی ترجیح دے رہا تھا۔ اشاعت سے پہلے روز سے ہی قومی آواز نے دہشت گردوں سے اپیل کی کہ وہ بندوق کے بل پر کشمیر کا مسئلہ حل نہیں کر سکتے مسلے حل کرنے ہیں تو امن کا راستہ اختیار کر لو۔ قومی آواز جب شروع ہوا تو اظہار رائے اور اختلاف رائے کو قتل کرنے کا سلسلہ چل پڑا تھا۔

مخبر قرار دے کر قتل کرنے کا سیزن شروع ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود قومی آواز بند ذہنوں پر ہتھوڑے برساتا رہا کہ جس کشمیر کو آزاد کرنے کے لئے دہشت گرد سر گرم ہیں وہ کشمیر کھنڈر بنتا جارہا ہے۔ جس کشمیری کے احساسات کی عکاسی بندوق کے بل پر کی جارہی ہے اس کشمیری کو قتل کیا جارہا ہے۔ میں نے اپنے دستخطوں سے قارئین کے نام ۶ خطوط میں صاف گوئی سے کہا کہ دہشت گردی ایک ایسا جن ہے جسے بوتل سے نکال لیا گیا لیکن جن کو واپس بوتل میں بند کرنا ممکن نہیں ہے۔

دھمکیاں شروع ہوئیں۔ قومی آواز کے اسٹاف میں بغاوت کے جراثیم کروٹ لینے لگے۔ خاموش احتجاج شروع ہوا۔ ٹیلیفون بجنے لگے کہ قتل کریں گے تم کو۔ اور میں دھمکی کا جواب دلائل سے دیتا کہ " اگر میرے قتل کرنے سے مسئلہ حل ہو سکتا ہے تو قتل ہونے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میں بار بار یہی کہوں گا کہ دہشت گردی کشمیر کو تباہ کر دے گی۔" اور میں نے قارئین کے نام ایک خط میں لکھا کہ " مجھے نہ وضاحت کرنے کی اور نہ ہی حلفیہ بیان دینے کی ضرورت ہے۔ کہ قومی آواز کی پالیسی کیا ہے۔ یہ کس کا اخبار ہے۔ یہ کس کے مفادات کا محافظ ہے۔ اب تک قومی آواز کے قارئین سمجھ گئے ہونگے کہ قومی آواز کس کی آواز ہے اور یہ کس کے احساسات اور خواہشات کی علامت ہے لیکن بد قسمتی سے چند ایسے عناصر جو ہر دور میں اپنا ذہن اور اپنا قلم ہر حاکم کے پاس گروی رکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ وہ قومی آواز کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے پر بضد دکھائی دیتے ہیں۔ قصور ان کا بھی نہیں ہے۔ فرش پر رینگنے والے جب آنکھ جھپکتے ہی عرش پر پہنچ جاتے ہیں، پست قد والے جب ادھار کی بیساکھیوں پر کھڑے ہو کر دراز قد ہونے کا دعوا کرنے لگتے ہیں تو انہیں ہر خوبصورت شے بدصورت نظر آتی ہے۔

اس حقیقت کے باوجود کہ پنڈت جواہر لال نہرو جنھوں نے ہندوستان کی بنیاد ۳۔ ستونوں، سیکولرزم، سوشلزم اور جمہوریت پر رکھی، قومی آواز کے بانی ہیں۔ لیکن قومی آواز کانگریس پارٹی کا آفیشل آرگن نہیں ہے۔ یہ تو اپوزیشن جماعتوں کا ترجمان بھی نہیں ہے۔ قومی آواز ایک نا وابستہ اخبار ہے لیکن غیر جانبدار نہیں ہے۔ جانبداری ہماری زندگی ہے اور وابستگی سے ہم کوسوں دور ہیں۔ ہم نہ کسی پارٹی کی اندھی مخالفت کرتے ہیں اور نہ ہی کسی پارٹی کی غیر مشروط حمایت کرتے ہیں۔ رہا سوال جانبداری کا۔ ظالم اور مظلوم کے درمیان لڑائی میں قومی آواز مظلوم کا دوست

www.taemeernews.com

ہے چاہے اس دوستی سے کسی کے ماتھے پر شکن ہی کیوں نہ پڑے۔ نفرت اور تعصب کی بنیاد پر امتیازی سلوک سے کچلے دبے انسان کے ہم جانبدار ہیں۔ ہم تنگ نظری، کٹر پرستی اور رجعت پسندی کے خلاف صف آرا کشادہ ذہن رکھنے والے پرخلوص دیانتدار لوگوں کے حمایتی ہیں۔ ہم ہر اس لڑائی میں جانبداری کا رول کر رہے ہیں جو سرمایہ کے بل پر لوگوں کا استحصال کرنے والوں اور مذہبی، لسانی اور صوبائی بنیادوں پر عوامی صف بندی کو توڑنے والوں کے خلاف لڑی جارہی ہے۔ ہم ہر اس جنگ میں ان قوتوں کے دوست ہیں جو مذہب کو ڈھال بنا کر سیاسی مفادات حاصل کرنے والوں کے خلاف سرگرم ہیں۔ قومی آواز بم دھماکوں، جوابی فائرنگ، لوٹ مار اور دھونس جما کر گھڑی کی سوئیاں پیچھے گھمانے والے گمراہ عناصر کے خلاف سرگرم قوتوں کا ساتھ دے رہا ہے۔ کانگریس سمیت چند دوسری سیاسی جماعتیں بھی اسی طرح کے پروگرام میں یقین رکھتی ہیں۔ لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ہم ان پارٹیوں کے ترجمان ہیں۔ البتہ ہم ان پارٹیوں کے دوست ہیں۔ جب جب ان پارٹیوں میں لغزش آئی ہم نے انہیں بخشا نہیں اور نہ ہی مستقبل میں معاف کریں گے۔ ظلم کوئی بھی کرے بے بس اور مجبور لوگوں کو خوف و ڈر سے دبانے کی کوشش کوئی بھی کرے۔ اقتدار کے نشے میں چور کوئی سیاستداں، کوئی بڑا افسر، کوئی عوامی نمائندہ لوگوں کے مفادات سے کھلواڑ کرے، قومی آواز اپنی آواز بلند کرتا رہے گا۔ قومی آواز ایک آزاد اخبار ہے۔ لیکن ہم بے لگام، بے ہنگم آزادی کو انسان آزار سمجھتے ہیں۔ ہم جذبات کو مشتعل کر کے آگ لگانے کے لئے آزادی قلم کے حق میں نہیں ہیں۔ قومی آواز کی آزادی لامحدود نہیں ہے کہ سستی شہرت کے لئے لوگوں کو آپس میں ٹکرائے۔ پست قد اور پست ذہنیت لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ان کی ذہنی سوچ سے سمجھوتا کرے۔ قومی آواز تحریر تقریر کی آزادی کا علمبردار ہے لیکن لوگوں کو اجتماعی خودکشی پر اکسانے کے لئے نہیں بلکہ جائز مطالبات جائز حقوق اور مسائل حل کرنے کے لئے اس آزادی کے کثرت استعمال کا حامی ہے۔ قومی آواز اخبارات کی آزادی کا حمایتی ہے لیکن ایسے اخبارات کا دشمن ہے جو محض پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے دوسروں کے گھروں کو پھونک دیتے ہیں۔ اپنے بچوں کو عیش و عشرت کا سامان مہیا کرنے کے لئے غریب بچوں کے منہ کا نوالہ چھین لیتے ہیں۔ ہم ہر اس پارٹی، ہر اس انجمن اور ہر اس لیڈر کے دشمن ہیں جو شہری حقوق کو قتل و غارت کرنے یا لوگوں کو جھوٹی تسلی دے کر، جھوٹے وعدے کر کے گمراہ کر کے اور نفرت پھیلانے کا لائسنس سمجھتے ہیں۔ اب آپ ہی خود فیصلہ کیجئے۔ یہ کس کا اخبار ہے۔ کس کے مفادات کا محافظ ہے۔'

مراسلات کا یہ کالم آپ کے نام وقف ہے۔ لیکن ہر ہفتہ میں اسی کالم، کے ذریعے آپ تک اپنی بات پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ میں آپ کے بند ذہنی کواڑوں پر ہتھوڑے مار مار کر آپ

www.taemeernews.com

کو اس بات پر آمادہ کروں گا کہ آپ اپنے آپ کو پہچانیئے۔ اپنے مسائل کو سمجھیے اور مکر و فریب کی موجودہ سیاست سے گمراہ ہونے کی عادت ترک کیجیئے۔ آپ کے مسائل اتنے سنگین ہیں کہ اگر ان پر آج غور نہ کریں گے تو اپنے بچوں کا مستقبل تاریک بنائیں گے۔

قومی آواز کے اس کالم میں آپ اپنے مسائل کو ابھارئیے اور فروعی سوالات میں الجھے بغیر زندہ رہنے کے آداب سیکھئے۔ سیاسی سوالات جو حل ہو چکے ہیں ان کو پھر سے زندہ کرنے کی جو کوشش کی جارہی ہے۔ وہ ہماری توجہ ہمارے اہم مسائل اور مشکلات سے توجہ ہٹانے کا ایک حربہ ہے۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ایسے سوالات پر جب یہاں کی قد آور شخصیت مرحوم شیخ محمد عبداللہ کو بھی ۲۲ برس کے بعد اعلان کرنا پڑا کہ گھڑی کی سوئیاں پیچھے کی طرف گھمائی نہیں جا سکتیں تو آج کیسے ممکن ہے۔ کہ چند ہم دھماکوں، معصوم لوگوں کو قتل کرنے یا سرکاری اور نیم سرکاری عمارتوں کو آگ لگانے سے سوالات پھر سے زندہ ہونگے۔ اگر بحث برائے بحث یہ دلیل مان بھی لی جائے کہ سوالات کو زندہ کیا جاسکتا ہے تو اس کے لئے ریاست کی معیشت کو تباہ کرنے، یہاں کے لوگوں کو معاشی بدحالی میں مبتلا کرنے اور یہاں کے بچوں کے مستقبل کو تاریک بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لئے پر امن طور طریقے استعمال کئے جانے چاہیئے۔ لیکن جب تک اس پر کوئی غور و خوض نہیں ہوتا ہمیں اپنے روزمرہ کی مسائل پر خود غور کرنا چاہیئے اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ مسائل کیسے حل ہو سکتے ہیں۔ اس کے لئے قومی آواز کا یہ کالم آپ کے لئے وقف ہے۔

میں نے صفحہ اول پر یہ ایک اداریہ لکھا ۔ سنسکرت زبان کی ایک کہاوت ہے کہ گدھوں کے ہاں شادی تھی اونٹ براتی تھے۔ محفل سج گئی۔ رقص و سنگیت سے ساری محفل پر ایسا سرور طاری ہوا کہ اونٹوں نے رقص شروع کیا اور گدھوں نے سنگیت چھیڑ دیا، اونٹ جب صراحی دار گردنوں کو خم دے کر گدھوں کی تھاپ پر ناچنے لگے تو اونٹوں نے بے ساختہ کہا" واہ کیا مدھر سنگیت ہے" گدھے کم ظرف تو تھے نہیں بول پڑے "کیا رقص ہے دل بھی طبلہ بجارہا ہے" گدھوں اور اونٹوں کی یہ رنگین داستان سفر کرتے کرتے کشمیر تک پہنچی اور یہاں بھی گدھوں اور اونٹوں کا ایسا تانڈو ناچ شروع ہوا کہ ہمالیہ پربت پر سمادھی لگائے شو بھی کانپ اٹھا۔ شو نے غصہ میں آکر تانڈو ناچ سنسار کو فنا کرنے کے لئے شروع کیا تھا حالاں کہ وہ جانتے تھے کہ موت کا یہ رقص کامیاب نہیں ہو گا کیوں کہ تب ایک نہیں کئی بزرگ تھے جو شو کا تانڈو ناچ بند کی صلاحیت رکھتے تھے، شو کو معلوم تھا کہ جو شکتی خود زہر پی لے اور امرت دوسروں کو پلائے اسے موت کا رقص جاری رکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی کیوں کہ تب بزرگوں میں دم تھا اور اسی دم پر لوگ دم بھرتے تھے۔ آج نہ تو ایسا کوئی بزرگ ہے جو گدھوں کے سنگیت کو خاموش کر سکتا

www.taemeernews.com

ہے اور نہ ہی اونٹوں کے رقص پر پابندی لگا سکتا ہے۔ بزرگوں کی بزرگی پر کب کا گہن لگ چکا ہے اب تو یہاں کوئی ایسا شخص بھی نظر نہیں آ رہا ہے جو زخموں پر مرہم پٹی لگائے اب تو یہاں صرف زخموں کو کرید کر ان پر نمک چھڑکنے والوں کو بالادستی حاصل ہے۔ کون کیا کرتا ہے۔ کون کس کو للکارتا ہے۔ کون کس سے انتقام لے رہا ہے۔ کون کس پر ظلم کر رہا ہے کون کس کے گھر میں زبردستی گھس کر سامان تہس نہس کر رہا ہے۔ بسیار تلاش کے باوجود یہ کون آج تک ہاتھ نہیں آیا۔ حکومت دعوا کر رہی ہے کہ مزید فورس آ گیا ہے اب "کون" پکڑا جائے گا۔ لوگ پریشان ہو کر چلا اٹھتے ہیں کہ صاحب "کون" جب ہے ہی نہیں تو کون کس "کون" کو پکڑے گا۔

بے وزن لوگوں پر بزرگی ٹھونس دی گئی ہے وہ کبھی اخباری بیانات جاری کر کے کبھی ٹی وی پر بیان دے کر اور کبھی کسی بڑے افسر کے پاس عوامی احساسات کی ترجمانی کر کے اپنے آپ کو وزن دار بنانے کی کوشش تو کرتا ہے لیکن وہی طوطا بولو گنگا رام۔ عوام سخت مشکلات میں مبتلا ہیں اس کے نتائج خطرناک نکلیں گے۔ لیکن اس صورت حال سے کیسے قوم کو نجات دلائی جائے۔ اس پر وہ خاموش رہیں گے اس لئے نہیں کہ وہ خاموش رہنا چاہتے ہیں کیوں کہ یہاں کا ہر بزرگ ایک ہی نشست میں گھنٹوں بول سکتا ہے چاہے وہ کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے، وہ خاموش رہتے ہیں کیوں کہ انہیں خود بھی معلوم نہیں کہ مسئلہ کیا ہے۔ ان بناسپتی بزرگوں کو مسئلے کی نوعیت معلوم ہوتی اگر آج کے ان تمام مسئلوں کو ان ہی بزرگوں نے جنم نہ دیا ہوتا۔ جب کبھی کسی پر بزرگی ٹھونس دی جاتی ہے تو اسے باعزت بزرگ بنانے کے لئے اس کی ذہنی نس بندی کی جاتی ہے اور اس ذہنی نس بندی نے کشمیر کو جنت بے نظیر سے جہنم بنا دیا۔

آج جو مسئلہ کشمیری قوم کا منہ نوچ رہا ہے۔ اس میں کشمیری قوم کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ایک شریف قوم جو قدم قدم پر ذہنی نس بندی والے بزرگوں کی عیاری، مکاری اور شیطانی حمل سے لٹتی رہی ہے آج ہر طرف تلاش کر رہی ہے کہ کوئی بزرگ ملے کہ ان کی رہبری کرے لیکن یہاں تو قحط ہے بزرگوں کا۔ قحط اس لئے نہیں کہ یہاں کی زمین بنجر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جو بزرگی کے قابل ہیں۔ قابل اعتماد ہیں وہ دستار کے پرزوں سے کفن سی کر اپنی عزت محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جو باقی بچے ہیں خاموش ہیں۔ رہا سوال نئی نسل کا۔ ہر کوئی نئی نسل کو ذمہ دار ٹھہرا رہا ہے۔ حالاں کہ نئی نسل معصوم تھی۔ ان کے ذہن کچے تھے۔ بزرگوں نے محض اپنی انا کی تسکین کے لئے انکے کچے ذہنوں میں نفرت، عداوت اور تشدد کے بیج بوئے اور جب بیج پک گیا اور نفرت کا لاوا پھوٹنے لگا۔ تو بزرگ کنارہ کش ہو گئے اور نئی نسل بغیر کسی رہبر کے بھٹکنے لگی۔ اور آج کا جنگ جو جوان اور انتہا پسند اسی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ ان میں سے نہ

www.taemeernews.com

کوئی مجرم ہے اور نہ ہی قصوروار۔ میں یہ کہہ کر نہ تو تشدد کی اور نہ ہی زور زبردستی کی حمایت کر رہا ہوں میں تو صرف ایک پوری نسل کی ٹریجڈی کی بات کر رہا ہوں کیوں کہ میں بھی ایک کشمیری ہوں اور میں اس سارے ڈرامہ کا چشم دید گواہ ہوں۔ میری عمر تو ڈھل گئی ہے لیکن میری اپنی نسل بھی تو آج کی نسل ہے۔ ان کے کچے ذہن بھی بے وزن بزرگوں کی قلابازیوں سے متاثر ہوئے ہیں اور یہ سب دیکھ کر مجھے یہ شعر یاد آرہا ہے۔

میں ریت کے دریا پہ کھڑا سوچ رہا ہوں
اس شہر کا پانی تو یزیدوں نے پیا ہے

اس کے باوجود میں طوفان کا رخ موڑ دینے میں کامیاب نہیں ہوا۔ وجہ یہ نہیں کہ لوگ تصویر کے دوسرے رخ سے خوش نہیں تھے۔ وجہ یہ تھی کہ قومی آواز کا اپنا اسٹاف قومی آواز کو قتل غارت۔ لوٹ مار اور بم دھماکوں کا ترجمان بنانا چاہتا تھا۔ اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مدیر ہوتے ہوئے بھی اخبار میرے قابو میں نہیں رہا۔ اور پھر حالات اتنے بے قابو ہو گئے کہ قومی آواز کا سرینگر ایڈیشن بند کرنا پڑا اور اس طرح اپنوں اور غیروں کی سازشوں نے ایک معیاری اور بے باک نڈر اخبار کی موت ہو گئی۔

ذکر ہو رہا تھا کہ کشمیر کے صحافیوں کا لیکن قومی پریس نے بھی جو رویہ کشمیر کے بارے میں اپنایا وہ کشمیر پریس سے مختلف نہیں تھا اور آج بھی وہی ہے۔ کشمیر میں ہندوستان کے مفادات کو ملکی اور بین اقوامی سطح پر جو زک پہنچایا گیا ہے اس کے لئے قومی پریس ذمہ دار ہے۔ قومی پریس نے بھی کشمیر کے پریس کی طرح تصویر کا ایک ہی رخ دیکھنے کی قسم اٹھائی ہے۔ حالات کا گہرائی سے تجزیہ کر کے دیانت داری کے ساتھ ان کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے میں قومی پریس نے بد دیانتی کی۔ ایک ہی زبان بولتے رہے ہیں اور بول رہے ہیں کہ کشمیر میں انسانی حقوق سلب کئے گئے ہیں۔ سیکورٹی فورسز نے ظلم تشدد برپا کیا ہے۔ آزادی اور شہری حقوق کو چھین لیا گیا ہے کسی نے یہ حقیقت بیان کرنے کی جرائت نہ کی کہ کشمیر میں ۱۹۴۷ کے بعد سے ہی فوج اور سیکورٹی فورسز تعینات ہیں۔ ۱۹۸۹ تک شیخ محمد عبداللہ سمیت کسی نے بھی فوج اور سیکورٹی فورسز پر انگلی نہیں اٹھائی۔ کسی نے یہ جھوٹ لکھنے کی جرات بھی نہیں کی کہ فوج ظلم تشدد کر رہی ہے۔ شورش شروع ہونے کے بعد ہی سیکورٹی فورسز پر یہ انگلیاں اٹھنی شروع ہوئیں۔ کیا کسی صحافی نے گہرائی میں اس نئی صورت حال کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔

۱۹۸۹ کے بعد ایک سازش کے تحت پاکستان نے کشمیر کو اسلامی مملکت بنانے کے لئے اقلیتی فرقہ کشمیری پنڈت کو ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔ سینکڑوں کشمیری پنڈت کو ہلاک کیا گیا۔ ان کی جائداد کو تباہ کیا گیا۔ کیا کسی بھی قومی صحافی نے اس کا جائزہ لے کر اسکی صحیح

www.taemeernews.com

تصویر پیش کرنے کی جرأت کی۔ کشمیری پنڈتوں کی نسلی صفائی کے بعد مسلم قوم پرستوں پر ظلم تشدد شروع ہوا۔ ممبران اسمبلی کو قتل کیا گیا۔ خوبصورت لڑکیوں کو مخبر قرار دے کر اغوا کیا گیا۔ انکی عصمت دری کر کے ان کی لاشوں کو سڑکوں پر پھینک دیا گیا۔ قومی پریس نے اس پر تو مگر مچھ کے آنسو بھی نہیں بہائے۔ پروفیسر مشیرالحسن کو اغوا کر کے ہلاک کیا گیا۔ کیا قومی پریس نے اس پر احتجاج کیا۔ کئی صحافیوں کو بے دردی کے ساتھ قتل کیا گیا کیا قومی پریس نے اسکا نوٹس لیا کیا قومی پریس نے کبھی بھی ان مشکل ترین حالات کا ذکر کیا جس میں فوج اور سیکورٹی فورسز قومی مفادات کا تحفظ کر رہے ہیں۔ فوج اور سیکورٹی فورسز سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ انھوں نے بھی مشتعل ہو کر ظلم ڈھایا ہے۔ اس کے لئے ان کا دفاع تو نہیں کیا جاسکتا لیکن قومی پریس تصویر کا دوسرا رخ پیش کرنے میں کیوں ناکام رہا۔ دہشت گردوں نے جو ظلم ڈھائے ہیں۔ دہشت گردوں نے نئی قسم کی جو فسطائیت شروع کی ہے۔ دہشت گردوں نے زندہ رہنے کا حق جو چھین لیا ہے۔ تحریر و تقریر کی جو آزادی ختم کر دی ہے۔ اختلاف رائے کا جس بے دردی کے ساتھ گلہ گھونٹ دیا ہے قومی پریس نے اس کا نوٹس کیوں نہیں لیا۔ کیا پریس کشمیر کے سوال پر اپنا قومی فریضہ ادا کرنے میں کامیاب رہا ہے؟ اس سوال کا جواب مجھے جینوا کی انسانی حقوق سے متعلق کانگرس میں اس وقت ملا جب پاکستان کا وفد صرف ہندوستان کے قومی پریس کا حوالہ دے کر ہندوستان پر تابڑ توڑ حملے کر رہا تھا۔ میں آزاد صحافت کا عاشق ہوں۔ میں سچائی اور صرف سچائی کی ترجمانی کا ترجمان ہوں۔ لیکن سکے کے دونوں رخ لوگوں کے سامنے رکھنے کا حامی ہوں۔ قومی پریس نے کشمیر کے معاملہ میں اینٹی نیشنل رویہ اپنایا ہے اور اسی اینٹی نیشنل رویہ کی وجہ سے ہندوستان کے قومی مفادات کو زبردست ذک پہنچا ہے۔ ممکن ہے جب کبھی قومی پریس کا ضمیر بیدار ہو جائے گا اس دن اس بات کا اعتراف کرے گا کہ دہشت گردوں کے ساتھ ساتھ قومی پریس نے بھی کشمیر میں شرافت۔ انسانی حقوق اور انسانی قدروں کا خون کیا ہے۔

www.taemeernews.com

-

www.taemeernews.com

ہندوستان کی سیاسی لیڈرشپ پر یہ الزام کہ اس نے کشمیریوں کے ساتھ وشواس گھات کرکے انہیں قومی دھارے سے دور کر دیا ایک ایسا سفید جھوٹ ہے جس پر خود کشمیری بھی یقین نہیں کرتے۔ کشمیر میں ۱۹۴۷ کے بعد کشمیریوں کے ساتھ اگر کسی نے وشواس گھات کیا ہے تو خود کشمیری لیڈر شپ نے کیا ہے اور کشمیریوں نے ہمیشہ اس وشواس گھات کو نظرانداز کرکے کشمیری لیڈروں پر ہی بھروسہ کیا۔ جب بھی کبھی کشمیریوں نے اپنے لیڈروں کی نیت پر شک کا اظہار کیا تو کشمیری لیڈروں نے ان کی توجہ ہٹانے کے لئے ایسے سیاسی نعرے بلند کئے کہ کشمیریوں کی انگلیاں ہندوستان پر اٹھنے لگیں۔ کشمیری قوم ایک جذباتی قوم ہے جسے اپنی منفرد پہچان اور تشخص سے بے حد لگاؤ ہے اور کشمیری لیڈر کشمیریوں کی اس کمزوری کو بخوبی سمجھتے ہیں اور اسی لئے وہ جب بھی کوئی بحران آیا کشمیریوں کی اس کمزوری کا استعمال کرتے رہے ہیں۔ کشمیریوں کی اس کمزوری اور لیڈروں کے تئیں ان کی وفاداری کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تحریک حریت کشمیر کی بنیاد ہی علاحدگی پسندی اور فرقہ واریت پر رکھی گئی حالانکہ تحریک کے مقاصد نہ صرف انقلابی نوعیت کے تھے بلکہ سیکولر بھی تھے لیکن سیکولر اور انقلابی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے فرقہ واریت کا استعمال کیا گیا جس کی وجہ سے نظریات میں ابہام پیدا ہوا۔ حالات کا غلط تجزیہ ہوا۔ سیاسی اور سماجی رشتوں کے بارے میں غلط تصورات پیدا ہوئے۔ جو تحریک اچھے مقصد کو لے کر شروع ہوئی وہ تحریک ابتدا میں ہی مذہبی انتہا پسندی اور تنگ نظری کی شکار ہوئی حالانکہ اس تحریک میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ کشمیری ہندوؤں کی قلیل تعداد بھی شامل تھی۔ آج جو حالات ابھرے ہیں ان کی بنیادی وجہ بھی تحریک کی یہی کمزوریاں ہیں۔

www.taemeernews.com

کشمیر ریاست جموں کشمیر کا ایک صوبہ ہے لیکن مرکزی لیڈرشپ کی کشمیریوں کی منہ بھرائی والی پالیسیوں اور کشمیری لیڈرشپ کی ہندوستان کے عوام کے ساتھ ساتھ جموں اور لداخ کے لوگوں کو بلیک میل کرنے کی ہوس نے جموں کشمیر کے نقشہ سے لداخ اور جموں کا وجود ہی مٹادیا۔ تعمیر، ترقی کے معاملہ میں جموں اور لداخ کو ۱۹۴۷ء کے بعد نظر انداز کر دیا گیا حالانکہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کے سوال پر جموں اور لداخ کے عوام کی مرضی شامل تھی۔ بد قسمتی سے ۱۹۴۷ء میں راجواڑ شاہی سے آزادی حاصل کرنے کے بعد سے ہی شیخ محمد عبداللہ سمیت ہر حکمراں نے کشمیر کو ہی اپنی سیاسی بقا کا ذریعہ بنالیا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۵۳ء کے بعد کشمیر کا ہر حکمراں جموں اور لداخ کے عوام کی سیاسی حمایت سے ہی سیاسی طور پر زندہ رہا۔ تحریک آزادی پر کشمیری لیڈرشپ کی تنگ نظری سے فرقہ واریت کا رنگ تو چڑھ گیا تھا آزادی کے بعد اس پر صوبائی تعصب بھی غالب رہا۔ ہتھیار اگر جموں اور لداخ کے عوام اٹھاتے تو ان پر غداری کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ کشمیریوں کے لئے ہتھیار اٹھانے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ کشمیریوں کو ہر طرح کی آزادی۔ ہر طرح کے حقوق اور ہر طرح کے انسانی حقوق حاصل رہے ہیں کشمیریوں نے تو خود ایک پارٹی ایک لیڈر کا نعرہ بلند کر کے اور ذہنوں پر وزنی تالے لگا کر اپنے آپ کو بیرونی دنیا سے الگ تھلگ کر دیا۔

آج کشمیری امن چاہتا ہے لیکن امن دور بھاگ رہا ہے۔ کشمیری بندوق سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن آج کوئی ایسا بزرگ سیاسی افق پر نہیں ہے کہ جسکی انگلی پکڑ کر کشمیری امن کو تلاش کر سکتا ہے اسے تو ادھار کی بیساکھیوں پر کھڑے رہنے کی عادت ہے اور آج سب بیساکھیاں ٹوٹ چکی ہیں۔

www.taemeernews.com

جموں، لداخ اور کشمیر باب ۳۰

کشمیر کے موجودہ المیہ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ کشمیر کی سیاسی لیڈرشپ اور مرکزی سیاسی قیادت نے دیدہ دانستہ طور پر یہ طے کر لیا کہ ریاست جموں کشمیر ۳ صوبوں پر مشتمل ریاست نہیں ہے بلکہ ریاست کا دوسرا نام صرف کشمیر ہے اور کشمیر کو ہی تعمیر ترقی کے معاملہ میں فوقیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے اندر اور باہر جب بھی بات کی جاتی ہے تو صرف کشمیر کے سوال پر غور ہوتا ہے اور اس غلط انداز سے ہوتا ہے جیسے ریاست کے نقشہ میں لداخ اور جموں کا وجود ہی نہیں ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کے راستے ہموار کرنے میں شیخ محمد عبداللہ اور نیشنل کانفرنس نے کلیدی رول کیا لیکن اس رول کو با مقصد بنانے میں جموں کے عوام نے بھی اہم رول کیا ہے۔ جموں تو اس حد تک ہندوستان کے ساتھ الحاق کے حق میں تھا کہ جموں کے عوام ہندوستان کے ساتھ مکمل ادغام کے حامی تھے اور اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جموں میں پرجا پریشد کی ایجی ٹیشن شروع ہوئی تھی۔ ایک بدھان ایک پردھان کے نعرہ نے جموں میں ہی جنم لیا۔ اس سے انکار نہیں کہ پرجا پریشد تحریک ایک جذباتی نوعیت کی رجعت پسند تحریک تھی اور اسے مہاراجہ ہری سنگھ اور راج دربار کی درپردہ حمایت شامل تھی لیکن عوامی حمایت اس تحریک کو اس وجہ سے حاصل رہی کہ کشمیر کی لیڈرشپ نے شعوری طور پر نہ تو جموں میں سیکولر تحریک کو ابھرنے دیا اور نہ ہی سیکولر روشن خیال لیڈرشپ کی حوصلہ افزائی کی۔ سیاسی اقتدار پر کشمیر کا قبضہ رہا۔ تعمیر و ترقی کے معاملہ میں بھی جموں کو نظرانداز کیا گیا جس سے جموں کی سیاست پر منفی اور کشمیری مخالف رجحانات حاوی ہو گئے۔

کشمیر میں جاگیردارانہ نظام اور راجواڑ شاہی کے خلاف تحریک پر پہلے ہی فرقہ واریت کا رنگ چڑھ گیا تھا اور آزادی کے بعد اس پر صوبائی تعصب بھی غالب رہا۔ حالانکہ جموں کے روشن خیال لیڈر بھی اس تحریک میں پیش پیش تھے۔ ان میں کامریڈ کرشن دیو سیٹھی۔ مرحوم گردھاری ڈوگرہ۔ مہاشے ناہر سنگھ۔ پنڈت ترلوچن دت۔ پنڈت موتی لام بیگڑہ۔ سردار بدھ سنگھ۔ سردار کلبیر سنگھ۔ مرحوم دھنونتری اور دوسرے ہندو لیڈر شامل تھے۔ چنانی کی تحریک بھی تو ہندوؤں نے لڑی تھی۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں راجواڑ شاہی سے آزادی حاصل کرنے کے بعد شیخ محمد عبداللہ اور نیشنل

www.taemeernews.com

کانفرنس کی لیڈر شپ نے جموں کی اس سیکولر لیڈرشپ کو نظر انداز کر کے جاگیر دارانہ نظام کے حامیوں اور راجواڑ شاہی کے ایجنٹوں کو ہی ترجیح دی۔ پہلی عوامی کابینہ میں وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ نے بخشی غلام محمد کو ہی نائب وزیر اعظم مقرر کر کے جموں کی سیاسی اہمیت کو ختم کر دیا۔ اپنی سوانح حیات میں شیخ محمد عبداللہ لکھتے ہیں۔

پہلی عوامی کابینہ میں بخشی غلام محمد کو وزیر اعظم کی حیثیت سے شامل کیا گیا۔یہاں پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ میں نے اپنے تمام ساتھیوں میں سے بخشی غلام صاحب کو ہی کیوں اپنی نیابت کے لئے چنا؟ اس سوال کا جواب ڈھونڈھنے کے لئے ان حالات پر نگاہ ڈالنا پڑے گی جن کا مجھے اس وقت سامنا تھا، ریاست میں ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ ریاست ہند اور پاکستان کے درمیان جنگ کا اکھاڑہ بنی ہوئی تھی۔ فرقہ پرستی کی آگ نے خاص طور پر شمالی ہندوستان کو ایک اژدہے کی طرح اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔ اس آگ سے جموں کا بڑا حصہ متاثر تھا، ایڈمنسٹریشن میں ابتری بپا تھی۔ ان تمام حالات کا مقابلہ وہی لوگ کر سکتے تھے جن میں خود اعتمادی، بے پناہ جرائت اور ہر قسم کی صورت حال سے نپٹنے کی ہمت موجود ہوتی۔ یہ گن بخشی صاحب میں بڑی حد تک پائے جاتے تھے۔ اگرچہ وہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن ان میں عوام سے رابطہ قائم رکھنے کا بڑا ملکہ تھا اس لئے اس وقت کے حالات کا مقابلہ کرنے میں وہی میرے معاون اور مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ میں نے ان کی ان تنظیمی صلاحیتوں سے فائدہ بھی اٹھایا۔ مگر بد قسمتی سے ان کی کمزوریاں اور کوتاہیاں بھی ان کی خوبیوں کی طرح بہت تھی۔ وہ نہایت ہی افلاس زدہ ماحول میں پلے بڑھے تھے۔ اور ان کی صحت بھی بچپن میں کچھ قابل تعریف نہ رہی تھی وہ غربت اور محتاجی کی تلخی چکھ کر جوان ہوئے تھے۔ ان کا کنبہ خاصا بڑا تھا۔ جس کے ارکان کو پیٹ پالنے کے لئے محنت مزدوری کرنا پڑتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس ماحول میں پروان چڑھنے کا بخشی صاحب کی سیرت پر کوئی بہت اچھا نقش نہیں پڑا۔ میں ان کی ان کمزوریوں کو جانتا تھا۔ کبھی کبھی تحریک کے دوران بھی ان کے کردار کی یہ کوتاہیاں سطح پر آتی رہتی تھیں۔ لیکن مجھے امید میں آہستہ آہستہ ان کی ان کمزوریوں پر قابو حاصل کر سکوں گا۔ اور ان کے اندر جا گزیں مثبت پہلوؤں کو ابھار کر قوم کو فائدہ پہنچا سکوں گا۔ ان کی ان کمزوریوں کو مہاراجہ ہری سنگھ نے بھی تاڑ لیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے بخشی صاحب کو اپنے شیشے میں اتارنے کے لئے انھیں ایک موٹر گاڑی اور کچھ دوسرے تحائف بھی پیش کی تھی۔ جو کہ بخشی صاحب نے چپکے چپکے قبول کر لی تھیں۔ہم سے اجازت لینا تو درکنار انھوں نے ہمیں اس کی اطلاع دینا بھی گوارہ نہ کیا تھا۔ جب یہ معاملہ طشت از بام ہو گیا تو ساتھیوں نے بخشی صاحب پر انگلیاں اٹھانا شروع کر دیں۔ لیکن میں نے کسی طرح معاملے کو رفع دفع کر دیا۔ بد قسمتی کی انتہا یہ ہوئی کہ ان کے خاندان کے

www.taemeernews.com

تقریباً ہر فرد نے بخشی صاحب کے مرتبے کا فائدہ اٹھانا چاہا۔ اور دولت کی بھوک مٹانے کے لئے ہر طرح سے ہاتھ پیر مارنا شروع کر دیئے۔ سونے پہ سہاگہ یہ تھا کہ بخشی صاحب ان کوششوں کی صرف پوشی ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ہر ممکن حد تک ان کو کامیاب بنانے کے لئے بھی کوشاں رہتے تھے۔ میں کبھی کبھی فہمائش اور کبھی طنز و مزاح کے انداز میں بخشی صاحب کو سمجھاتا رہا کہ ایسا کرنے سے تمام تحریک کو نقصان پہنچے گا۔ لیکن وہ تجاہل عارفانہ سے کام لیتے اور اپنی سی کرتے رہتے۔ بچپن کی محرومیاں ان کے خون میں ایسی رچ بس گئی تھی کہ وہ ان کا ازالہ کرنے کے لئے جائز و ناجائز کی تمیز کھو بیٹھے تھے۔ کیا معلوم تھا کہ میرے بد ترین اندیشے سچے ثابت ہوں گے اور ان کی ان نفساتی کمزوریوں کی وجہ سے بعد میں تحریک اور خود کشمیر کو کوئی نقصان اٹھانا پڑے گا۔

بہرحال یہ تو تھا جملہ معترضہ۔ ۵۔ مارچ ۱۹۴۸ء کو نئی کابینہ نے حلف اٹھایا۔ اور کام میں جٹ گئی۔ کابینہ کے تشکیل سے کچھ دوستوں کے شیشہ سکون میں دراڑ پڑ گئی۔ ہمارے ساتھیوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو وزارت میں آنا چاہتے تھے۔ لیکن میں نے انھیں انتظامیہ کے دوسرے فرائض سونپنا زیادہ مناسب خیال کیا۔ انتظامیہ ایک بنیاد ہے۔ جس پر قومی نظام کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ اگر یہ بنیاد مضبوط بنے تو عوام کا بھلا کیا جاسکتا ہے۔ وزرا ایک پالیسی ترتیب دیتے ہیں۔ اس کو عملی جامہ پہنانا انتظامیہ کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے خواجہ غلام نبی کو گورنر کشمیر اور غلام محمد شاہ کو سپلائیز کا ڈائیر کٹر بنایا۔ محمد امین وکیل کو ڈوڈہ کا ڈپٹی کمشنر مقرر کیا۔ اور کچھ دوسرے کارکنوں کو مختلف عہدے سپرد کر دیئے۔ یہ بات پہلے پہل انھیں ناگوار تو گذری مگر اس سے کافی فائدہ حاصل ہوا۔ اور ایڈمنسٹریشن میں ایک نئی جان آ گئی۔ خواجہ محی الدین قرہ خواجہ غلام محمد صادق کے چچیرے بھائی اور برادر نسبتی تھے۔ ان کا تحریک میں ضرور حصہ رہا تھا۔ اور وزیر بننے کے بڑے شوقین تھے۔ لیکن میرے لئے ایک ہی خاندان سے دو افراد کو کابینہ میں لینا ممکن نہ تھا۔ صادق صاحب قرہ صاحب سے عمر میں بڑے تھے۔ اور رشتہ بھی بڑے قربت کا رکھتے تھے۔ اس لئے میری نظر انتخاب پہلے ان پر ہی پڑی۔ محی الدین صاحب روٹھ کر نیشنل کانفرنس سے الگ ہو گئے اور ایک نئی جماعت پولیٹکل کانفرنس قائم کر بیٹھے۔ بعد میں انھوں نے پاکستان سے خفیہ رابطہ قائم کر لیا۔ اور سرحد پار سے مالی امداد کے نام سے کافی پونجی بٹوری۔ کچھ نوجوانوں کو اپنے ساتھ رکھا۔ تھوڑا سا حصہ ان میں بھی بانٹا کرتے تھے۔ اگرچہ انھوں نے کھلم کھلا پاکستان زندہ باد کا نعرہ بھی لگایا لیکن کوئی خاص اثر پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بلکہ "کشمیر چھوڑ دو" تحریک میں جو نام پیدا کیا تھا اس پر بھی اوس پڑ گیا۔

کشمیر کی سیاسی قیادت نے کبھی بھی جموں میں ٹھوس نظریاتی بنیادوں پر سیکولر

www.taemeernews.com

تحریک کو ابھرنے کا موقع نہیں دیا حالانکہ جموں میں سیکولر تحریک کے لئے ترقی پسند لیڈروں نے زمین کو زرخیز بنا دیا تھا۔ کشمیری لیڈرشپ جموں کی اس قیادت سے خوفزدہ تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ جموں میں ایسی کوئی تحریک شروع ہو جائے جو تعمیر ترقی میں برابر کا حصہ مانگنے کا رخ اختیار کرے۔ ۱۹۵۲ء میں جموں کے ممبران اسمبلی نے جس کا تعلق نیشنل کانفرنس سے تھا کرشن دیو سیٹھی اور رام پیارا صراف کی قیادت میں جموں کے ساتھ ناانصافی پر زور دار بحث شروع کی اور وزیر اعظم کو ایک میمورنڈم پیش کیا۔ جموں کے ان لیڈروں کے بدلتے تیور دیکھ کر شیخ محمد عبداللہ اور بخشی غلام محمد نے سازش کر کے جموں کی لیڈرشپ کو کنارے لگانے کے لئے ایسے افراد کی حوصلہ افزائی کی جو کسی نہ کسی حیثیت میں نہ صرف مہاراجہ کے راج دربار سے وابستہ رہے تھے بلکہ ۱۹۴۸ میں جموں کے مسلمانوں کے قتل عام میں بھی ملوث رہے تھے۔ ان افراد کو جموں میں نظریاتی سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ راج بھگت لیڈرشپ تھی۔ وہ صرف جے مہاراجہ کے فرسودہ نعرے پر زندہ رہتے ہوئے اپنے نجی مفادات کا تحفظ کرتی تھی۔ راج بھگت لیڈر سرمایہ بٹورنے میں مصروف رہے اور کشمیر کی سیاسی قیادت کشمیر کی ترقی اور کشمیریوں کی معاشی بدحالی دور کرنے کی طرف متوجہ رہی۔ جموں کے سیکولر لیڈروں نے کشمیر لیڈرشپ کی اس صوبہ پرستی اور رجعت پسندی کے خلاف کافی مدت تک ڈٹ کر لڑائی لڑی لیکن جموں کے راج بھگتوں کے سامنے دیانتداری۔ خلوص۔ عوامی خدمت کا جذبہ دم توڑ گئی۔

لداخ تو سیاسی طور سے ایک پسماندہ ترین صوبہ تھا۔ وہاں تو نیشنل کانفرنس کا وجود بھی نہیں تھا۔ لیہہ میں بودھ لاما اور کرگل میں شیعہ مولوی سیاسی اور سماجی زندگی پر چھا گئے تھے ۱۹۴۷ کے بعد شیخ محمد عبداللہ نے ان حالات کو بدلنے کی کوشش نہیں کی بلکہ بودھ لاماؤں اور شیعہ مولویوں کو ہی ترجیح دے کر لداخ کی پسماندگی کو جوں کا توں رہنے دیا۔ بودھ لاما اور شیعہ مولوی ایسے استحصالی گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو غربت۔ بیماری۔ بھوک اور بیماری کو اللہ کی نعمت قرار دیتے رہتے تھے اور اس تصور کو ختم کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ کشمیر کی لیڈرشپ بھی یہی چاہتی تھی کیونکہ وہ لداخ کو بھی تعمیر و ترقی میں شریک بنانے کے حق میں نہیں تھی۔ لداخ کو تعلیمی طور پر نظرانداز کر دیا گیا۔ جہاں کشمیر میں یونیورسیٹی۔ میڈکل اور انجینرنگ کالج کے ساتھ پرائمری اور ہائر سیکنڈری اسکولوں کا جال بچھایا گیا۔ ہر ضلع میں ڈگری کالج کھولا گیا وہاں ۱۹۸۹ تک لداخ میں ڈگری کالج نہیں کھولا گیا۔ ذہنی پسماندگی اس حد تک پسماندہ تھی کہ خواجہ غلام محمد صادق کے زمانے میں جب کرگل میں جدید اسٹیڈیم تعمیر کرانے کا منصوبہ بنایا گیا تو شیعہ لیڈر شپ نے اسے اسلام مخالف قرار دے کر اسے تعمیر نہیں ہونے دیا حالانکہ اسٹیڈیم کا اسلام کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ لداخ کے دور دراز علاقے جو سال میں کئی کئی ماہ باقی دنیا سے کٹ

www.taemeernews.com

کر رہ جاتے ہیں وہاں تو ترقی نفی کے برابر ہوئی۔ لداخ کے چند ہی اہم گھرانوں کے بچے کشمیر پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ البتہ مسالی روڈ کی تعمیر سے جب لداخ باقی دنیا کے نزدیک آ گیا تو لداخ میں بھی ذہنی بیداری کا عمل شروع ہوا۔ لداخیوں میں یہ احساس بڑھنے لگا کہ کشمیری لیڈرشپ انہیں دیدہ دانستہ طور پر پسماندہ رکھنا چاہتی ہے اور پہلی بار لداخیوں نے بے اطمینانی کا اظہار کیا۔ آوازیں سنائی دینے لگیں کہ لداخیوں کو نظرانداز کیا جارہا ہے۔ لیہ میں کوشک بکولا کے خلاف بودھوں میں بغاوت شروع ہوئی اور مرحوم غلام محمد صادق کے دور میں اس بغاوت نے ایسا رخ اختیار کیا کہ کوشک بکولہ کے نہ چاہتے ہوئے بھی لیہ کے ایک پڑھے لکھے نوجوان پی نمسگل کو قانون ساز کونسل کا ممبر بنایا گیا حالانکہ ان کے انتخاب میں میرا اور لیہ کے ایک مسلمان نوجوان اکبر لداخی کا نمایاں رول تھا۔ کرگل سے ایک ریٹائیرڈ فوجی افسر کاچو علی محمد کو قانون ساز اسمبلی کا ٹکٹ دے کر کرگل سے کامیاب کر دیا گیا۔ لیہ سے تعلق رکھنے والے ایک دیانت دار سرکردہ انجینیر صنم نرلو بھی ایک نئے مسیحا کے طور پر ابھرنے لگے اور پہلی بار کشمیر کی لیڈرشپ کو لداخ کی طرف توجہ دینے پر مجبور ہونا پڑا لیکن ان برسوں میں لداخ میں اینٹی کشمیری احساس اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ لداخ کو مرکز زیر انتظام علاقہ قرار دینے کے مطالبے شروع ہوئے۔ اس کا توڑ کرنے کے لئے کرگل میں مسلم آبادی کو لیہ کی بودھ آبادی کے خلاف منظم کیا جانے لگا جس کا براہ راست نتیجہ یہ نکلا کہ لیہ میں بھی بودھوں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی ہوگئی۔ بودھ اور مسلمان آپس میں لڑتے بھی رہے اس صورت حال کے لئے بھی کشمیری لیڈرشپ ذمہ دار تھی۔

اسی پس منظر میں جب ریاست کے سیاسی حالات کا محاسبہ دیانت داری سے کیا جائے گا تو واضح ہوگا کہ اس صورت حال کے لئے کشمیر کی سیاسی لیڈرشپ کی مرکز کو بلیک میل کرنے اور لداخ جموں کو نظرانداز کرنے کی پالیسی ذمہ دار ہے۔ جموں اور لداخ کو نہ صرف تعلیم و ترقی کے معاملہ میں نظرانداز کیا گیا بلکہ سیاسی سطح پر بھی ان دونوں صوبوں کو کوئی اہمیت نہیں دی تمام تر توجہ کشمیر کی طرف اور اقتدار پر کشمیریوں کی گرفت کو مضبوط کرنے کی طرف ہی قدم اٹھتے گئے۔ سیاسی جماعتوں نے بھی ۱۹۴۷ کے بعد جموں اور لداخ کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی حالاں کہ حکمراں جماعتیں ہمیشہ لداخ اور جموں کی سیاسی حمایت سے ہی سیاسی طور پر زندہ رہیں۔ شیخ محمد عبداللہ نیشنل کانفرنس کے صدر ۱۹۵۳ تک بنے رہے۔ بعد میں بخشی غلام محمد نے اسی روایت کو بحال کیا اور جب شیخ محمد عبداللہ نے ۱۹۷۵ میں اقتدار پھر سنبھال لیا تو وہ پھر نیشنل کانفرنس کے صدر بن گئے اور بعد میں انھوں نے اپنے بیٹے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو اپنا جانشیں نامزد کیا۔ ۱۹۶۴ میں جب کانگرس نے باضابطہ طور پر ریاست میں کام کرنا شروع کیا تو سید میر قاسم نے

www.taemeernews.com

صدارت سنبھال لی اور ان کے بعد محمد ایوب خان۔ مفتی محمد سعید۔ محمد شفیع قریشی اور بعد میں غلام رسول کار کانگرس کے لیڈر نامزد ہوتے رہے۔ ۱۹۷۵ میں شیخ محمد عبداللہ نے اقتدار سنبھالنے کے بعد نیشنل کانفرنس کو پھر زندہ کیا تو سید میر قاسم کانگرس پارلیمانی پارٹی کے لیڈر بنائے گئے۔ ان کے استعفا کے بعد گرداری لال ڈوگرہ لیڈر نامزد کئے گئے لیکن پردیش کانگرس صدر مفتی محمد سعید نے اس خوش فہمی میں کہ شیخ محمد عبداللہ سے حمایت واپس لے کر گورنر کو سرکار بنانے کی دعوت دے گی خود ہی اعلان کر دیا کہ انہیں کانگرس پارلیمانی پارٹی کا لیڈر منتخب کیا گیا ہے اور گرداری لال ڈوگرہ کو نائب لیڈر۔ اس کے بعد جب ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے دور میں کانگرس پارلیمانی پارٹی کا صدر منتخب کرنے کا موقعہ آیا تو پارٹی کے ساتھ وفاداری کی بنا پر جموں کے کسی کانگرسی کو لیڈر بننا چاہئے تھا لیکن بنایا گیا مولوی افتخار حسین انصاری کو حالانکہ انھوں نے نے مرکز میں کانگرس کی شکست کے بعد جنتا پارٹی کے گھاٹ پر پانی پی لیا تھا۔ سوال جموں کا نہیں تھا بلکہ کشمیر کی سیاسی اہمیت کو برقرار رکھنے کا تھا اس لئے پنڈت ترلوچن دت جیسے سیاسی لیڈر کو نظر انداز کر دیا گیا۔ جمہوری روایات کا تقاضا تھا کہ چونکہ کانگرسی ممبران اسمبلی کی اکثریت جموں کے ممبران کی تھی اس لئے جموں کے ہی کسی ممبر کو لیڈر منتخب کیا جاتا لیکن اسکے باوجود ترجیح کشمیر کو ہی دی گئی۔ کامریڈ موتی لال مصری ایک طویل مدت تک زیر زمین اور اور گراونڈ کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری رہے۔ لیکن ایک وقت آیا کہ مرکزی کمیونسٹ پارٹی نے ان پر پنڈت ہونے کا لیبل لگا کر انہیں اس عہدے سے ہٹا کر ایک مسلمان کو جنرل سکریٹری بنا دیا۔

۱۹۴۷ کے بعد ہی سے کشمیری لیڈر شپ نے یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ جموں اور لداخ کو نظر انداز کیا جا رہا ہے خاموشی اختیار کر لی اور اس خاموشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج مرکزی قیادت کی سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ وہ کشمیر کا مسئلہ کیسے حل کرے۔ نظر انداز کرنے کے باوجود جموں اور لداخ کے عوام نے نہ تو بندوق اٹھائی اور نہ ہی شورش برپا کی حالانکہ اگر وہ ایسا کرتے تو وہ حق و جانب تھے۔ کشمیریوں کے لئے بندوق اٹھانے اور ہندوستان کے خلاف بغاوت کرنے کا جواز ہی نہیں تھا۔ کشمیریوں کو ہر طرح کی آزادی حاصل رہی۔ اس حد تک آزادی کہ انہیں ہندوستان کے کتو واپس جاؤ کا نعرہ بلند کرنے کی بھی اجازت تھی۔ مذہبی آزادی اس حد تک کہ سکریٹریٹ کے ساتھ ساتھ ہائی کورٹ کے اندر بھی مسجدیں بنائی گئی۔ کسی نے روکا نہیں۔ سڑکوں پر جمعہ کو ٹریفک بند کر کے نماز جمعہ ادا کرنے کی بھی کھلی اجازت دی گئی۔ کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ کسی کے ماتھے پر شکن نہیں پڑی۔ کشمیریوں کو ہر طرح کی آزادی اور جمہوری حقوق حاصل رہے۔ تعمیر و ترقی کے محاذ پر کشمیریوں کے لئے اربوں روپے حکومت ہند نے خرچ کئے۔ لیکن اس کے باوجود مسلح بغاوت شروع ہوئی جبکہ جموں اور لداخ کے عوام نے اپنے مسائل کے لئے

www.taemeernews.com

پرامن راستے اختیار کئے۔

جموں اور لداخ کے لوگوں نے کبھی بھی اسمبلی یا لوک سبھا انتخاب میں نہ تو حکمراں پارٹی کے لئے اور نہ ہی اپوزیشن کے لئے RIGGING کی۔ کسی رٹرننگ افسر نے حلف نامے پر کسی ممبر اسمبلی کے بلامقابلہ منتخب ہونے کا اعلان بھی نہیں کیا۔ اس کے برعکس شیخ محمد عبداللہ کے زمانے سے ہی کشمیریوں نے کبھی شیخ محمد عبداللہ کے لئے کبھی بخشی غلام محمد کے لئے۔ کبھی سید میر قاسم کے لئے اور کبھی ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے لئے وسیع پیمانے پر RIGGING کی۔ اس RIGGING کے لئے کشمیر میں کسی مرکزی لیڈر نے مداخلت نہیں کی۔ خود کشمیر کے مسلمانوں نے اپنی مرضی سے اس غیر جمہوری فریضہ کی حمایت کی۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا آج تک کسی جمہوری ملک میں کسی ایک فرد واحد پر لوگوں نے اس حد تک اندھا وشواس کیا جس طرح کشمیریوں نے شیخ محمد عبداللہ پر کیا۔ کیا آج تک اس نوعیت کے نعرے کسی بھی جمہوری ملک میں سنے گئے" تی کرے تی کرے ب کری ب کری۔ آکہ کری دانگس کری ب کری ب کری" یعنی جو کرے گا شیخ محمد عبداللہ کرے گا۔ بیگس بنائے یا کدو بنائے ب ہی بنائے گا ب ہی بنائے گا" کیا آج تک کسی جمہور نواز لیڈر نے یہ تاثر قایم رہنے دیا کہ" چنار کے ہر پتے پر شیخ محمد عبداللہ کا نام قدرت نے لکھ دیا ہے" کشمیری مسلمانوں نے اپنے انفرادیت اور اپنا تشخص شیخ محمد عبداللہ کی ذات میں ضم کر دیا تھا اور اس اندھے وشواس کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ" کینسر کے مریض بھی شیخ محمد عبداللہ کے پاس شفا کے لئے جایا کرتے تھے ہندوستان کے چند دانشور۔ سیاست داں اور اخبارات دعوا کرتے ہیں کہ کشمیر میں ۱۹۷۷ میں پہلی بار جنتا دور کے زمانے میں غیر جانبدارانہ چناؤ ہوئے یہ دعوا بالکل بے بنیاد اور جھوٹا ہے۔ RIGGING ۱۹۷۷ میں بھی ہوئی اور وسیع پیمانے پر ہوئی۔ نیشنل کانفرنس نے عوامی حمایت سے نیشنل کانفرنس مخالف ووٹروں کو چناؤ بوتھوں تک پہنچنے ہی نہیں دیا اور اگر کوئی نظر بچا کر بوتھ میں داخل ہوا تو اسے ووٹ کا ستعمال کرنے سے روک دیا گیا۔ افسر بھی کشمیری اور ووٹ چوری کرنے والے بھی کشمیری۔ حریت کانفرنس میں شامل چند لیڈر آج ماتم کر رہے ہیں کہ کشمیر میں چناؤ کبھی بھی آزادانہ نہیں ہوئے۔ حالانکہ یہ لیڈر ہر چناؤ میں اسی حکمت عملی کو اپنا کر کامیاب ہوتے رہے ہیں جس حکمت عملی سے حکمراں جماعتوں کے امیدوار کامیاب ہوتے رہے ہیں۔

کشمیر میں شورش کا تجزیہ کرتے وقت بار بار یہ شکایت کی جارہی ہے کہ مرکز نے کشمیریوں پر کبھی اعتبار نہیں کیا۔ کشمیریوں کی غربت۔ بھوک اور بے روزگاری کو ختم کرنے کی طرف سنجیدہ توجہ نہیں دی گئی۔ کشمیر کی اندرونی خود مختاری کو سلب کیا گیا۔ ۹۔ اگست ۱۹۵۳ میں جواہر لال نہرو نے کشمیر میں ڈیرہ ڈال کر شیخ محمد عبداللہ کو اقتدار سے نہیں ہٹایا۔ شیخ

www.taemeernews.com

محمد عبداللہ کو ان کے ہی اپنے کشمیری ساتھیوں نے ایک منصوبہ کے تحت گرفتار کرلیا۔ اگر شیخ صاحب کے اپنے ساتھی غداری پر آمادہ نہ ہوتے تو دنیا کی کوئی طاقت شیخ محمد عبداللہ کو نہ تو گرفتار کرسکتی تھی اور نہ ہی اقتدار سے ہٹا سکتی تھی۔ آئین ساز اسمبلی کے چند ممبران نے بخشی غلام محمد پر ایمان نہیں لایا ان کو کسی نے مجبور نہیں کیا ایمان لانے کے لئے۔ وہ جب ایمان لائے تو بھاری قیمت وصول کرکے ایمان لائے۔ خواجہ غلام محمد صادق کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک مرکز کے اشارے پر نہیں بلکہ ممبران اسمبلی نے بخشی غلام محمد کی قیادت میں عدم اعتماد کی تحریک شروع کی۔ ایک رات ان ممبران نے عدم اعتماد کی تحریک پر دستخط کئے اور دوسری صبح بخشی غلام محمد کی گرفتاری کے چند گھنٹوں بعد ہی مرحوم در گاپرشاد در کے مکان پر قسمیں اٹھا اٹھا کر انہیں یقین دلایا کہ ہم نے دستخط نہیں کئے۔ یہ جعلی دستخط ہیں۔ حالانکہ میرے سامنے ان تمام ممبران نے دستخط کئے تھے۔ان ممبران میں عبدل غنی گونی۔ ستہ کوجی۔ غلام نبی دانی سوگامی۔ عبدالرحمان۔ صوفی غلام محمد وغیرہ شامل تھے۔ دل بدلی کی معقول اجرت ان تمام ممبران اسمبلی کو دی گئی۔ خواجہ غلام محمد صادق کے خلاف ایک اور عدم اعتماد کی تحریک خود کانگرس ممبران اسمبلی نے سید میر قاسم کو ڈھال بنا کر شروع کی۔ ان میں غلام رسول کار۔ مفتی محمد سعید۔ میاں بشیر۔ مرزا عبدالرشید۔ چودھری محمد حسین۔ چودھی محمد اسلم۔ عبدالرحمان ڈار۔ منوہر ناتھ کول۔ مکھن لال فوطیدار۔ عبدالعزیز پرے۔ محمد یعقوب بٹ۔ عبدال خالق میر۔ پیر حسام الدین۔ عبدالعزیز زرگر۔ غلام محمد میر بجن۔ سردار کلبیر سنگھ۔ غلام نبی مرچا۔ منجاب سنگھ۔ محمد سلطان تانترے پیر یحی صدیقی۔ بنسی لال کوہستانی۔ عبدالقیوم۔ ماسٹر بیلی رام۔ محمد انور خان۔ منگت رام۔ سردار سریندر سنگھ۔ عبدالغنی لون (حریت کانفرنس) اور پنڈت ترلوچن دت شامل تھے۔ آج کانگرس کے چند لیڈر دعوا کررہے ہیں کہ " ہمیں معلوم ہی نہیں تھا کہ دستخط کس کاغذ پر کروائے گئے" یہ تو سب مرکزی لیڈرشپ کے اشارے پر ہو رہا تھا۔ اگر یہ بات تسلیم بھی کی جائے تو ایسے لیڈروں کو یہ بھی تسلیم کرنا چاہیئے کہ ان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ تو مٹی کے مادھو تھے۔ میں اس سیاسی بلیک میل کا نہ صرف چشم دید گواہ ہوں بلکہ خود خواجہ غلام محمد صادق کے خلاف اتنے ڈھیر سارے مٹی کے مادھو کو دہلی لے جانے میں میرا بہت بڑا رول تھا۔ رات کے اندھیرے میں مجھے جان ہتھیلی پر لے کر میاں بشیر۔ چودھری محمد اسلم۔ مرزا عبدالرشید۔ چودھری محمد حسن اور عبدالرحمان بٹ کو پٹھان کوٹ لے جانا پڑا۔ کیونکہ پانچوں کو یہ خطرہ تھا کہ انہیں گرفتار کیا جائے گا۔ انھوں نے صادق صاحب کو "قرآن کی قسم کھا کر یقین دلایا تھا کہ وہ ان کے وفادار ہیں۔" صادق صاحب کی کوٹھی پر سے میری تحریک پر سید میر قاسم کی کوٹھی پر گئے اور انہیں یقین دلایا کہ " ہم تو سید زادوں کے غلام ہیں ہم آپ سے غداری نہیں کرسکتے، ۱۹۸۷ میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی سرکار

www.taemeernews.com

کس نے گروائی۔ انکے اپنے بہنوئی اور ۱۴ ممبران اسمبلی نے اور اس غداری کے لئے پردیش کانگرس کے مفتی محمد سعید، مولوی افتخار حسین انصاری اور لالہ تیرتھ رام سے بھرپور معاوضہ حاصل کیا۔

کشمیر میں ۱۹۴۷ کے بعد کشمیری لیڈرشپ نے جو بھی سیاسی کھیل کھیلے وہ بند کئے جا سکتے تھے۔ لیکن مرکزی سرکار کشمیریوں کے سیاسی بلیک میل کے سامنے جھکتی رہی اور اسطرح حالات بگڑتے گئے۔ مرکز نے ہمیشہ اس سیاسی بلیک میل کے سامنے Passive رول کیا اور جب ACTIVE رول کرنے کا زمانہ آیا تو بندوق حائل ہوگئی۔ کشمیر کی موجودہ صورت حال کے لئے کشمیریوں کے ساتھ ساتھ خود کشمیری لیڈرشپ مجرم ہے جس نے کبھی مزید مراعات حاصل کرنے کبھی ذاتی مفادات کے تحفظ کے لئے اور کبھی مرکز کو بلیک میل کرکے مزید رعایتیں حاصل کرنے۔ کے لئے غیر جمہوری رجحانات کو تقویت پہنچائی۔ کشمیری اس حقیقت کو بخوبی جانتا ہے کہ " ہندوستان نے کشمیر کو دیا ہی دیا ہے بدلے میں کشمیر سے کچھ بھی نہیں لیا ہے۔" لیکن اس کے باوجود وہ خاموش ہے کیونکہ وہ بھی تو ایک مجرم ہے۔ عام کشمیری کی مجرمانہ خاموشی نے ہی تو آج اسے تباہی کے دہانے پر کھڑا کر دیا ہے۔ ۱۹۸۹ میں جب شورش شروع ہوئی اور اس شورش کا پہلا نشانہ کشمیری پنڈتوں کو بنایا گیا اگر اس وقت تحریک کے سیاست دانوں اور کشمیری مسلمانوں نے احتجاج کیا ہوتا تو قاتلوں۔ راہزنوں اور زانیوں کے حوصلے ٹوٹ جاتے۔ ایک سیلاب آیا اور اس میں ہر کوئی بہہ گیا۔ پنڈت بھاگ گئے تو قوم پرست مسلمانوں۔ مسلمان لیڈروں اور عام بے گناہ مسلمانوں کو نشانہ بنایا گیا لیکن اس سے بھی کشمیری مسلمان خوفزدہ نہیں ہوا وجہ صرف یہ تھی کہ کشمیری مسلمان کو یقین تھا کہ کشمیر آزاد ہو جائے گا۔ اسلامی مملکت بننے والی ہے۔ اعلا سرکاری افسر جو بندوق کے خوف کا رونا رو رہے ہیں وہ بھی تو اس اسلامی مملکت کے خواب میں ایسے محو تھے کہ انھوں نے بھی شورش کی حمایت کی۔

آج شورش کا سحر ٹوٹ گیا ہے۔ آج پاکستان کی اسلام نوازی بھی بے نقاب ہوگئی ہے۔ آج افغانستان سے روسی فوجوں کو باہر نکالنے سے خون میں پیدا ہوئی حرارت بھی ٹھنڈی پڑ گئی ہے آج ہر کوئی امن کا خواہاں ہے لیکن امن کشمیریوں سے دور بھاگ رہا ہے۔ آج دہشت گرد نہ تو قومی ہیرو ہے اور نہ ہی اس کی ہلاکت پر شہید مزار تعمیر ہو رہے ہیں لیکن پھر بھی سرد جنگ جاری ہے۔ وجہ یہ نہیں کہ کشمیری امن کی بحالی نہیں چاہتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کی انگلی پکڑ کر اسے چلانے والا کوئی بزرگ نہیں ہے۔ کشمیری تو ہمیشہ سے ادھار کی بیساکھی پر کھڑا رہا ہے۔ آج تمام بیساکھیاں ٹوٹ گئی ہیں اور بیساکھیوں کے سہارے بغیر کشمیری کھڑا نہیں ہو سکتا۔

www.taemeernews.com

رائے شماری کے لئے شیخ محمد عبداللہ کی ۲۲ برس تک سرد گرم جنگ کا تجزیہ کرنے سے صاف نظر آتا ہے کہ تحریک فرقہ واریت سے پاک نہیں تھی۔ ہندوستان کو ایک ہندو ملک قرار دے کر ہندؤوں کے خلاف نفرت کے بیج بو دئے گئے۔ ہندؤوں اور مسلمانوں کے بیچ ایک اونچی دیوار کھڑی کی گئی اور نفرت کا زہر آہستہ آہستہ کشمیر کی سیاسی زندگی میں سرایت کرنے لگا۔ ۱۹۸۹ میں شورش شروع ہوتے ہی نظام مصطفے قائم کرنے اور کشمیری ہندؤوں کو بھگانے کا جو عمل شروع ہوا اس کے لئے زمین ہموار کی گئی تھی۔ کشمیری پنڈتوں کے بارے میں شیخ محمد عبداللہ نے اپنے سوانح حیات آتش چنار میں لکھا ہے"

جب ۱۹۳۱ء میں تحریک کشمیر آزادی کا آغاز ہوا تو مہاراجہ کی انتظامیہ پر کشمیری پنڈتوں کا غلبہ تھا۔ سر تیج بہادر سپرو۔ کے۔ وائل، اے۔ کے۔ وائل، اور کیلاش نارائن ہکسر کی مہاراجہ کے ساتھ گاڑھی چھنتی تھی۔ چناچہ جب یہاں کے عوام نے اپنی مظلومیت کے خلاف آواز بلند کی تو وہ ڈوگرہ مہاراجوں نے کشمیری پنڈتوں کو اپنے مفادات کی ڈھال کے طور پر استعمال کیا اور انھیں اس بات کی شہ دی کہ دراصل یہ ہندو مہاراجہ کے خلاف مسلمانوں کی بغاوت ہے۔ ایک پرانے کشمیری پنڈت راجہ ہری کرشن کول کو وزیر اعظم مقرر کرکے اس کے ہاتھوں ظلم و ستم کا دور روا رکھا۔ افسوس یہ ہے کہ ایک عرصے تک کشمیری پنڈت جیسے روشن خیال لوگ اس جھانسے میں رہے اور انھوں نے سارے ہندوستان کے ہندو پریس میں" کشمیری پنڈت خطرے میں" کا شور بپا کر ڈالا۔ مگر ہم بار بار انھیں یقین دلاتے رہے کہ یہ تحریک ہرگز غیر مسلموں یا کشمیری پنڈتوں کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ یہ ظالم و مظلوم کی لڑائی ہے۔ جہاں ظالموں مین غیر مسلموں کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی موجود ہیں وہاں مظلوموں کی صف میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم اور کشمیر پنڈت بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن جب کچھ معمولی سرکاری نوکریاں مسلمانوں کو بھی ملنے لگیں تو کشمیری پنڈت صاحبان گھبرا گئے کہ ان کے رزق کا آخری نوالہ بھی چھن جائے گا۔ چناچہ انھوں نے اس کے خلاف" روٹی ایجی ٹیشن" کے نام سے ایک ہنگامہ کھڑا کرلیا لیکن جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ یہ جلد ہی ایک مذاق میں تبدیل ہو گیا۔ اور اپنی موت آپ مر گیا۔ انھوں نے مہاراجہ کو ایک میمورنڈم پیش کیا۔ اس میں کشمیری پنڈتوں کے لیے علاقہ کو نگام میں ایک الگ پنڈت وطن (REGION) بنانے کی مانگ بھی کی۔ آخر کار تاریخ کی منطق اس طبقے کے چند ترقی پسند نوجوانوں کو اپیل کرنے لگی۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز نے گلینسی کمیشن میں کہا کہ مسلمانوں کے مقابلے میں کشمیری پنڈتوں کی حالت بہت بہتر ہے۔ کیشپ بندھو، جیالال کلہم اور دوسرے لوگ بھی ہمارے ہم خیال ہونے لگے اور آخر کار مسلمان اور پنڈت لیڈروں کے مشترکہ دستخطوں سے وہ قومی منشور NATIONAL DEMAND والی دستاویز سامنے آ گئی جو

www.taemeernews.com

نیشنل کانفرنس کے قیام کا پہلا پتھر ثابت ہوئی۔ جب ۱۹۸۲ء میں نیشنل کانفرنس کا وجود عمل میں آیا تو کچھ عرصہ کے لیے پنڈت ہمارے کاندھے سے کاندھا ملاتے ہوئے آگے آئے لیکن انھیں بھی یہ احساس ہونے لگا کہ آزادی کا مطلب یہ ہے کہ مظلوموں کی اکثریت ان کے حقوق ملیں گے اور سوا اتفاق سے اس اکثریت میں مسلمانوں کا حصہ بڑا تھا تو انھیں طبقاتی برتری پر زور پڑنے کا اندیشہ محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ وہ طرح طرح کے بہانوں سے نیشنل کانفرنس سے الگ ہونے لگے اگرچہ اس کے باوجود بھی بعض روشن خیال اور دور اندیش پنڈت نوجوان نیشنل کانفرنس کے کام میں جوش و خروش سے شریک رہے لیکن سچ تو یہ ہے ان کی حیثیت طبقاتی سے زیادہ ذاتی اور انفرادی تھی۔ طبقاتی حیثیت سے تو وہ مجموعی طور پر نیشنل کانفرنس اور تحریک آزادی سے بڑے دھارے سے کٹے ہی رہے۔ چنانچہ خود جواہر لال نہرو کو کشمیری پنڈتوں کے گروہ۔ شیتل ناتھ۔ میں جا کر انھیں فہمائش کرنا پڑی اور انھیں مشورہ دینا پڑا کہ وہ ظالم اور مظلوم کی اس جدوجہد میں ظالموں کے خلاف کھل کر آ جائیں اور نیشنل کانفرنس کی صفوں کو مضبوط بنائیں۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ دلچسپ ہے۔ جواہر لال نہرو نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ کشمیری پنڈت سماجی سطح پر مسلمانوں کے ساتھ چھوت چھات سے پرہیز کریں۔ اس وقت تو پنڈت خاموش رہے لیکن دوسرے روز جواہر لال کے پاس ایک وفد آیا اور ان سے کہا کہ انھوں نے سماجی سطح پر چھوت چھات کی جو بات کہی تھی وہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے شادی بیاہ میں ماشکی اور دوسرے مزدور مسلمان ہی ہوتے ہیں۔ جواہر لال نے ایک قہقہہ لگا کر کہا کہ "جی ہاں، ماشکی تو ہوتے ہیں۔ لیکن رسوئی میں اور دستر خوان پر انھیں آنے کی اجازت نہیں۔"

پنڈت صاحبان نے نہرو جی کی یہ فہمائش تو اپنے روایتی اخلاق سے سنی۔ مگر "پرنالہ وہیں کا وہیں بہنے لگا۔" کے مصداق مطلق العنان حکومت کی پیٹھ ہی ٹھونکتے رہے۔ اتفاق سے ۱۹۴۵ء میں مہاراجہ نے اپنے ایک ملازم رام چند کاک کو وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ رام چند کاک صرف کشمیری پنڈت ہی نہ تھا۔ بلکہ کشمیری زبان بولنے والا بھی، بس پھر کیا تھا نوکر شاہی کو دیوتا سمجھنے والے کشمیری پنڈت سمجھنے لگے کہ اب انہی کا راج ہے اور انہی کے ٹھاٹھ ہیں۔ چنانچہ "کشمیر چھوڑو دو" تحریک کی مخالفت میں محمد علی جناح اور مسلم کانفرنس کے ساتھ کشمیری پنڈت بھی (چند معزز استثنیات کو چھوڑ کر جو انگریزی کہاوت کے مطابق کلیے۔ کو ہی سچ ثابت کرتے ہیں) ہم آواز اور ہم آہنگ ہو گئے۔ یہ بات بڑی فکر انگیز ہے کہ کشمیر میں تحریک آزادی اور خاص طور پر کشمیر چھوڑ دو کے زمانے میں جتنے شہید پولیس اور فوج کی گولیوں سے جاں بحق ہو گئے۔ ان میں شاید ایک آدھ کشمیری پنڈت بھی نہ ہو گا۔ بہر کیف۔ یہ صورت حال اس وقت اپنی ستم ظریفانہ انتہا کو پہنچ گئی جب جواہر لال نہرو ڈوگرہ مہاراجہ کی مخالفت اور

www.taemeernews.com

کشمیری عوام کی حمایت کے لئے ۱۹۴۷ء میں کوہالہ آئے۔ اس وقت جہاں مہاراجے کی فوج اور سنگینوں سے ان کا راستہ روک رہی تھی وہاں ان کو "واپس جاؤ" کے نعرے سنانے والوں میں مولوی یوسف شاہ کے پیرو، جموں کے مہاسبھائی ہندو اور جواہر لال نہرو کے ہم نسب اور ہم گوتر کشمیری پنڈت بھی شامل تھے۔ انھیں کوئی احساس نہ تھا کہ اپنے خون، اپنے آدرش اور اپنے وطن کا ساتھ دینے کے بجائے وہ ایک ریت کی دیوار اور ظلم کے پھندے کا ساتھ دے رہے ہیں۔ شاید شاعر نے ایسے ہی موقع کے لئے کہا تھا۔

شراب سیخ پر ڈالی، کباب شیشے میں

کشمیری پنڈتوں نے اسی کردار کا مظاہرہ ۱۹۷۷ء میں بھی کیا۔ انھوں نے نیشنل کانفرنس اور اپنے نسب کی عظیم خاتون، اندرا گاندھی کی کانگریس کا ساتھ دینے کے بجائے جنتا پارٹی کا ساتھ دیا۔ جن میں ایک طرف جن سنگھ کے عناصر شامل تھے اور دوسری طرف مولوی فاروق کے بکرے۔ بہر کیف۔ رام چند کاک کی فرعونیت جواہر لال کی کشمیر دوستی کے آگے جھک گئی۔ کشمیر میں صورت حال نے پلٹا کھایا۔ قبائلی حملہ آور چڑھ آئے۔ اپنے آپ کو پنڈتوں کا دھرم رکھشک کہنے والے مہاراجہ رات کی تاریکی میں ان بے چاروں کو اپنے حال پر چھوڑ کر دم دبا کر جموں بھاگ گئے۔ اس وقت سارے ملک میں اقلیتوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کے ساتھ کھلم کھلا ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ لیکن کشمیریوں کی قومی روایات سامنے آئیں۔ نیشنل کانفرنسی قیادت کا نظریاتی استحکام آڑے آیا اور ہم نے سب سے پہلے کشمیری پنڈتوں کو عزت و آبرو اور جان و مال کی سلامتی کے لیے اقدامات کیئے۔ ہم نے ان کے تیرتھ استھانوں کی حفاظت کو اولین ترجیح دی۔ تولہ مولہ سے جہاں راگنی دیوی یا کھیر بھوانی کا مشہور استھان واقع ہے، قبائلیوں کے ڈر کی وجہ سے وہاں کشمیری پنڈت، پجاری اور مہنت تک بھاگ آئے تھے۔ وہاں کے مسلمانوں نے استھان کی حفاظت اپنے متبرک مقام کی طرح کی۔ اسی طرح ہم نے دوسرے مندروں اور تیرتھوں کی حفاظت کے لیے کڑے انتظامات کیے۔ چنانچہ ہماری تحویل میں کسی پنڈت کا بال تک بیکا نہ ہوا۔ یہ اس قدر شاندار کارنامہ ہے کہ اس سے کشمیر کے اتحاد اور اتہاس کی ایک نئی جوت پیدا ہو گئی ہے۔ ہماری آئندہ نسلیں اس پر فخر سے سر اونچا کریں گی۔ جس وقت کشمیری پنڈتوں پر اجل اور قضا کی شمشیریں لہرا رہی تھیں اس وقت یہاں مہاراجے یا ہندوستان کا کوئی سپاہی نہ تھا۔ صرف انھیں اپنے مسلم ہم وطنوں کی خیر سگالی اور جذبہ، محبت کی سپر بچائے ہوئے تھی۔ یہ معجزہ ایسا فرحت بخش تھا کہ برصغیر کے شعلوں کو دیکھنے والے مہاتما گاندھی کی جلتی ہوئی آنکھوں میں اس سے ٹھنڈک پڑ گئی اور وہ بے ساختہ پکار اٹھے "مجھے کشمیر سے روشنی کی کرن نظر آتی ہے۔" روشنی کی اس کرن میں روغن کشمیر کی رواداری کی روایات نے ڈالا تھا۔ لیکن کشمیری

www.taemeernews.com

پنڈتوں نے از راہ نوازش اس کا سہرا میرے سر باندھ لیا۔ ان دنوں جب میں پنڈت علاقوں میں جاتا تھا تو مجھے خاص طور پر سادہ و معصوم پنڈت خواتین کے اجلے مکھڑوں پر شکرگزاری کا ایسا تاثر دیکھنے کو ملتا جسے میں اپنی حقیر خدمات کے نہایت ہی قیمتی انعامات میں شمار کرتا ہوں۔ کچھ پنڈت دوست تو یہاں تک غلو کر گئے کہ مجھے وشنو کا اوتار قرار دینے لگے۔ جس نے ان کی رکھشا کے لیے ستی سر کشمیر میں پنر جنم لیا تھا۔

میں نے اگر کشمیری پنڈتوں کے لیے کچھ کیا تھا تو یہ کوئی اترانے کی بات نہ تھی۔ یہ میرے قومی مزاج، ہماری تحریک کے آدرشوں اور خود میرے ذاتی کردار سے مطابقت رکھتا تھا۔ میں نے ہی ۱۹۳۲ء کے فسادات میں ایک پنڈت خاتون کے مردہ جسم کو کئی دن کے بعد شمشان گھاٹ تک پہنچانے کے لئے جان جوکھم میں ڈالی تھی اور میں نے ہی تو جناح صاحب سے تقسیم ملک سے بہت پہلے کہا تھا کہ کشمیر میں دو قومی نظریئے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ مسلم لیگ ریاست سے باہر جو چاہے کرے۔ ریاستی عوام نیشنل کانفرنس کے پرچم تلے باہم شیروشکر رہنے کے علاوہ اور کوئی راستہ اختیار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جب ۱۹۴۴ء میں ہم نے پرتاپ باغ سرینگر میں جناح صاحب کو خیر مقدم میں جلسہ منعقد کیا تو وہاں استقبالیہ جلسے میں سپاس نامہ پیش کرنے کے لئے ہمارے ایک پنڈت ساتھی کلہم صاحب کو ہی چنا گیا۔ ۱۹۴۸ء کے بعد جب ہم نے کشمیر میں زرعی اصلاحات نافذ کیں تو بد قسمتی سے اس کی زد میں جموں کے راجپوتوں کے ساتھ ساتھ کشمیری پنڈت جاگیردار بھی آئے۔ اس زد میں مسلم جاگیردار اور چک دار بھی آئے۔ لیکن اپنی آبادی کے تناسب سے کشمیری پنڈتوں کو دربار میں قرب اور اپنی "خدمات فائقہ" کے لحاظ سے کچھ زیادہ ہی جاگیریں وغیرہ ملی تھیں۔ لیکن یہ زمانے کی منطق اور تاریخ کا فتوی تھا۔ اس میں کسی تعصب کا کوئی سوال نہ تھا۔ مگر کشمیری پنڈتوں نے اسے عقل و استدلال کی عینک سے نہیں دیکھا بلکہ ذاتی مفادات اور طبقاتی تعصب کی ترازو سے تولا۔ اس مرحلہ پر یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ کشمیری پنڈت ظلم و ناانصافی کے اس نظام کی بقاء کے لئے بہت پہلے سے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے ۱۸۸۷ء میں جب کشمیر میں غریب کاشکاروں کی حالت زار کا چرچا برطانوی ہند میں ہونے لگا تو دلی کی حکومت کے مشورے سے کشمیر میں مسٹر ونگیٹ کو بندوبست آراضی کے لیے سٹلیمنٹ کمشنر بنا کر بھیجا گیا۔ لیکن بڑی بڑی زمینیں اور جاگیریں پنڈتوں نے اپنی مصاحبت اور سرکار نوازی کے عوض حاصل کر لی تھی لہذا انھوں نے اس اچھے اراوں والے انگریز افسر کے خلاف ایسی مہم چلائی کہ اسے اپنا کام ادھورا چھوڑ کر مستعفی ہو کر جانا پڑا اور اس طرح کشمیری پنڈتوں کے خصوصی مفادات پر آئی ہوئی بلا ٹل گئی۔ ان کی شکایات میں چونکہ وزن نہ تھا اور ان کے استدلال میں کاٹ نہ تھی اس لیے وہ کھلم کھلا بحث و مباحثے کے بدلے کانا پھوسی اور کھسر پھسر

www.taemeernews.com

کی مہم چلانے لگے۔ دہلی میں جا کر انھوں نے اپنے ہندو مذہب کی دہائی دینا شروع کر دی۔ حالانکہ ان کے اسلاف نے اپنی کشمیر نوازی کے افتخار میں اپنے لیے سرکاری فرمان کے وزن سے "کشمیری پنڈت" کی امتیازی لکیر کھنچوا دی تھی۔ انھوں نے دہلی کے فرقہ پرست ذہنیت کے چند طاقتور حلقوں کو اکسانے کے لیے ہمارے خلاف صرف یہی نہیں کہا کہ ہم فرقہ پرست ہیں بلکہ تحریک حریت کے آغاز کے وقت تراشا ہوا یہ الزام پھر تازہ کر دیا کہ ہم اشتراکی بالشویک اور روسی ایجنٹ ہیں۔ وہ کشمیر کو بھول گئے اور فرقہ واری کے پیمانے سے معاملات کو جانچنے لگے۔ بد قسمتی سے دہلی کے ایوانوں کی غلام گردشوں میں ایسے افراد کی کمی نہیں تھی۔ جن کے دل اسی سم اور تال پر دھڑکتے تھے۔ چنانچہ کشمیر سے لے کر دہلی تک ایک اکھنڈ پاٹھ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کشمیری پنڈت پھر مغلوں کے زمانے کی طرح اپنے عوام سے کٹ کر کسی اور کے اشارے پر ناچنے لگے۔ در قبیلہ کے ایک اور چشم و چراغ در گا پرشاد در نے اپنے بزرگوں کی روایات کو آگے بڑھاتے ہوئے کار خاص میں مہارت حاصل کر لی اور وہ کشمیر کی عوامی تحریک کے جگر میں خنجر کی طرح پیوست کر دیئے گئے۔ ۱۹۵۳ء کے المیے میں اس کھسر پھسر کا بھی ایک عنصر شامل رہا۔ وہ یہ بھول گئے کہ پاکستان کے ساتھ ساز باز کا الزام جس شیخ محمد عبداللہ پر عائد کیا جاتا ہے وہ جب ۹۔ اگست ۵۳ء کو گلمرگ میں گرفتار ہوا تو اس کی پارٹی صرف تین کشمیری پنڈت افسروں پر مشتمل تھی۔ لیکن مجھے یہ اطمینان حاصل رہا کہ ہمارے ساتھ پنڈت کیشپ بندھو اور جانکی ناتھ کگرو نے ضرور کچھ سال جیل میں گذارے دیئے اگرچہ ہمیں ان کی غالب اکثریت امریکی، پاکستانی اور چینی ایجنٹ کہہ کر پکارتی تھی۔

کشمیری پنڈت ہندوستان میں پچھلے زمانے سے ہی اپنی قابلیت کی دھاک بٹھائے آئے تھے۔ کشمیری شاعر بلہن دکن گیا تو وہاں کا راج کوی بن گیا۔ رتن ناتھ سرشار، برج نرائن چکبست، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت موتی لال نہرو اور بیسوں کشمیری پنڈتوں کے تذکرے کئے بغیر ہندوستان کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ آج بھی سارا ملک ان کی قابلیتوں کا جولانگاہ ہے۔ انہیں ہماری وزارت خارجہ، مرکزی سکریٹریٹ، فوج اور دوسرے اہم سروسوں، پرائیوٹ کمپنیوں اور پریس میں اہم مقام حاصل ہے اور یہ ہندوستان کے شہریوں کی حیثیت سے ان کا حق ہے۔ دہلی اور جموں میں انھوں نے اپنی ہاؤسنگ کالونیاں اور محلے آباد کیے ہیں۔ بہت سے کشمیری پنڈتوں کے تو سرینگر، جموں اور دہلی میں بیک وقت مکانات ہیں۔ تقسیم سے پہلے وہ اپنی برادری سے باہر رشتے طے نہ کرتے تھے۔ مگر اب وہ غیر ریاستوں کے ساتھ سمبندھ قائم کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے۔ ان کے سارے ملک میں تعلقات ہیں اور رسوخ ہے اور ہم کشمیریوں کو ان کے کارناموں پر فخر ہے کشمیریوں میں جمہوری نظام کی برکتوں کے لحاظ سے آزادی کے ثمرات ان طبقوں اور

www.taemeernews.com

جاتیوں میں بھی تقسیم کئے جارہے ہیں جو تاریخ کی اندھی منطق کے سبب پیچھے رہ گئے تھے۔ چنانچہ ان میں کشمیر کے دیہاتیوں کے علاوہ گوجر۔ بکروال۔ جموں کنڈی میں بسنے والے ہر یجن اور لداخ اور کرگل کے پسماندہ باشندے وغیرہ شامل ہیں۔ چونکہ کشمیری پنڈت صاحبان کو پہلے خاص حالات کی وجہ سے ان معاملات میں اگر اجارہ نہیں تو بھی غلبہ حاصل تھا۔ اس لئے انھیں صورت حال سے کوفت ہو رہی ہے۔ لیکن واقعات گواہ ہیں کہ اپنی قابلیت کے بل بوتے پر وہ اب بھی ریاست کے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں اپنی تعداد کے تناسب سے کہیں زیادہ موجود اور مقتدر ہیں۔ اور تو اور جموں کے کچھ باشندے وہاں ان کی بالادستی پر ناراضگی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ سارے ملک میں جتنی ان کی مانگ اور کھپت ہے ریاست کے کسی دوسرے طبقے کے خواب خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ تیسرے ریاست میں جتنے مرکزی دفاتر ہیں ان میں جو تقرریاں ہوتی ہیں ان میں کشمیری پنڈتوں کا تناسب ساٹھ سے سو فیصد تک ہے حالانکہ ان کی آبادی کا اوسط دو ڈھائی فیصد سے زیادہ تک نہیں پہنچتا۔ ان حالات میں اگر کشمیری پنڈت صاحبان اپنے بلاشک و شبہ بے اندازہ ذرائع اور ملک گیر اثر و رسوخ اور خاص طور پر صحافتی حلقوں میں اپنے اثر و نفوذ سے طوفان بپا کرتے رہتے ہیں تو ان کے باقی برادران وطن کو اس پر جائز طور گلہ ہو سکتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ واقعات کی منطق کے ساتھ ساتھ اپنے ہم وطنوں کی اکثریت اپنی ریاست کے جغرافیائی مفادات کے تقاضوں اور اس کی ہیبت ترکیبی مصلحتوں پر بھی نظر رکھیں اور صرف دلی کے ایوانوں کی جاگزیں نوکرشاہی کو ہی اپنا قبلہ و کعبہ تصور نہ کریں۔ کشمیری پنڈت ریاست کو اپنی صلاحیتوں سے مالامال کر سکتے ہیں اور باقی ملک کے ساتھ اس کے جذباتی رشتوں کو کمزور بنانے کی بجائے ان کے درمیان ایک مضبوط پل کا کام کر سکتے ہیں۔ کشمیریوں نے دو قومی نظریئے کو ٹھکرا کر اپنے کشمیری پنڈت بھائیوں کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ان پر تاریخ نے یہ ذمہ داری ڈال دی ہے کہ وہ اس ہاتھ کو نہ جھٹکیں جس طرح وہ خود ظلم اور ناانصافی کو ناپسند کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کے دوسرے ہم وطن بھائی بھی ظلم و نا انصافی سے نالاں ہیں۔ جواہر لال اور اندرا گاندھی کے ملک میں جہاں کشمیری پنڈت اقتدار کی چوٹیوں پر کمندیں ڈالے ہوئے ہیں ان کی رسائی کشمیریوں کے لیے فیض و برکت کا سرچشمہ ہونا چاہیئے۔ بغض و شرارت کا ذریعہ نہیں۔ ملک کے بڑے دھارے میں ان کی ممتاز حیثیت اس قدر نمایاں ہے کہ چند ہی سال پہلے ایک وقت وہ تقریباً سارے اہم مناصب پر فائز تھے۔ کشمیر کے چھوٹے دائرے میں بھی انھیں کشمیریوں نے محبت شفقت اور پیار دیا ہے اور اپنے جذبات کی صداقت اور سنگینی کا مظاہرہ انتہائی آزمائش کے وقت بھی کیا ہے جب انھوں نے اپنے ہم مذہبوں کو ظالموں کے روپ میں دیکھ کر ان کے خلاف ہتھیار اٹھائے۔ لیکن قدرت کسی متوازن نظام میں اونچ نیچ کے خلاف ہے۔ ریاست میں وہ

www.taemeernews.com

اونچ نیچ کی فضا جو صدیوں کی غلامی کا نتیجہ ہے۔ تیزی سے ہموار ہو رہی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کے باوجود کشمیری پنڈت اپنی خوبیوں کی وجہ سے آگے آگے رہیں گے۔ کشمیر کے گلدستے کا روپ کشمیری پنڈت کے لالہ احمر جیسے چہرے کی رنگت، اور اس کی مہذب شخصیت کی مہک کے بغیر ادھورا ہے۔ لیکن اسے بھی جاگیر داری تصورات کی سطح سے اٹھ کر آگے آنا ہو گا۔ ان کی سوچ کا محور ہمیشہ چھوٹی چھوٹی نوکریاں رہی ہیں اور انھیں حکمرانوں کی خدمت اور جاسوسی ـــ میں سکون ملتا رہا ہے۔ نئی جمہوری برادری میں وہ کارکن نہیں بلکہ برابر سے بھی ایک انچ زیادہ کے شریک و شامل ہیں۔ ان میں اتنی لوچ اور لچک ضرور موجود ہے کہ وہ اپنے آپ کو نئے تقاضوں کے قالب میں ڈھال کر اپنی امتیازی شان برقرار رکھیں صرف بات بتنگڑ بنا کر۔ یہاں دہلی کے جاسوسوں اور کشمیریوں کے پانچوں کالم کا ردل، جو وہ برسہا برس سے ادا کرتے ہیں۔ چھوڑ کر اپنے دوسری کشمیری بھائیوں کے دکھ درد کا ہمدم اور ہمدرد بننا چاہیے۔ جنھوں نے فرقہ وارانہ برادری کے لیے خود اپنے ہم مذہبوں کا جگر داری سے مقابلہ کیا۔ مولانا رومی کے اس شعر کا مخاطب شاید وہی ہے۔

تو برائے وصل کردن، آمدی
نے برائے فصل کردن، آمدی

ریاست کی ۱۲ اکائیوں کشمیر، لداخ اور جموں میں اہمیت ہمیشہ کشمیر کی رہی ہے اور یہ کہا جائے کہ اہم فیصلے لیتے وقت کشمیری عوام کے احساسات کو ہی فوقیت دی گئی تو مبالغہ آمیزی نہیں ہو گی۔ ہندوستان کے ساتھ الحاق میں بھی جموں اور لداخ کے عوام کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں کشمیر نے ہمیشہ اندرونی خود مختاری پر زور دیا وہاں جموں نے ہندوستان کے ساتھ مکمل ادغام کا مطالبہ کیا۔ یہ بات بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ کشمیر کی ہندوستان نواز قوتوں کو ہمیشہ جموں کی ہندوستان حمایتی سیاست نے سہارا دیا۔ لداخ کی نہ تو سیاسی لحاظ سے اور نہ ہی معاشی لحاظ سے ریاست کے سیاسی نقشہ میں کوئی اہمیت تھی۔ مہاراجہ کی موروثی حکومت کو ختم کرنے میں کشمیر نے کلیدی رول ادا کیا ہے لیکن جموں نے بھی اہم رول نبھایا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ جموں کے عوام مجموعی طور سے نیشنل کانفرنس کی سیاست سے وابستہ نہیں تھے۔ لیکن جموں میں ایسے لیڈر اور کارکن سرگرم تھے جو تحریک حریت سے وابستہ تھے ان میں سردار بدھ سنگھ، کرشن دیو سیٹھی، موتی رام بیگڑا، مہاشہ ناہر سنگھ، گردواری لال ڈوگرہ، پنڈت ترلوچی دت، کامریڈ دھنوتری، راجہ محمد اکبر خان، نظیر حسین سمنانی اور کئی مسلم لیڈر شامل تھے۔ جموں کے مسلمان لیڈر شیخ محمد عبداللہ سے خائف تھے حالاں کہ جموں کے مسلمان لیڈر intellectualy شیخ محمد عبداللہ سے بہت اونچے مقام پر تھے۔ جموں کا مسلمان سمجھتا تھا کہ شیخ

www.taemeernews.com

محمد عبداللہ ان پر کبھی بھی بھروسہ نہیں کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ تقسیم ہندوستان کے وقت شیخ محمد عبداللہ نے جموں کے مسلمانوں کی ہجرت کو روکنے کی کوشش نہیں کی حالاں کہ جموں کے ہندو لیڈروں نے شیخ محمد عبداللہ پر دباؤ ڈال دیا تھا کہ مسلمانوں کے ہجرت کرنے سے آبادی کا تناسب بگڑ جائے گا جس کی خطرناک نتائج نکلیں گے لیکن انھوں نے اس پر توجہ نہیں دی۔

۱۹۴۸ میں مسلمانوں کی ہجرت کے بعد جموں سیاسی طور سے یتیم ہو گیا اور کشمیری لیڈرشپ نے یتیم جموں کو سہارا دینے کے لئے ان عناصر کے ساتھ سمجھوتا کیا جو مہاراجہ ہری سنگھ کے یا تو درباری رہے تھے یا تحریک حریت کو دبانے کے لئے اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔ اس منفی سیاست کا نتیجہ یہ نکلا کہ جموں جہاں مہاراجہ کے خلاف تحریک کمزور تھی وہاں کے لوگوں کا مجموعی کردار راج بھگتی کا ابھر آیا۔ ان کی تمام تر توجہ سرکار سے رعایتیں حاصل کرنا، نجی سرمایہ کاری کے لئے ٹھیکے حاصل کرنا، فیکٹریاں لگانے کی طرف مرکوز رہی اور کشمیری لیڈرشپ نے بھی جموں کو سیاسی نظریات کی بنیاد پر ساتھ رکھنے کے لئے بجائے وفاداریاں خریدنے کی پالیسی کو ہی ترجیح دی۔ آبادی کا توازن بگڑنے کی وجہ سے ہندو لیڈرشپ ہی جموں کی سیاست پر چھا گئی اور اس میں ان عناصر کی حوصلہ افزائی کی گئی جو کسی نہ کسی پوزیشن میں مہاراجہ کی خدمت کرتے رہے تھے۔ نیشنل کانفرنس کی روایتی لیڈرشپ جو کمیونسٹوں کے زیر اثر تھی وہ صاف ستھری سیاسی زندگی کے لئے لڑتی رہی، جدوجہد کرتی رہی لیکن کشمیری لیڈرشپ کی وفاداریاں خریدنے کی پالیسی نے اس لیڈرشپ کو کامیاب نہیں ہونے دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ یہ لیڈرشپ بکھر گئی۔ ۱۹۵۲ پرجا پریشد تحریک بھی کشمیری لیڈرشپ کی اسی سوچ کا نتیجہ تھی اور اس تحریک نے نہ صرف جموں بلکہ پوری ریاست کے سیاسی منظر پر اپنا اثر ڈال دیا۔ جموں کے مسلم اکثریتی علاقوں میں سوائے ضلع ڈوڈہ کے اور کسی کشمیری لیڈرشپ پاؤں نہیں جما سکی اور وہ جموں کی ہندو لیڈرشپ پر ہی اعتماد کرتے رہے۔

شیخ محمد عبداللہ کی برطرفی کے بعد بخشی غلام محمد نے بھی اپنے پیش رو کی پالیسیوں پر گامزن رہ کر اپنے لیے سرمایہ کے بل پر ہی جموں میں اپنی سیاسی بنیاد کھڑی کر دی۔ نیشنل کانفرنس کے سرکردہ لیڈروں کرشن دیو سیٹھی۔ لالہ پیارا اصراف، موتی رام بیگڑہ، مہاشہ ناہر سنگھ اور دوسرے لوگوں کو کنارے لگانے کے لیے کٹر برانڈ کے رجعت پسندوں اور موقع پرستوں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ چونکہ کشمیر میں ہندوستان مخالف تحریک تقویت حاصل کر رہی تھی اس لئے لوگوں کو اپنا ہمنوا بنانے کے لئے کشمیری غلبہ والی سرکار نے تمام تر توجہ کشمیر پر ہی مرکوز کی اور نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیمی و اقتصادی طور پر جموں ہر لحاظ سے پسماندہ رہا۔ میڈیکل کالج، یونیورسٹی، انجینئرنگ کالج اور دوسرے پیشہ وارانہ کالج بھی کشمیر میں ہی کھولے گئے اور جب جموں نے

www.taemeernews.com

اپنا حق مانگنا شروع کیا تو کافی جدو جہد کے بعد جموں میڈیکل کالج کھولا گیا اور جموں یونیورسٹی بنائی گئی۔۔ کشمیری لیڈرشپ کی اس منفی سیاست نے جموں میں کئی سیاسی سپوتنک پیدا کئے۔ امرت ملہوترہ، بلراج پوری، اوم صراف، وید بھسین جیسے بے وزن لوگوں کو باوزن بنا دیا گیا اور کشمیر کا ہر سیاسی لیڈر ان کا گرویدہ بن گیا۔ جن سنگھ کی لیڈرشپ کو عوامی سطح پر کشمیری لیڈرشپ کی مخالفت کا دعوا کرتی رہی لیکن درپردہ وہ بھی کشمیری لیڈرشپ سے رعایتیں لیتی رہیں۔ وہ ٹھیکوں، پرمٹوں اور دوسری رعایتوں کی دہلیز پر ناک رگڑتی رہی۔ پنڈت ناتھ ڈوگرہ جو جن سنگھ کے ایک بزرگ لیڈر تھے وہی ایک صاف ستھرے اور صاف ذہن کے لیڈر تھے جو اس لعنت سے محفوظ رہے۔ چمن لال گپتا، رشی کمار کوشل، اور اودھم پور کے جی ڈی بلگوترہ، ڈاکٹر ستپال اور شیخ عبدالرحمان جن سنگھ کے ایسے لیڈر سیاسی زندگی پر چھا گئے جو ہر کشمیری حکمراں کے وظیفہ خور رہے ہیں۔ جب کوئی دیانت دار سرکار کمیشن بٹھادے گی تو یہ سب لیڈران کشمیری لیڈروں کی صف میں کھڑے ہوں گے۔ جو بلیک میل کی سیاست کے سہارے فرش سے عرش پر پہنچ گئے۔

ریاست میں کانگرس کے وجود میں آتے ہی جموں کی ہندو اکثریت کو یہ اطمینان ہوا کہ ریاست کی سیاسی علحدگی ختم ہو رہی ہے اور ریاست سیاسی لحاظ سے ہندوستان کے قریب آرہی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر اسمبلی چناؤ میں جموں میں کانگرس کے اکثر امیدوار کامیاب ہوتے رہے۔ کشمیر کے برعکس یہاں کانگرس نے چناؤ میں RIGGING کرنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی ہاں البتہ ایک یادو حلقوں میں جو دور دراز پہاڑی علاقوں کی وجہ سے جموں سے کٹے رہتے ہیں وہاں RIGGING ہوتی رہی ہے۔ گول گلاب گڑھ کے حلقۂ انتخاب میں کانگرس کے امیدوار محمد ایوب خاں کے چناؤ میں اکثر یہی ہوتا رہا۔ اسمبلی کے ایک چناؤ میں ان کے حق میں اتنے ووٹ ڈالے گئے جتنی گول گلاب گڑھ کی آبادی نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود جموں میں ہمیشہ چناؤ آزاد اور غیر جانبدار ہوئے ہیں۔ یہاں کبھی کسی خالق ڈی سی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اس لیے جموں کا کوئی اسمبلی ممبر میڈ ان خالق نہیں ہے۔ کشمیر میں کانگرس کے خلاف شیخ محمد عبداللہ کی ترک موالات تحریک کا جموں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ محاذ رائے شماری بھی ہزاروں کوششوں کے باوجود جموں میں جنم نہ لے سکی۔ راج بھگتی کے رجحانات کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ جب تک بخشی غلام محمد وزیر اعلا رہے جموں کی اسپوٹنک SPUTNIK لیڈرشپ نے ان کے گن گائے۔ وہ پٹ گئے تو غلام محمد صادق کے پرستار بن گئے۔ غلام محمد صادق سیاسی افق سے اٹھ گئے تو سید میر قاسم کے ارد گرد طواف کرنے لگے SPUTNIK لیڈرشپ کے لئے بھی راستہ صاف تھا کیونکہ کرشن دیو سیٹھی اور رام پیارا صراف نکسلی بن گئے تھے اور ان کا حلقہ اثر محدود ہو گیا تھا

www.taemeernews.com

حالاں کہ جموں کے عوام ان کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے اور آج بھی کرتے ہیں۔

لداخ پسماندہ تھا آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بھی۔ نہ تو وہاں کوئی سیاسی تحریک تھی اور نہ ہی کوئی ایسا سیاسی لیڈر جو لداخ کی تعمیر و ترقی کے لیے آواز بلند کرتا۔ لداخ پر بودھ بھکشوؤں کا راج تھا اور شیخ محمد عبداللہ سے لیکر خواجہ غلام محمد صادق تک ہر ایک نے بودھ کے بڑے لاما کوشک بکولا کو ہی لداخ کا بے تاج بادشاہ بنا دیا۔ مذہبی لیڈر اور بودھوں کے مذہبی رہنما ہونے کی وجہ سے انہیں لداخ کی مذہبی اور سماجی زندگی میں نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ لیکن سیاسی لحاظ سے وہ مکمل طور سے جاہل اور ناخواندہ تھے لیکن پھر بھی انہیں شیخ محمد عبداللہ نے اپنا وزیر بنا دیا تھا۔ اور وہ کافی مدت تک وزیر بنے رہے۔ کرگل جو لداخ کا ایک پسماندہ ترین ضلع ہے۔ وہاں کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی پر بھی شیعہ ملاؤں کا قبضہ تھا اور اس لیڈر شپ نے لوگوں کو اس حد تک ذہنی طور پر پسماندہ کر رکھا ہے کہ حکومت نے کرگل میں اسٹیڈیم بنانے کا منصوبہ بنایا لیکن ملاؤں نے اسے غیر اسلامی قرار دے کر تعمیر نہیں ہونے دیا۔ کشمیری لیڈر شپ نے کرگل میں بھی ان ہی ملاؤں پر تکیہ کیا اور وہی قانون ساز کونسل کے بھی ممبر بنتے رہے۔ مرحوم صادق صاحب کے زمانے میں ہماری کوششوں سے ایک پڑھے لکھے نوجوان پی۔ نخگل کو قانون ساز کونسل کا ممبر نامزد کیا گیا اور کرگل میں ایک ریٹائرڈ فوجی کاچو علی محمد کو اسمبلی ممبر اور وزیر بنایا گیا ان دو پڑھے لکھے افراد کے انتخاب سے لداخ میں ذہنی طور پر پسماندہ بودھ اور شعیہ لیڈر شپ میں کھلبلی برپا ہو گئی۔ جس کے نتیجہ میں کرگل اور لیہ کے درمیان فرقہ وارانہ تناؤ پیدا ہوا جس نے بعد میں تصادم کی کا رخ اختیار کر لیا لیکن اس تصادم کی بھی بنیادی وجہ لداخ کی سماجی اور معاشی پسماندگی ہے جس کو دور کرنے کے لیے کشمیری لیڈر شپ نے کوئی توجہ نہیں دی۔ حالانکہ ہر چیف منسٹر لداخ کا دورہ کرتا رہا ہے۔

جموں کی پسماندگی اور اس کے ساتھ امتیازی سلوک کا جائزہ لینے کے لئے گجندر گڈ کر کمیشن مقرر کیا گیا جس نے اپنی رپورٹ تو پیش کی لیکن سوائے چند مراعات دینے کے سرکار نے اس رپورٹ پر سنجیدہ توجہ نہیں دی۔ وجہ یہ تھی کہ جموں میں دو شخصیتوں کے درمیان زبردست ٹکراؤ ہے ایک طرف ڈاکٹر کرن سنگھ اپنے آپ کو جموں کی واحد آواز قرار دے رہے تھے تو دوسری طرف پنڈت ترلوچن دت جموں کی قیادت کے امیدوار تھے۔ ڈاکٹر کرن سنگھ کے بارے میں یہ زبردست افواہ ہے کہ وہ دانشور ہیں فلاسفر ہیں اور انگریزی زبان پر انہیں عبور ہے لیکن جہاں تک میں نے ان کی شخصیت کا پوسٹ مارٹم کیا ہے وہ ایک مہاراجہ کے بیٹے ہیں اور ان کی سوچ اور فکر محل کی چہار دیواری سے باہر پرواز نہیں کر سکی ہے۔ تنگ نظر بھی ہیں اور قدامت پسند بھی۔ کشمیری پنڈتوں سے نفرت کرتے ہیں جس کی وجہ ہے لیکن وجہ بیان کرنا ضروری نہیں کیوں

www.taemeernews.com

کہ اسے ان کو ٹھیس پہنچے گی اور ان کے جذبات مجروح ہو جائیں گے۔ وہ آج بھی اپنے آپ کو یوراج ہی سمجھتے ہیں۔ پنڈت ترلوچن دت ۱۹۴۷ سے قبل بھی کانگرس میں تھے اور آج بھی کانگرس میں ہیں سوائے ان چند برسوں کے جب انہوں نے مرحوم سنجے گاندھی کی قدم بوسی سے انکار کر دیا تھا۔ ایمرجنسی کے وہ سخت مخالف تھے اور کانگرس کے اندر سنڈیکٹ اور مرحومہ اندرا گاندھی کے درمیان لڑائی میں وہ سنڈیکٹ کے حامی تھے۔ ترلوچن دت نہ دانشور ہیں اور نہ ہی فلاسفر البتہ ایک دانشمند اور باصلاحیت سیاست داں ضرور ہیں۔ خوف کھانا، کسی سے ڈرنا یا مرعوب ہونا انہوں نے سیکھا ہی نہیں ہے۔ وہ جموں کے ساتھ ناانصافی کی بات خوداعتمادی سے کرتے ہیں لیکن اس میں کشمیر کے ساتھ نفرت کا جذبہ نہیں ہوتا ہے وہ جموں کے عوام کے مفادات کے لئے لڑیں گے لیکن اس مقصد سے نہیں کہ کشمیریوں کو زیر کرنا ہے۔ گجندر گڈکر کمیشن کے بارے میں بھی ان کا نظریہ یہ تھا کہ یہ جموں اور کشمیر کی ذہنی علاحدگی کا بیج بو دے گا۔ پنڈت ترلوچن دت کی سب سے بڑی کمزوری یہ رہی ہے کہ ان میں لچک نہیں ہے ضدی بھی ہیں اور ہٹ دھرم بھی۔ اسی لئے ان کے دوستوں کی تعداد قلیل ہے اور دشمنوں کی ایک لمبی لائن ہے۔ ان تمام خوبیوں اور خامیوں کے باوجود جب جموں کی لیڈرشپ پر نظر ڈالتے ہیں تو پنڈت ترلوچی دت کا قد کافی اونچا نظر آتا ہے۔

سید میر قاسم کے ساتھ ان کی دوستی بھی کئی سنگین آزمائشوں سے گزری ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ سید میر قاسم جموں کے بارے میں ان کی آواز کو ہی معتبر سمجھیں۔ لیکن سید میر قاسم کی اپنی مجبوری تھی۔ وہ ڈاکٹر کرن سنگھ کو بھی خوش رکھنا چاہتے تھے۔ اور ترلوچی دت مخالف دوسرے عناصر کو بھی۔ ریاست کے بارے میں ان کے ذہن میں جو سیاسی نقشہ تھا وہ اس نقشہ میں رنگ بھرنے کے لیے ہر ایک کا تعاون حاصل کرنا چاہتے تھے اور کسی حد تک وہ اس میں کامیاب بھی ہو گئے۔

www.taemeernews.com

اپوزیشن پلیٹ فارم باب ۳۱

ہندوستان کے ساتھ الحاق کے بعد کشمیر نے زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کی خاص کر تعلیمی پھیلاؤ نے ترقی کی نئی راہیں ہموار کر دیں لیکن سیاسی اور ذہنی طور سے کشمیری لاغر رہا۔ اس نے ملکی اور بین اقوامی سطح پر ابھرتے نئے سیاسی رجحانات سے اپنے آپ کو دور رکھا۔ وجہ یہ نہیں ہے کہ کشمیری باتہال پار کی دنیا میں جھانکنا نہیں چاہتا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ کشمیری لیڈرشپ خاص کر شیخ محمد عبداللہ نے ایک بے نام خوف سے خوفزدہ ہو کر کشمیریوں کو اپنے ذہنی دریچے بند رکھنے پر قائل کر دیا تھا اور ہندوستان کی سیاسی جماعتوں نے بھی مجرمانہ غفلت سے کام لیا۔ ۱۹۴۷ تک کشمیر کی سیاسی زندگی پر نیشنل کانفرنس حاوی رہی۔ مسلم کانفرنس کا اپنا ایک حلقہ اثر تھا لیکن محدود۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۷ میں پاکستان کے وجود میں آتے ہی مسلم کانفرنس کے واحد لیڈر مولوی محمد یوسف شاہ پاکستان بھاگ گئے اور مسلم کانفرنس ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ شیخ محمد عبداللہ جیسے دراز قد تناور کی موجودگی میں کسی اور کے انگڑائی لینے کا تصور ہی ایک خواب تھا۔ اگر کسی کے شعور نے انگڑائی لی تو اس کو کنارے لگا دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آئین ساز کونسل کے چناؤ ہوئے تو نیشنل کانفرنس کے امیدوار بلا مقابلہ کامیاب ہوئے۔ اس سے انکار نہیں کہ نیشنل کانفرنس میں گنتی کے چند لیڈر تھے جو شیخ محمد عبداللہ سے سیاسی اختلاف کرتے تھے لیکن شیخ محمد عبداللہ کے ڈکٹیٹرانہ مزاج کے سامنے ان لیڈروں کی زبان گنگ ہو جاتی تھی اور پھر شیخ محمد عبداللہ ہر اہم فیصلہ کا اعلان مسجد کے ممبر سے ہی کیا کرتے تھے جس سے اختلاف کرنے والوں پر ہر وقت عوامی غم و غصہ کا شکار بننے کا خوف طاری رہتا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ ایسے بے تاج بادشاہ تھے جو جمہوریت اور جمہوری مزاج کو کشمیر کے تشخص کی ضد قرار دیتے تھے۔ انھوں نے اس حقیقت کے باوجود کہ کانگریس اور کمیونسٹ نیشنل کانفرنس کی مکمل حمایت کرتے تھے دونوں پارٹیوں کو کشمیر میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی اجازت نہیں دی۔ خود تو کھلی کتاب تھے جس کو عام کشمیری نے کبھی پڑھنے کی کوشش نہیں کی البتہ کشمیر کو سیاسی طور سے ایک بند کتاب رکھنے پر بضد رہے۔ ۱۹۵۲ء میں سیاسی تبدیلی کے بعد یہ توقع تھی کہ کانگریس کی سیاسی قیادت اور کمیونسٹ پارٹی وادی میں ہر طرح کے سیاسی نظریہ کی تبلیغ کیلئے دہانت دارانہ

www.taemeernews.com

کوششیں کریں گی لیکن وہ دیدہ دانستہ طور پر اس صحت مند رجحان کے ابھرنے میں رکاوٹ بنے رہے۔۔ کمیونسٹ پارٹی جو ۱۹۵۳ میں شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری اور انھیں سامراجی ایجنٹ قرار دینے میں پیش پیش تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی گرفتاری کیلئے نظریاتی جواز کمیونسٹ پارٹی نے ہی پیش کیا تو مبالغہ آمیزی نہیں ہوگی لیکن اس کے باوجود کمیونسٹ پارٹی نے وادی کی تنگ نظر سیاست کو ختم کرنے کے رجحان کی طرف کوئی قدم نہیں اٹھایا بلکہ نیشنل کانفرنس کی شکمی جماعت کے طور پر ہی کام کرنے کو ترجیح دی۔ وادی میں کمیونسٹ پارٹی نے مضبوط تنظیمی ڈھانچہ قائم کیا تھا۔ سنٹرل کمیٹی بھی تھی۔ ہر ضلع میں Cells بھی قائم تھیں زیر زمین۔ کمیونسٹ پارٹی کے ممبران اور ہمدرد نیشنل کانفرنس میں ہی رہ کر ہی سیاسی سرگرمیاں کرتے رہے۔ اپوزیشن اور وہ بھی الحاق حمایتی پلیٹ فارم دستیاب نہیں تھا۔ کبھی کبھی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر عوامی مسائل پر تبصرے کرتے تھے لیکن عوام کے سامنے ان کی پوزیشن اپوزیشن کی نہیں بلکہ حکمراں ٹولے کی تھی۔

بخشی غلام محمد جو اپنے "چھوٹے کلمہ" شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری کے بعد ایک اور بے تاج بادشاہ کے طور پر ابھرے وہ بھی سیاسی اختلاف اور احتجاج کی آواز کو دبانے کی کوششیں کرتے رہیں۔ وہ بھی کشمیر کو بیرونی سیاسی نظریات سے محفوظ رکھنے کی پالیسی پر مضبوطی سے قائم رہے۔ ۱۹۵۷ میں اسمبلی چناؤ کے بعد جب نیشنل کانفرنس سے نکل کر خواجہ غلام محمد صادق نے اپنے ہم خیال ساتھیوں سید میر قاسم۔ گردواری لال ڈوگرہ۔ کامریڈ کرشن دیو سیٹھی۔ کامریڈ رام پیارا صراف۔ پنڈت موتی رام بیگڑہ۔ کامریڈ موتی لال مصری۔ عبدالرحمان راحت۔ میر۔ اومکار ناتھ ترسل۔ ریشی دیو۔ غلام رسول کار۔ غلام رسول ریزو کے ساتھ ایک الحاق نواز اپوزیشن پارٹی ڈیمو کریٹک نیشنل کانفرنس بنائی تو پہلی بار وادی میں لوگوں کو ایک ہندوستان نواز اپوزیشن پلیٹ فارم دستیاب ہوا۔ ایک اور اپوزیشن پلیٹ فارم محاذ رائے شماری بھی کشمیری مسلمانوں کو میسر تھا لیکن اس پلیٹ فارم پر عوامی مسائل کے لئے جدوجہد کا تصور ہی غائب تھا۔ محاذ رائے شماری کے صدر مرزا محمد افضل بیگ ضرور تھے لیکن اسے سیاسی حقیریت شیخ محمد عبداللہ کی قیادت سے ملی۔ سرکار کی کرپشن۔ بدعنوانیوں۔ ظلم و تشدد اور جمہوری مزاج پر رکیک حملوں کے خلاف محاذ رائے شماری نے لوگوں کو منظم کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ پلیٹ فارم محض ہندوستان مخالف پروپیگنڈہ تک ہی محدود رہا۔ اس کے برعکس ڈیمو کریٹک نیشنل کانفرنس نے طے شدہ سوالات کو پھر سے زیر غور لانے کے بجائے عوامی مسائل پر لوگوں کو متحرک کرنے۔ جمہوریت کو زندہ رکھنے اور ظلم و تشدد کے خلاف آواز بلند کرنے کا ایک پلیٹ فارم بنایا۔ پہلی بار کشمیری مسلمانوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ اقتدار سے باہر رہ کر بھی ہندوستان میں رہتے ہوئے بھی

www.taemeernews.com

عوامی مسائل کے جدو جہد ممکن ہے۔ لیکن کانگریس کی مرکزی قیادت کو یہ سب کچھ نہیں ہوا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے کشمیر میں آکر اعلان کیا" کہ ڈیمو کریٹک نیشنل کانفرنس بنانے کا فیصلہ ایک سنگین غلطی تھی اور انھوں نے خواجہ غلام محمد صادق کو واپس نیشنل کانفرنس میں شامل ہونے مشورہ دیا۔ ڈیمو کریٹک نیشنل کانفرنس کے جنم اور موقعہ پرست اقتدار کے لالچی لیڈروں کی سازشوں سے اس ہندوستان نواز اپوزیشن پارٹی کی بے وقت موت کے بارے میں تفصیل کے ساتھ گذشتہ باب میں تبصرہ کیا گیا ہے اس اپوزیشن جماعت کی موت سے ایک بار پھر سیاسی میدان خالی ہوا اور الحاق مخالف اپوزیشن جماعت محاذ رائے شماری کا پلیٹ فارم لوگوں کو دستیاب ہوا۔ لیکن بد قسمتی سے اس اپوزیشن پلیٹ فارم نے عوام کے بنیادی مسائل کی طرف توجہ نہیں دی بلکہ ان مسائل کو سیاسی سوالات میں الجھا کر۔ اپنے بل پر اپنے مسائل کے لئے لڑنے کے لئے عوام کو اس پلیٹ فارم سے کوئی رہنمائی حاصل نہیں ہوئی البتہ نئی نسل کے ذہنوں میں ہندوانڈیا سے نفرت کے بیج بو دیئے گئے جسکی فصل پاکستان نے ۱۹۸۹ میں کاٹنی شروع کر دی۔

بخشی غلام محمد کی ڈکٹیٹر شپ کا مراج پلان کی زد میں آ گئی اور خواجہ غلام محمد صادق کی اقتدار سنبھال لینے کی خواہش پوری ہو گئی اور پہلی بار مرکز کی کانگریس قیادت اس نتیجہ پر پہنچی کہ سیاسی طور پر کشمیر کو اچھوت قرار دینے سے نہ تو کشمیری ہندوستان کے نزدیک آسکے اور نہ ہی سیاسی ربط ضبط سیاسی مزاج میں آیا۔ طویل بحث مباحثہ کے بعد نیشنل کانفرنس کو کانگریس میں زعم کیا گیا اور کانگریس نے باضابطہ طور وادی میں کام کرنا شروع کیا۔ لیکن بخشی غلام محمد نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علاحدہ تعمیر کر کے نیشنل کانفرنس کو زندہ رکھا۔ نیشنل کانفرنس کو زندہ رکھنے میں بخشی غلام محمد کو سیاسی نظریات سے زیادہ نجی مفادات کے تحفظ کا خیال تھا۔ وہ نیشنل کانفرنس کی آڑ میں مرکزی سرکار کو بلیک میل کر کے نہ صرف بے ایمانی سے اکٹھی کی ہوئی کروڑوں روپے کی جائداد کو بچانا چاہتے تھے بلکہ اپنا سیاسی adjustment بھی چاہتے ۔ یہ پلیٹ فارم بھی ایک طرح سے منفی نظریات کا ایک پلیٹ فارم تھا۔ اسی دوران کمیونسٹ پارٹی نے بھی باضابطہ طور پر یہاں اپنے سائن بورڈ کے تحت کام کرنا شروع کیا۔ پارٹی جس کا تنظیمی ڈھانچہ ایک زمانہ میں کافی مضبوط تھا وہ ٹوٹ چکا تھا۔ کارکن اور لیڈر بکھر چکے تھے۔ جو بکنا چاہتے تھے وہ بک چکے تھے۔ جو لالہ تیرتھ رام کی تجوریوں سے فیضیاب ہو رہے تھے وہ کانگریس میں چلے گئے۔ اس کے برعکس شیخ محمد عبداللہ کی سرپرستی میں محاذ رائے شماری نے اپنا سیاسی وجود وادی میں منوالیا حالانکہ محاذ رائے شماری کے کئی اہم لیڈر بھی کانگریس سے فیضیاب ہو رہے تھے اور محاذ رائے شماری کی ورکنگ کمیٹی اجلاسوں کی مکمل کاروائی حاکم وقت کو بر وقت فراہم کیا کرتے تھے۔

www.taemeernews.com

ریاست میں کانگریس نے باضابطہ طور پر سیاسی سطح پر کام کرنا شروع کیا اور اسطرح پہلی بار وادی کے لوگوں نے بانہال پار جھانکنا شروع کیا۔ شیخ محمد عبداللہ اسے اپنی لیڈرشپ کے لئے چیلینج سمجھنے لگے اور انھوں نے وادی میں کانگریس کے خلاف ترک موالات کا نعرہ بلند کیا۔ ترک موالات کے نعرہ نے کشمیری مسلمانوں کی زندگیوں میں زہر گھول دیا۔ کانگریسی مسلم معاشرے سے کٹ گئے۔ دوکانداروں نے کانگریسوں کو سودا سلف فروخت کرنا ان کو بند کر دیا۔ کانگریسی کے جنازے کو کسی نے کندھا نہیں دیا۔ ترک موالات نے رشتوں کو توڑ دیا۔ بیوی شوہر سے علاحدہ ہوگئی۔ بیٹا باپ سے بچھڑ گیا اور جب حالات نے سنگین صورت اختیار کر لی تو کانگریسوں نے قانون اپنے ہاتھ میں لے کر اس نفرت آمیز نعرے کے خلاف بازاروں میں لڑائی لڑنی شروع کی۔ محمد شفیع قریشی جو مرکز میں وزیر تھے انھوں نے باضابطہ لال چوک میں کھڑے ہو کر ترک موالات کے حامیوں کی اپنے ہاتھوں سے مرمت کی۔ شیخ محمد عبداللہ کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ ۱۹۳۸ کے بعد کشمیر میں حالات بدل گئے ہیں۔ مولوی یوسف شاہ کو پارٹی کے کارکنوں کو تشدد سے خوفزدہ کرنا تو ۱۹۳۸ میں ہی ممکن تھا۔ ۱۹۶۴ میں یہ ممکن نہیں۔ شیخ محمد عبداللہ کے مقابلہ میں کانگریس کی کوئی سیاسی حیثیت نہیں تھی لیکن اس کے باوجود ترک موالات کا ہتھیار استعمال کیا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ وہ کشمیر کو تنگ تاریک دائرے سے باہر نکالنے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ نئے احالات میں لوگوں کو اپنے مسائل کیلیے جدو جہد کرنے کے آداب سکھاتے۔ انھیں اپنی لڑائی لڑنے کے لئے منظم کرتے لیکن انھوں نے اپنی سیاسی تنگ نظری کی آبیاری کے لئے لوگوں کو ترک موالات جیسے نفرت آمیز نعرے میں الجھا دیا۔

وقت گذرتا گیا اور وادی میں صحت مند سیاست دم توڑتی گئی۔ شیخ محمد عبداللہ بھی ایک طویل جدو جہد کی بے نام منزل سے مایوس ہو چکے تھے۔ پاکستان کا بٹوارہ ہو چکا تھا۔ بین الاقوامی حالات بدل گئے تھے اور خود کشمیری بھی بے مقصد سیاسی لڑائی سے تنگ آچکے تھے۔ زمانہ نے ایک اور رخ اختیار کیا اور ۲۲ برسوں کے بعد شیخ محمد عبداللہ نے ہند کشمیر الحاق کے تاریخی فیصلہ کی تائد کر کے کانگریس کے بل پر اقتدار سنبھال لیا حالانکہ اسی کانگریس کے خلاف انھوں نے ترک موالات کا نعرہ بلند کیا تھا۔ نئے حالات میں جبکہ شیخ محمد عبداللہ نے رائے شماری کو ایک بے معنی نعرہ قرار دیا تو محاذ رائے شماری کی افادیت بھی ختم ہوگئی۔ شیخ محمد عبداللہ کا البتہ وہ گہرا گھاؤ ابھی بھرا نہیں تھا جو ریاست میں کانگریس کے وجود سے انکی سیاسی شخصیت پر لگ گیا تھا۔ اس زخم کو بھرنے کے لئے انھوں نے کانگریس کو ختم کرنے کی ایک خوبصورت اسکیم تیار کی۔ شیخ محمد عبداللہ آتش چنار میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

www.taemeernews.com

انتظامیہ کے علاوہ ایک فعال اور مستعد سیاسی جماعت کا وجود ہمارے مقاصد اور منشور کی بجا آوری کے لیے نہایت اہم درجہ رکھتا تھا۔ نئے حالات میں محاذ کے کارکنوں میں محسوس کیا کہ ان کا دائرہ کار، مفہوم، معانی اور مقاصد کے اعتبار سے بدل گیا ہے۔ چنانچہ محاذ کے خصوصی اجلاس واقع مجاہد منزل سرینگر میں ایک عظیم اکثریت کے ساتھ محاذ کو توڑنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اب تنظیم بنانے کا سوال آیا۔ تو میں نے نیشنل کانفرنس کو پھر سے زندہ کرنا مناسب خیال کیا۔ ۵۳ میں میری گرفتاری کے بعد نیشنل کانفرنس پر بخشی غلام محمد نے غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد ریاست میں غنڈہ گردی اور اخلاقی پستی کے جو مظاہرے کئے گئے تھے اس کی وجہ سے یہ جماعت خاصی بدنام ہو گئی تھی۔ ادھر غلام محمد صادق اور ان کے ساتھیوں نے دہلی دربار کو اپنی وفاداری کا زیادہ یقین دلانے کے لئے ریاست میں کانگریس کی شاخ منظم کی تھی۔ لیکن یہ جماعت کبھی بھی عوامی سطح پر مقبول نہ ہو سکی۔ حالانکہ اسے دہلی کے حکمرانوں کی سرپرستی بھی حاصل رہی۔ اور اس کو مرکز اور آل انڈیا کانگریس کے خزانے سے بھاری رقومات کے انجکشن بھی دیے جاتے رہے۔ لیکن میں بہر حال نیشنل کانفرنس کی احیا نو کا حامی تھا۔ چنانچہ میں نے محاذ کے صدر مرزا افضل بیگ اور پردیش کانگریس کے رہنما سید میر قاسم کو نیشنل کانفرنس میں شمولیت کی دعوت دیتے ہوئے اپنے خیالات کا نچوڑ پیش کیا۔ میں نے بیگ صاحب کے نام لکھا۔

"اب جبکہ آپ نے محاذ کو توڑنے کا باقاعدہ اعلان کیا ہے۔ ایک نئی سیاسی جماعت کے قیام کا مسئلہ ایک ذہنی ورزش نہیں بلکہ ایک ٹھوس اور فوری ضرورت کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔۔۔۔۔۔ تاکہ موجودہ سیاسی خلاء دور ہو اور ہم ریاستی عوام کے سامنے ایک مثبت اقتصادی پروگرام اور صحت مند سیاسی نظام کا وہ خاکہ پیش کر سکیں جس کی خاطر ہم نے اقتدار کی ذمہداریاں سنبھالی ہیں۔ نئی جماعت کا فیصلہ کرتے ہوئے ہمیں اپنے بنیادی مقاصد، اپنی جدو جہد کی تاریخ، اپنے سیاسی رول کی اہمیت، اپنی انفرادیت اور اپنے ماحول کے تقاضوں کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ ہمیں کسی پر نہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم ایک شاندار ماضی اور قابل فخر میراث کے مالک ہیں اور ہمیں اس تاریخی تسلسل کو درہم برہم نہیں کرنا چاہیے۔ جس پر ہماری عزت اور عظمت کا مینار قائم کیا ہے ہم اپنے ماضی سے صرف اس لیے دست بردار ہو جدو جہد کے ایک اہم موڑ پر کچھ رہزنوں نے ہمارے قافلے پر شب خون مارا تھا۔۔۔ وہ دوست جو نیشنل کانفرنس کے اس دور سے خائف ہیں کہ ۵۳ء کے بعد اس سے وابستہ ہے ان کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ آشام دور میں بہت سے مندروں، مسجدوں اور عبادت گاہوں پر بھی غاصبوں اور لٹیروں نے جبراً قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن اس قبضے سے ان عبادت گاہوں کی تاریخ مٹ گئی اور ان کا

www.taemeernews.com

تقدش۔"

قاسم صاحب کے نام میرے خط کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ ہو۔

"میں پورے خلوص اور صدق دلی کے ساتھ آپ کو اور آپ کے دوسرے ساتھیوں کو دعوت دیتا ہوں کہ فردی اختلافات، ذاتی ترجیحات، ماضی کی تلخیوں اور فرضی اندیشوں کو بھول کر آپ بھی نیشنل کانفرنس میں شامل ہو کر اپنی اس عظیم جماعت کا میراث بن جائیے کہ جو ہم سب کے لیے باعث افتخار اور قابل افتخار سرمایہ ہے۔۔۔۔۔۔ ۔۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ آپ اس وقت ایک ایسی سیاسی تنظیم سے وابستہ ہیں جو اپنی شاندار روایات کے اعتبار سے ملک کی سیاسی تاریخ میں اہم حیثیت کی مالک ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو نیشنل کانفرنس میں شمولیت کی دعوت دے رہا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کانگریس اور نیشنل کانفرس کے تعلقات میں ہمیشہ رقابت کی بجائے رفاقت کا جذبہ کارفرما رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہاراجہ کی مطلق العنان حکومت کے خلاف نیشنل کانفرنس کو ہمیشہ ہندوستان کی جنگ آزادی سے سچی حمایت اور تعاون حاصل رہا۔ اسی طرح کانگریس اور نیشنل کانفرنس کے درمیان باہمی اعتماد، تعاون اور اشتراک عمل کی ایسی فضا قائم تھی کہ اس بات کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کہ دونوں جماعتوں کو مدغم کیا جائے۔۔۔۔۔ ۱۹۵۳ کے بعد نیشنل کانفرنس کے رول اور ۱۹۶۵ء میں نیشنل کانفرنس کو کانگریس میں مدغم کرنے کے فیصلے کے بارے میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ ان میں سیاسی تقاضوں کا نہیں بلکہ مصلحتوں کا دخل تھا۔ اب جبکہ خوش قسمتی سے فضا بدل گئی ہے اور آپ کے ہمارے سامنے وہ مجبوریاں نہیں ہیں ہمیں اپنی محبوب تنظیم نیشنل کانفرنس کا از سر نو احیاء کر کے ان قدروں کو پھر زندہ کرنے میں مزید تاخیر نہیں کرنی چاہئے کہ جن سے ہماری تاریخ اور ہماری آنے والی نسلیں پر وابستہ ہے۔"

محاذ کے کارکن تو خیر میری آواز پر لبیک کہ کر نیشنل کانفرنس میں شامل ہو گئے۔ لیکن پردیش کانگریس کے منصب دار بھلا کیوں اپنے مفادات سے دست بردار ہو کر چاند کی اس بہتی ہوئی گنگا سے کنارہ کش ہو جاتے جو پردیش کانگریس کے نام پر مرکزی چشمے سے پھوٹتی تھی اور ان کے گھروں کو سیراب اور شاداب کرتی تھی۔ دوسرے وہ میرے اقتدار سنبھالنے کو عارضی دور سمجھتے تھے اور ان کے ایک گھر کے بھیدی کے مطابق جس نے اشرفیوں کی بندربانٹ پر استعفی دے کر ان کے خلاف متوازی تنظیم کھڑا کر لی وہ دہلی کے ڈاکٹر پر آس لگائے بیٹھے تھے کہ میری صحت مجھے چند ماہ سے

www.taemeernews.com

زیادہ زندہ رہنے کی اجازت نہ دے گی اور اس کے بعد وہ پھر اپنی کھوئی ہوئی جنت حاصل کر پائیں گے۔ انھوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ڈھانے پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔ لیکن نیشنل کانفرنس اپنے قیام کے فوراً بعد ریاست بھر میں مقبول ترین عوامی تنظیم بن گئی انہی دنوں مسز اندرا گاندھی سرینگر آ گئیں تو انھوں نے ایمپوریم باغ میں کانگریسوں کے ایک جلسے میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر میں کانگریس کو توڑا نہیں جا سکتا اور اگر یہاں صرف ایک ممبر اس کے ساتھ رہے تو پھر بھی یہ جماعت یہاں قائم رہے گی۔ کانگریسی حکومتوں کے خلاف یہاں بددیانتی اور بدعنوانی کے شدید الزامات تھے۔ مسز گاندھی نے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے زبان کی ایک ہی جنبش سے پنے لاڈلوں کو یہ کہہ کر بری کر دیا کہ " گندگی کہاں نہیں ہوتی۔ کسی عالیشان قالین کا کونہ اٹھا کر دیکھئے۔ اس کے نیچے گرد کی موٹی تہہ جمی نظر آئے گی۔ "مسز گاندھی کی اس تقریر نے میرا سارا تامل دور کر دیا اور اس کے چند ہی روز بعد لال چوک میں نیشنل کانفرنس کا ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جہاں میں نے برسر عام نیشنل کانفرنس کی ابتدائی رکنیت کا فارم بھر کر اس میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ میں نے جلسے میں کہا۔

"جہاں مسز گاندھی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی جماعت کے وجود اور اس کی تشکیل کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں وہاں اس فیصلے کو حتمی طور پر قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار صرف یہاں کے لوگوں کو ہے اور کوئی بڑی سے بڑی طاقت ان پر اپنا فیصلہ نہیں ٹھونس سکتی۔ نیشنل کانفرنس کے ساتھ ہماری تحریک اور تاریخ کے سنہرے لمحے وابستہ ہیں اور ہم اپنا راستہ اختیار کر کے اسی تنظیم کو مضبوط بنانے کا عہد کرتے ہیں۔ یہی مسز اندرا گاندھی کے چیلنج کا میری طرف سے جواب ہے۔"

میں نے اسی جلسے میں نیشنل کانفرنس کی ابتدائی رکنیت کا فارم حاصل کیا۔ نیشنل کانفرنس کی تنظیم میں اس وقت اور استحکام پیدا ہو گیا جب ۱۹۷۶ء میں جموں کے سالانہ اجلاس میں مجھے اس کا پھر سے صدر چن لیا گیا میرا نام اس صدارت کے لیے سبکدوش ہونے والے صدر بیگ صاحب نے تجویز کیا تھا۔ حالانکہ میں اس وقت انتظامیہ کے کام کاج کے ساتھ تنظیم کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا خاصا مشکل خیال کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کا اظہار اپنے خطبہ صدارت میں ان الفاظ میں کیا۔

"آپ اپنی محبت اور عقیدت کے جوش میں میری عمر، میری صحت اور میری غیر معمولی مصروفیات کو بھی نظر انداز کر گئے۔ آپ شاید بھول گئے کہ میری عمر کو پہنچ کر انسان کا جسم اور اس کے کاندھے بہت زیادہ بوجھ اٹھانے کے اہل نہیں رہتے۔ آپ نے ان ذمہ داریوں کو بھی

www.taemeernews.com

ملحوظ خاطر نہیں رکھا جو ریاستی حکومت کی سربراہ کی حیثیت سی مجھ پر عائد ہوتی ہے۔"

شیخ محمد عبداللہ کی ذہنی سوچ ان دو خطوط اور ان پر تبصرے سے واضح ہوتی ہے کہ وہ کشمیر کو بیرونی سیاسی اثرات سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے شیخ صاحب ۱۹۷۵ میں اقتدار میں آئے۔ کانگریس کے ساتھ مفاہمت بھی کی۔ لیکن اس کے باوجود پردیش کانگریس کمیٹی کے نوجوان صدر مفتی محمد سعید نے وادی میں کانگریس کو حکمران گروہ کا دم چھلا بننے نہیں دیا۔ اس سے انکار نہیں کہ مفتی محمد سعید نے یہ اہم فیصلہ اس وقت کی وزیر اعظم مرحومہ اندرا گاندھی کے مشورہ پر ہی لیا لیکن مفتی محمد سعید نے بحیثیت اپوزیشن لیڈر کے جو رول کیا وہ قابل تعریف ہے۔ انھوں نے وادی بھر میں کانگریس کی تنظیم کھڑی کر دی۔ عوامی جلسوں میں عوامی مسائل کے لیے ایجی ٹیشن کی۔ حکومت کی ناکامیوں پر احتجاج کیا اور جب شیخ محمد عبداللہ نے کانگریس لیڈروں کو نالی کے کیڑے قرار دینے کے لئے شرافت کی لکشمن ریکھا بھی پار کر دی تو مفتی محمد سعید نے پارٹی کے لیڈروں کے ساتھ مشورہ کئے بغیر شیخ محمد عبداللہ سے حمایت واپس لے لی۔ ۱۹۷۵ میں اقتدار سے محروم ہو جانے کے بعد کانگریسی مایوس ہو چکے تھے اور خاص کر لیڈر شپ پریشان تھی کیونکہ ایک طویل مدت کے بعد اقتدار سے محروم ہونے کی وجہ سے ان کے مفاد خصوصی پر چوٹ پڑ رہی تھی حالانکہ مرحومہ اندرا گاندھی نے ان لیڈروں کی روزی روٹی کا خاطر خواہ انتظام کیا تھا۔

کانگریس کے اپوزیشن رول نے ایک بار پھر کشمیریوں کو ایک ہندوستان حمایتی پلیٹ فارم دستیاب کیا حالانکہ کبھی کبھی اس پلیٹ فارم سے موقع پرستی اور ذاتی مفاد کی بو بھی آتی تھی لیکن اس کے باوجود لوگوں کو یہ اطمینان تھا کہ ان کے مسائل کو حل کرنے کیلئے حکمراں پارٹی کے پلیٹ فارم کے علاوہ ایک اور پلیٹ فارم دستیاب ہے۔ ۱۹۷۷ میں اسمبلی کے چناؤ ہونے سے قبل جنتا پارٹی مرکز میں برسر اقتدار آئی۔ مسز گاندھی چناؤ ہار چکی تھی پردیش کانگریس اور نیشنل کانفرنس میں کھسے چند کانگریسیوں کے ساتھ مولانا مسعودی۔ محی الدین قمرہ۔ اور پریم ناتھ بزاز نے جنتا پارٹی میں شمولیت کی اور اس طرح وادی میں ایک اور ہندوستان نواز پلیٹ فارم وجود میں آیا۔

چناؤ ہوئے اور جنتا دل، کانگریس وادی میں پٹ گئی لیکن پٹنے کے باوجود دونوں جماعتوں کو لاکھوں کی تعداد میں ووٹ ملے۔ یہ ممکن ہے کہ ان دو ہندوستان نواز پارٹیوں کو جو ووٹ ملے وہ شیخ محمد عبداللہ کے خلاف منفی ووٹ تھے لیکن یہ منفی ووٹ تو ہندوستان مخالف ووٹ نہیں تھے۔ چناؤ کے بعد جنتا پارٹی دم توڑ گئی لیکن پردیش کانگریس نے اپنا اپوزیشن رول جاری رکھا۔ شیخ صاحب کی وفات کے بعد مرحومہ اندرا گاندھی کے تعاون سے ان کے بیٹے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو وزیر اعلا مقرر کیا گیا۔ لیکن ان کو قابو میں رکھنے کے لئے مرکزی اور ریاستی کانگریس نے ان کی سیاسی اپوزیشن جاری رکھی۔ ہندوستان میں مختلف اپوزیشن جماعتیں ایک بار

www.taemeernews.com

پھر کانگریس اور مسز اندرا گاندھی کے خلاف منظم ہو رہی تھیں۔اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ ان اپوزیشن جماعتوں کے ساتھ یارانہ قائم کر رہے تھے۔ والد نے کشمیر کی سیاست کو ہندوستان سے دور رکھا لیکن ان کے بیٹے ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے تنگ اور اندھیرے کنویں سے باہر نکل کر ایک وسیع میدان میں کھیلنے کی شروعات کی۔ وجہ کچھ بھی ہو لیکن ڈاکٹر فاروق نے کشمیر کے دروازے ہندوستان کی اپوزیشن جماعتوں کے لئے کھول دیئے۔ کشمیر کی سیاست میں ڈاکٹر فاروق واحد سیاستداں ہیں جنھوں نے اقتدار میں رہ کر یا اقتدار سے محروم رہ کر بھی ہند کشمیر الحاق کی تاریخی حیثیت کو جھٹلانے کی کوشش نہیں کی۔ ڈاکٹر فاروق میں وہ تمام کمزوریاں موجود ہیں جو ہر سیاستداں میں ہوتی ہے لیکن ان پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا ہے کہ بنیادی سیاسی سوالات پر انھوں نے شک و شبہات کا اظہار کیا۔البتہ ان کی غیر دانشمندی اور سیاسی عدم بردباری کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ پردیش کانگریس کمیٹی نے ان کے پارٹی کے ۱۲ ممبران اسمبلی کو رات کے اندھیرے میں اغوا کر کے راج بھون پہنچایا۔ شاید اس وقت کے وزیر اعظم اس کی اجازت نہ دیتے اگر ڈاکٹر فاروق نے سرینگر میں اپوزیشن conclave بلا کر مرحومہ اندرا گاندھی کو چیلنج نہ کیا ہوتا۔ اس conclave میں پہلی بار جیوتی باسو۔اکالی دل کے پرکاش سنگھ بادل۔ ترپورہ کے وزیر اعلا اور اکثر اپوزیشن لیڈروں نے شرکت کی تھی۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی سیاسی اداتب کی کانگریس کی لیڈرشپ کو پسند نہیں آئی حالانکہ فاروق عبداللہ کا یہ قدم جو انھوں نے اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے اٹھایا کشمیر کی تنگ نظر سیاست کو ختم کرنے کا ایک موثر ہتھیار تھا۔ ڈاکٹر فاروق کی سرکار کو گرانے کے بعد غلام محمد شاہ وزیر اعلا بنے اور چند ماہ تک پردیش کانگریس اور غلام محمد شاہ کے درمیان یارانہ قایم رہا۔ ڈاکٹر فاروق پر اس دوران اینٹی نیشنل اور پاکستان نواز ہونے کا الزام بھی لگا لیکن فاروق عبداللہ اس سے پریشان نہیں ہوئے کیونکہ انھیں لوگوں کی حمایت حاصل تھی انھوں نے اپوزیشن کا رول تو کیا لیکن صرف اس حد تک کہ غلام محمد شاہ کو کیسے کمزور کیا جائے۔ میر واعظ مولوی محمد فاروق کی عوامی مجلس عمل بھی ایک اپوزیشن جماعت تھی لیکن اس کا کردار سیاسی دلال کا تھا۔ کبھی انہیں شیخ محمد عبداللہ کا سیاسی قد کم کرنے، کبھی میر واعظ کو کانگریسی کی اندرونی لڑائی میں بیساکھی کے طور پر اور کبھی چناؤ میں دربردہ تعاون کے لئے استعمال کیا گیا اور یہ دلالی بلا معاوضہ نہیں تھی۔ کبھی کبھی روزمرہ کے عوامی مسائل پر لب کشائی کرتے تھے لیکن نہ اس میں شدت ہوتی اور نہ ہی ایمانداری۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ ایک طویل جدو جہد کے لئے تیار نہیں تھے وہ کسی نہ کسی طرح اقتدار میں واپس آنا چاہتے تھے اور اس سلسلہ میں انھوں نے اس وقت کے وزیر اعظم راجیو گاندھی کے ساتھ تعلقات بحال کئے۔ غلام محمد شاہ کی افادیت ختم ہو چکی تھی۔ فاروق عبداللہ کو جھکانے میں

www.taemeernews.com

انھوں نے اپنا رول کیا تھا اور اس رول کی اب حکمرانوں کو ضرورت نہیں تھی۔ ڈسمس کئے گئے اور ریاست میں گورنر راج نافذ ہوا۔ اسمبلی چناؤ کی تیاریاں شروع ہو گئی اور ڈاکٹر فاروق نے غیر دانستہ طور پر سیاسی خودکشی کر کے کانگریس کے ساتھ چناؤ مفاہمت کی۔ کانگریسوں کی اقتدار سے باہر رہ کر بھوک تیز ہو گئی تھی۔ مفاہمت ہوئی اور پہلی بار کشمیر میں نیشنل کانفرنس کا کردار مشکوک بن گیا۔ ڈاکٹر فاروق اپنے بل پر چناؤ جیت سکتے تھے لیکن انھیں خطرہ تھا کہ کانگریس کی ہمایت کے بغیر اگر وہ اقتدار میں آئے آئے تو پھر ہٹا دئے جائیں گے۔

اس پس منظر میں کشمیر کی سیاسی زندگی کا المیہ یہ ہے کہ لوگوں کو کبھی بھی ہندوستان حمایتی الوزیشن پارٹی کا پلیٹ فارم نہیں ملا۔ کشمیریوں نے ہمیشہ ہندوستان کا چہرہ حکمراں جماعت کے آئینہ میں دیکھا اور اس آئینہ میں انہیں ہندوستان کی شکل بھیانک اور خونخوار دکھائی دیتی رہی۔ ایک ہی پلیٹ فارم انہیں دستیاب تھا اور وہ ہندوستان مخالف پلیٹ فارم جو ہمیشہ پاکستانی جراثیم کے پنپنے کی لیبارٹری ثابت ہوا ہے۔ آج جب ایک بار پھر کشمیر کے حالات کو سلجھانے پر غور ہو رہا ہے۔ کشمیر میں ہندوستان نواز الوزیشن پلیٹ فارم کے لئے کوششیں کرنے کی ضرورت ہے۔ صحت مند الوزیشن کے بغیر کشمیر ہمیشہ صحیح راستے سے بھٹک جائے گا اور کشمیر کی موجودہ روایتی لیڈرشپ نہ تو طویل جدو جہد کے لئے تیار ہے اور نہ ہی وہ اقتدار کے بغیر رہ سکتی ہے۔ نئی لیڈرشپ کو ابھرنا ہوگا اور آج کی تاریخ میں کشمیر میں اس طرح کی لیڈرشپ کے ابھرنے کے امکانات تاریک ہیں۔ ہر ایک اقتدار حاصل کرنے کے لئے اکھاڑے میں کشتی لڑنے کے لئے اتر گیا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ کوئی پاکستان کا نام لے کر پاکستانی اکھاڑہ بنا رہا ہے تو کوئی آزادی کے نام پر آزادی کا اکھاڑہ تعمیر کر رہا ہے۔ کوئی ہندوستان کے نام پر لاؤ لشکر جمع کرنے کی کوشش میں ہے لیکن ہر ایک کی نظر اقتدار پر ہے۔ پاکستان کے چاہنے والے اور آزادی کے متوالے دونوں ہی اقتدار کے متوالے ہیں۔ دونوں ہی کی رسائی حکومت ہندوستان کے ساتھ ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ اس بار جس بلیک میل کا ہتھیار استعمال کیا جا رہا ہے وہ موثر ثابت ہوگا کہ نہیں اس پر بھی قیاس آرائی ناممکن ہے۔ لیکن یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ہر ایک کی منزل اقتدار ہے اور ہر ایک کی نظر میں کشمیری عوام بے وقوف ہیں۔

www.taemeernews.com

لوٹا دو میری عمر گذشتہ کی کتاب

www.taemeernews.com

مجھ کو شکوہ ہے میرے بھائی کہ تم جاتے ہوئے
لے گئے ساتھ میری عمر گذشتہ کی کتاب

اس میں تو میری بہت قیمتی تصویریں تھیں
اس میں بچپن تھا میرا، اور میرا عہد شباب

اس کے بدلے، مجھے تم دے گئے جاتے جاتے
اپنے غم کا یہ دمکتا ہوا خوں رنگ گلاب

کیا کروں بھائی، یہ اعزاز میں کیونکر پہنوں
مجھ سے لے لو میری سب چاک قمیصوں کا حساب

آخری بار ہے ۔ لو مان لو اک یہ بھی سوال
آج تک تم سے میں لوٹا نہیں مایوس جواب

آکے لے جاؤ تم اپنا یہ دمکتا ہوا پھول
مجھ کو لوٹا دو میری عمر گذشتہ کی کتاب

فیض احمد فیض

www.taemeernews.com

ہماری مطبوعات

ناول اور افسانے

گردشِ رنگِ چمن	قرۃ العین حیدر	۱۷۵/-
آگ کا دریا	قرۃ العین حیدر	۲۰۰/-
چاندنی بیگم	قرۃ العین حیدر	۱۵۰/-
موج ہوا پیچاں	ساجدہ زیدی	۶۰/-
آخری آدمی	انتظار حسین	۹۰/-
خواب رو	جوگندر پال	۴۰/-
میرا شہزادہ ہورا سا	کشمیری لال ذاکر	۱۲۵/-
آدھے چاند کی رات	کشمیری لال ذاکر	۷۵/-
اس صدی کا آخری گرہن	کشمیری لال ذاکر	۱۲۵/-
آتے جاتے موسموں کا سچ	ہرچرن چاولہ	۶۰/-
ناروے کے بہترین افسانے	ہرچرن چاولہ	۶۰/-
البم (یادیں افسانے)	ہرچرن چاولہ	۷۵/-
ٹوٹتے بکھرتے لوگ	یوگیش کمار	۶۰/-
بے نام قاتل	یوگیش کمار	۶۰/-
پہلی نسل کا گناہ	صفیہ صدیقی (لندن)	۷۵/-
فسانہ کہیں جسے	عاشور کاظمی (لندن)	۱۵۰/-
یروشلم یروشلم	قیصر تمکین (لندن)	۶۰/-
وہی قتل بھی کرے ہے	حیدر مہدی رضوی (لندن)	۷۵/-
ٹھکانہ	حیات اللہ انصاری	۶۰/-
سنہری پت جھڑ	نثار راہی	۶۰/-
کینچلی	غضنفر	۶۰/-
دو کشتیوں میں سوار	خالد سہیل	۹۰/-
بازگوئی	سریندر پرکاش	۷۵/-
خالد بن ولید	قاضی عبدالستار	۱۰۰/-
آئینہ ایام (قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے) مرتبہ: غیاث الدین		۱۰۰/-
قطب مینار	پیغام آفاقی	۱۰۰/-

تعاقب	سید نسیم چشتی	۳۰۰/-
میری شناخت تم ہو	کشمیری لال ذاکر	۷۵/-
انقلاب کا ایک دن	زاہدہ زیدی	۷۵/-

شاعری

شاخِ منظر	جمشید مسرور (ناروے)	۶۰/-
سنہری آنچ	واجد سحری	۳۰/-
غالب کی رہگذر	واجد سحری	۳۵/-
شوخیٔ تحریر	سید محمد جعفری	۷۵/-
صلاح الدین پرویز کے خطوط	صلاح الدین پرویز	۶۰/-
سبھی رنگ کے ساون	صلاح الدین پرویز	۱۵۰/-
سمن زار: منتخب فارسی اشعار مع ترجمہ	ضیاء احمد بدایونی	۱۰۰/-
نسخہ ہائے وفا	فیض احمد فیض	۹۰/-
تازہ ہوا	باقر نقوی (لندن)	۵۰/-
مہر دو نیم	افتخار عارف (لندن)	۶۰/-
صراطِ منزل	عاشور کاظمی (لندن)	۶۰/-
نغمۂ حیات	دھرمندر ناتھ بھنوت سرمست	۶۰/-
بے نشان	شاہین	۷۵/-
جب زمینوں سے شجر اگتے ہیں	علی ظہیر	۶۰/-
ذرّوں سے ستاروں تک	اکبر حیدرآبادی	۱۰۰/-
ماہ تمام (کلیات)	پروین شاکر	۲۰۰/-
خوشبو	پروین شاکر	۵۰/-
صد برگ	پروین شاکر	۴۵/-
خود کلامی	پروین شاکر	۲۵/-
انکار	پروین شاکر	۳۵/-
پیمانۂ دل	مظفر شکوہ	۱۰۰/-
حرفِ باریاب	افتخار عارف	۹۰/-

Educational Publishing House
3108-GALI AZIZUDDIN VAKIL, KUCHA PANDIT, LAL KUAN, DELHI-110 006. (INDIA)
TEL.: 526162/7774965

ISBN 81-86232-33-8